

دور حاضر کے تجدد پسندوں کے افکار

تالیف

فقیر العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مکتبہ لدھیانوی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى) (المابعد)

مرشدی حکیم العصر حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی
زید مجد ہم کی ماہنامہ بینات سے وابستگی کا آغاز ایک ایسے قلمی شاہکار سے ہوا جس
کے بارے میں خود حضرت اقدس نے ”اقرؤا بحسب“ حضرت بنوریؒ نمبر میں
تحریر فرمایا تھا:

”بینات کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت بنوری
رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تر ظاہری و باطنی قوتیں فضل الرحمنی
فتنہ کا سرکچنے پر مرکوز ہیں، انہی دنوں ڈاکٹر فضل الرحمن کے
بعض ملحدانہ مضامین اخبارات میں شائع ہوئے جس سے اس
ناکارہ کی طبیعت بے چین ہو گئی.....

بینات کے مضامین سے ڈاکٹر فضل الرحمن کے
اقتباسات کو پڑھ کر ناکارہ نے ”ڈاکٹر فضل الرحمن کے
تحقیقاتی فلسفہ اور اسکے بنیادی اصول“ کے عنوان سے ایک
تردیدی مضمون مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ مدیر بینات کی
خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجا، تاکہ کسی عام رسالے میں
شائع کرادیں، حضرت مولانا ادریس صاحبؒ نے نہ صرف
اس مضمون کو شائع کیا، بلکہ حضرت اقدس مولانا بنوری
رحمۃ اللہ نے خط تحریر فرمایا کہ تمہارا مضمون پسند آیا، تم
رمضان المبارک ہمارے پاس گزارو اور اگر یہ تعلق مستقل
ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا۔“

حضرت اقدس حکیم شعبان ۱۳۸۶ھ سے عاشق رسول، محدث العصر مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ”ہم نام و ہم کام“ کی حیثیت سے دنیا میں متعارف ہوئے، اور محمد اللہ حضرت بنوریؒ کے فرمان: ”میں تم کو (مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور مفتی ولی حسنؒ) اپنے مدرسہ کا مدار سمجھتا ہوں۔“ کے مصداق آج بھی جامعہ بنوری ٹاؤن کے مدار کی حیثیت سے آپ اپنی ذمہ داریوں سے عمدہ برآہور ہے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں فضل الرحمانی فتنہ سے لے کر دور حاضر کے دیگر ایسے جدت پسندوں کے بارے میں مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے، جو اسلام کے نام پر امت میں اپنی ”جدید تحقیقات“ متعارف کرانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس کی ان خدمات جلیلہ کو قبول فرماتے ہوئے امت کے لئے نافع بنائے۔ اس کتاب کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں رفیق محترم مولانا سعید احمد جلال پوری، عبد اللطیف طاہر، عزیزان عتیق الرحمن لدھیانوی اور مولانا محمد طیب لدھیانوی، مولانا نعیم امجد سلیمی، اطہر عظیم کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور حضرات اکابر کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین

محمد جمیل خان

خاکپائے حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت اول..... جون ۲۰۰۰ء

ناشر: مکتبہ لدھیانوی جامع مسجد فلاح

فیڈرل بی ایریا، نصیر آباد، بلاک نمبر ۱۴ کراچی

فہرست

۲۸۵	ڈاکٹر گورایہ اور تعبیر شریعت کا اختیار	پیش لفظ
۵	عصر حاضر کا اہم تقاضا - قدیم فقہ اسلامی	ڈاکٹر فضل الرحمن کے نظریات :
۳۷۳	اور جدید مسائل کا حل	ڈاکٹر فضل الرحمن کا تحقیقاتی فلسفہ
۳۸۷	اسلامی قوانین میں اجتہاد و عقل کا مقام	ڈاکٹر فضل الرحمن کی اسلام کے خلاف
۴۰۴	الاجتہاد فی الاسلام	زہر افشانی
۴۳۷	ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار :	ڈاکٹر فضل الرحمن کے تحقیقاتی فلسفہ کے
۴۳۹	ڈاکٹر فضل الرحمن کی بے جا حمایت	ضمنی اصول
۴۴۸	ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں	ادارہ تحقیقات اسلامی کا ماڈرن اسلام
۴۵۴	کیا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سیاسی تھی ؟	ڈاکٹر فضل الرحمن کے عائلی قوانین اور علماء
۱۶۹	دینی تحریک کی قیادت کا منصب اور	ڈاکٹر فضل الرحمن اور انکار قرآن
۱۸۴	ڈاکٹر اسرار احمد	ڈاکٹر فضل الرحمن کی کج بیانی
۴۸۲		ڈاکٹر فضل الرحمن کا الحاد
۴۹۸	ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک اور اندیشے	وزیر قانون اور ادارہ تحقیقات اسلامی
۲۰۳	مولانا محمد حنیف ندوی :	عمر احمد عثمانی کی تحریفات :
۵۱۸	اساسیات اسلام کے آئینہ میں :	صغریٰ کی شادیاں اور اسلام
۵۱۸	اسلام اور علمائے اسلام کو بدنام کرنے	تعدد ازدواج اور اسلام
۲۳۰	کا بھونڈا انداز	طلاق کے احکام
۵۵۰		یتیم پوتے کی وراثت
۵۵۵	مولانا اللہ یار خان چکڑالوی :	ڈاکٹر گورایہ کے اجتہادات :
۲۵۳	جدید انکشافات	
۵۵۵		

ڈاکٹر فضل الرحمن کے نظریات

ڈاکٹر فضل الرحمن کا تحقیقاتی فلسفہ

حامداً ومصلیاً ومسلماً، اما بعد :

جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب بالقلبہ کئی سال سے سرکاری وسائل سے ”اسلامی تحقیقات“ پر مشق ستم فرما رہے تھے، پہلے پہل موصوف نے اس ”کار خیر“ کے لئے اپنے اساتذہ کی زبان سے انگریزی سے کو منتخب فرمایا، جولائی ۱۹۶۳ء سے ”فکر و نظر“ کے پہلے ہی شمارے سے ان کے ”مضامین عالیہ“ اردو زبان کے ”چولے“ میں منظر عام پر آنے لگے، تاہم ان کے خیالات ابھی تک ”اہل علم“ کے حلقہ تک یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی چہار دیواری تک محدود تھے، جون ۱۹۶۶ء سے آپ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور اردو، انگریزی اخبارات میں ”زکوٰۃ“ سے متعلق یکے بعد دیگرے دو بیان دے ڈالے، پہلے بیان کی اگرچہ تردید فرمادی، لیکن ساتھ ہی اس ”تردید“ کے ”بین السطور“ میں اس کی حقانیت پر بھی پورا زور دیا، اسلام پر ان کے اس کھلے عام عمل جراحی سے پوری ملت اسلامیہ کا تڑپ اٹھنا فطری امر تھا، اس لئے ملک کے گوشے گوشے سے قراردادیں بھیجی گئیں، کہ ”ڈاکٹر صاحب کو ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی ڈائریکٹری اور ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کی رکنیت سے الگ کیا جائے۔“ ہمیں علم نہیں کہ جمہور کی یہ آواز ”جمہور کے نمائندوں“ یعنی ارکان دولت کے کانوں تک پہنچی یا نہیں؟ اگر پہنچی ہے تو اسے لائق توجہ سمجھا گیا یا نہیں؟ اور اگر سمجھا گیا ہے تو

اس پر غور و فکر کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا یا نہیں؟

ذیل کی سطور میں ہم ڈاکٹر صاحب کے نظریات کی اجمالی فہرست دینا چاہتے ہیں، جس سے واضح ہوگا کہ موصوف کی ”تحقیقات اسلامیہ“ کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ ”اسلام“ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کا خود ساختہ ہے اور موجودہ زمانہ میں ناکارہ۔

اس صورت میں موصوف کو ”اسلامی تحقیقاتی ادارہ“ کی سربراہی کے عہدہ پر مامور کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی ماسٹر تار اسنگھ، لالہ بہاری لال، یا پروفیسر جوزف شاخت کو قرآن و سنت اور اسلام کی تشریح و تفسیر کے کام پر مامور کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ ”اسلام“ اور اسلام کے اس جدید ”شارح“ دونوں پر ظلم ہے، اس لئے جمہور اپنے اس مطالبہ میں حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو کم از کم سرکاری ذرائع سے ”اسلام“ پر خط تنبیخ (نفی کی لکیر) کھینچنے کا موقعہ نہ دیا جائے، ڈاکٹر صاحب کے نظریات پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ان کی تحریک کا پس منظر اور ان کی تحریفات کے وہ ”راہنما اصول“ مختصراً عرض کر دیئے جائیں، جن پر یہ ”نئی عمارت“ کھڑی کی جا رہی ہے، واللہ الموفق والمعين۔

۱ — ڈاکٹر صاحب موصوف جس ”مکتبہ فکر“ کے نقیب ہیں، اس کے نزدیک ”اسلام“ کا مفہوم بظاہر بہت سادہ اور مختصر — لیکن بے حد پرتپج — ہے، یعنی ”اسلام“ نام ہے چند مثالی معیاروں اور نصب العینوں کا، جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور ظروف احوال میں ”ترقی پسندانہ“ انداز میں عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶) واضح رہے کہ یہ چند ”معیار“ اور ”نصب العین“ بھی آج تک شرمندہ تفصیل نہیں ہو سکے۔ ناقل) ”یہ اسلام جو ہمیشہ نوبہو صورتیں، تازہ بتازہ

شکلیں تلاش و اختیار کرتا رہا ہے، یہی اسلام ”زندہ اسلام“ کہلانے کا مستحق ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ اسلام کی اصل روح پہلی صدی کے وسط (جلد ۱ ش ۶ ص ۸) یا تقریباً آخر (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۰ ص ۸) میں دفن ہو کر رہ گئی، اور اب جو ”مدون اسلام“ تیرہ یا چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے پاس موجود ہے، یہ وہ اسلام نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا، بلکہ یہ اسلام ”مردہ کا ورثہ“ اور ”زندگی کی حرارت“ سے محروم جسد بے روح ہے (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳) یہ اسلام محض پوست ہے مغز سے خالی، ظاہری رسمی ڈھانچہ ہے روح سے عاری۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳) یہ اسلام ”آزاد ثبوتی فکر“ کا گلا گھونٹ کر خود فریبی میں مبتلا ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۶ ص ۱۵۳) یہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں میں، انتہا پسندی اور غلو کی چکی میں پسا ہوا ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام ”قانون مبرم“ کا زخم خوردہ، ارتقائی اور فکری لحاظ سے بے حد نقصان رسیدہ اور زوال پذیر ہے (فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام صرف ”تعزیروں“ اور ”پابندیوں“ کا مجموعہ، ”قدامت پرستی“ کے اطوار کا شاہکار (فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۹۲) اور ہمیشہ سے انتہا پسندانہ نظریات کا شکار ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۳ ص ۱۵۶) یہ اسلام روشن ضمیری سے محرومی کی ”پیتا“ کا مارا ہوا کور، بخت اسلام ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۸) اور ہر ”تمدنی ڈھانچہ“ کے لئے اس کا وجود تباہ کن ہے (فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۸)۔

۲۔۔۔۔۔ امت مسلمہ اور حاملین دین کے بارے میں اس ”مکتب فکر“ کا انداز فکر یہ ہے کہ رحلت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ایک صدی بعد وہ اخلاقی اور عملی رجحان کی بجائے شدید تفکر و تعمق میں مبتلا ہو کر رہ گئے تھے، اور دیگر مذاہب کی طرح

اسلام کو بھی یہ ”حادثہ“ پیش آیا کہ اس کا عالمی نظریہ ”اعمال“ کی بجائے ”عقائد“ کے رنگ میں تشکیل پانے لگا، اور دوسرے گمراہ فرقوں کی طرح ”اہل سنت“ بھی اخلاقی تجاذب کے ایک ہی سرے — افراط — پر زور دے کر غلو اور تشدد میں اس قدر ڈوب گئے کہ اپنے ”خود ساختہ“ عقائد کے ہاتھوں گویا خود ”گروی“ ہو گئے، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ انہوں نے ”جبریت“ کو ”روایتی عقائد“ کا جزو لاینفک بنا ڈالا (فکر و نظر جلد ۱۰ ص ۸) اور انہوں نے ایمان و عمل کی تفریق کا نظریہ — جو مسیحی عقیدہ ”استحقاق ایمان بہ نجات“ کا عین مین چربہ ہے — اپنا کر انتہا پسندانہ اقدام بلکہ ”اخلاقی خود کشی“ کا ارتکاب کیا (فکر و نظر جلد ۱۰ ص ۹) فلسفہ سے ٹکراؤ ان کے لئے ہلاکت آفریں ثابت ہوا (فکر و نظر جلد ۲ ص ۱۲) اور فلسفہ پر یکطرفہ ”غیر عقلی“ حملہ کر کے انہوں نے خود اپنے آپ کو ذہنی اور روحانی طور پر ناکارہ اور مفلوج بنا لیا (فکر و نظر جلد ۲ ص ۱۸) اور غزالی اور ان کے بعد کے تمام علمبرداران ”راسخ العقیدگی“ نے تمام عالم انسانیت سے روگردانی اختیار کر لی (فکر و نظر جلد ۲ ص ۱۸) امام غزالی، امام شاطبی، امام ابن تیمیہ اور شیخ احمد سرہندی اور تمام مشاہیر اسلام — جن کی فہرست طویل ہے — نے ”ثبوتی علوم“ کے بارے میں مہلک رویہ اختیار کیا (فکر و نظر جلد ۲ ص ۳) اور فلاسفہ پر تنقید کے شوق میں ان مسلمہ عقائد کے حامیوں پر پشت در پشت اور پے در پے، انسانی عقل کو ساقط الاعتبار قرار دے کر جو انتہا پسندانہ اور ”چو طرفہ“ حملہ کیا یہ نہ صرف غیر صحیح تھا بلکہ خود کشی کے مترادف تھا۔

(فکر و نظر جلد ۲ ص ۳)۔

شدید ہے، ان کا خیال ہے کہ ”قدیم فقہاء“ نے نہ صرف اپنے ذاتی آراء و افکار کو بلکہ ”بیرونی عناصر“ کو بھی — جن کا ماخذ ”یہودی روایات“ اور ”باز نپینی“ و ”ایرانی“ انتظامی معاملات تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا (فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۲) امام ابو یوسفؒ نے تمام تر ”احتیاطی تدابیر“ کے باوجود بہت سی احادیث — جن کا فرضی سلسلہ ذات نبویؐ سے ملایا جا چکا تھا — کتاب الآثار میں روایت کی ہیں (فکر و نظر جلد ۱ ص ۳) امام شافعیؒ نے نہ صرف یہ کہ حدیث اور اجماع سے متعلق — بہت سی ”مشکوک“ اور ”فرضی“ احادیث ذات نبویؐ سے منسوب کی ہیں (فکر و نظر جلد ۱ ص ۵) بلکہ ان کی روشن دماغی اور تیز طبعی نے ایک ایسے ”مشینی“ نظام کو جنم دیا جس نے اسلام کو ”جدت فکر کی تخلیق“ سے محروم کر دیا اور اسے زندہ ”طاقت“ اور اپنی تقدیر کا خود مالک نہ رہنے دیا، بلکہ اسے ایک اثر پذیر وجود کی حیثیت سے زندگی کے تھپیڑوں کی نذر کر دیا (فکر و نظر جلد ۱ ص ۳۰)۔

۴۔ حضرات محدثین کے متعلق اس مکتب فکر کا نقطہ نظریہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف بعض اقوال شافعیؒ کو حدیث بنا ڈالا (فکر و نظر جلد ۱ ص ۳۰) بلکہ وہ سیاسی جنگوں اور کلامی بحثوں سے پیدا ہونے والے تمام آراء و افکار کو ”عقائد“ کا نام دے کر ”حدیث“ کی شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرتے رہے (فکر و نظر جلد ۱ ص ۶) اس مکتب فکر کا خیال ہے کہ احادیث احکام، احادیث اجماع، احادیث فتن، احادیث جبر و قدر، احادیث ایمان و عمل، اور احادیث تصوف وغیرہ کا تمام ذخیرہ — معاذ اللہ — اسی فرضی نسبت کی وجہ سے وجود میں آیا ہے (فکر و نظر جلد ۱ ص ۶) ان تمام انسانی آرا کو — جو زمانہ مابعد کی پیداوار تھیں درجہ

”استناد“ بخشنے، ”تقدس“ کا نام دینے اور ”ابدی“ صداقت قرار دینے کے لئے یوں ہی خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام باور کرایا جاتا رہا (فکر و نظر جلد ۲ ش ۵ ص ۲۹۹) باوجودیکہ ”قدما محدثین“ خود اس ”معلوم حقیقت“ کا اشتہار دیا کرتے تھے کہ اخلاقی امثال، پند و نصائح اور جوامع الکلم کے ذات نبویؐ سے منسوب کر دینے میں — خواہ یہ انتساب درست ہو یا نادرست — کوئی حرج نہ سمجھا جائے، البتہ فقہ و عقاید کی احادیث میں ”صحت“ کا خیال رکھنا ضروری سمجھنا چاہئے (فکر و نظر جلد ۵ ص ۱۳) اس کے باوجود یہ ”متعصب محدثین“ (فکر و نظر جلد ۵ ص ۲۲) سب سے زیادہ فقہی اور کلامی احادیث ہی کو، ان کے ”قطعی مشکوک“ ”ناقابل اعتماد“ اور ”غیر صحیح“ ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرنے میں کامیاب ہو گئے (فکر و نظر جلد ۵ ص ۹) الغرض محدثین کی اس ”جراؤتِ رندانہ“ کے طفیل ”حدیث“ کا کام ”تاریخ نویسی“ نہیں بلکہ ”تاریخ سازی“ بن کر رہ گیا تھا۔

(فکر و نظر جلد ۵ ص ۱۷)

لطف یہ کہ یہی مشکوک، ناقابل اعتماد اور خود ساختہ تاریخ (حدیث۔ ناقل) ہے جس پر ”مبادیات دین اسلام“ کی ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ (فکر و نظر جلد ۵ ص ۱۰) اور امت کی تیرہ صدیاں آنکھیں بند کر کے اسی مشکوک اسلام کے موافق اپنے ایمان و عمل، فقہ و عقاید، احسان و تصوف اور سیاست و معاشرت کے نقشے تیار کرتی رہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم اپنے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ انہیں اس ”متعفن“ نظریاتی غلاظت خانہ میں تھوڑی دیر کے لئے جانے کی زحمت اٹھانا پڑی، جس سے ان کے دماغ پھٹے جاتے ہوں گے، لیکن کیا کیا جائے اس ”غلاظت خانہ“ میں لیجائے بغیر ہم اس کا تجزیہ کرنے سے معذور تھے، ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ یہ سب کچھ

دیانت داری سے کہا گیا ہے یا یہ سیاسی حالات کی پیداوار ہے؟ اس کا منشا غلط فہمی ہے، یا دیدہ دانستہ مغالطہ اندازی ہے؟ اور ”یہ فیضانِ نظر ہے“ یا کہ اس مکتب فکر کی کرامت ہے؟ لیکن اتنی بات ضرور صاف صاف کہیں گے۔۔۔ اور اسی میں پاکستان کی، ملت اسلامیہ کی، حکومت پاکستان کی، اور خود ڈاکٹر صاحب کی بھلائی ہے۔۔۔ کہ اس مکتب فکر کا مقصد جو کچھ بھی ہو، مگر ان کے افکار ”پریشان“ کا نتیجہ قطعاً مذہب بیزاری، دینی تشکیک و تذبذب، تمام امت اسلامیہ کی تجہیل اور تحمیق اور قدیم علما امت اور حاملین دین کو ناقابل اعتماد مجرم قرار دینا اور اسلام کی پوری تاریخ کو تاریک در تاریک دکھلانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے قلم سے جتنی قلمی تحقیقات ”صفحہ قرطاس“ پر آئی ہیں ان کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ معروف و مسلم اسلام قطعاً ”مشکوک“ ناقابل اعتماد، فرضی، بناوٹی، اور غلط مذہب ہے، کیا سطور بالا میں ذکر کردہ نظریات سے، اس کے علاوہ کسی اور نتیجہ کی گنجائش ہے۔؟

پس منظر

پنجاب مرحوم اس لحاظ سے خاص امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ یہاں گزشتہ صدی میں ”تجدید اسلام“ کے عنوان سے ”دیرینہ اسلام“ کو غلط ثابت کرنے والی کئی تحریکوں نے جنم لیا ہے، جن میں مرزا غلام احمد قادیانی، علامہ عنایت اللہ مشرقی، اور مسٹر غلام احمد پرویز کا نام سرفہرست آتا ہے۔۔۔ ”مرزائی“ مکتب فکر نے ”تجدید اسلام“ کی صورت ”دعویٰ نبوت“ کی شکل میں تجویز کی، مگر ختم نبوت، حیات مسیح وغیرہ چند مسائل حقہ اس کے لئے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئے، اب اس کی پوزیشن مثل مشہور ”کھسیانی بلی کھبانوچے“ سے زائد نہیں رہی، اور ثانی الذکر نے ”مولوی

”اندھ ب غلط“ کا نعرہ لگایا، مگر ان کا ”عسکری اسلام“ جو شاید خود ان کے لئے بھی ناقابلِ فہم تھا، چل نہ سکا۔ آخر میں مسٹر پرویز نے ”قدیم اسلام“ کو ”عجمی سازش“ قرار دے کر ”مرکز ملت“ اور ”نظام ربوبیت“ کا نظریہ پیش کیا۔ مگر ایک آدھ ”مرکز ملت“ سے زیادہ کی بارگاہ میں اس کو شرفِ پذیرائی حاصل نہ ہو سکا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی تحریک علمی نہ تھی، بلکہ برسرِ اقتدار ”کرسی نشینوں“ کو خوش کرنے کے لئے چند مبہم قسم کے عامیانہ اور سوقیانہ افکار اور مدحیہ قصائد کا پلندہ تھی، البتہ ڈاکٹر صاحب کا مکتب فکر اس حیثیت سے امتیازی مقام رکھتا ہے کہ اس نے ”انکارِ دینِ قدیم“ اور ”تخریبِ اسلام کہنہ“ کی تحریک کو مستشرقین کے طرز پر ایک ”علمی“ اور ”فلسفی“ انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہی نہیں بلکہ بڑی محنت کی ہے۔ تاہم احسانِ ناشناسی ہوگی اگر وہ اپنے ان تمام ”اسلاف“ کے شکر گزار نہ ہوں، کیونکہ کم از کم اصل مقصد کی حد تک تو یہ لوگ یقیناً موصوف کے لئے ”ہر اول دستہ“ ثابت ہوئے ہیں اور انہوں نے موصوف کی تحریک کے لئے کافی حد تک زمین تیار کر دی ہے۔ بالخصوص موخر الذکر کا تو انہیں بہت زیادہ ممنون ہونا چاہئے کہ ان کے اور ان کے نظریات و افکار، سچ مچ کافی حد تک میل کھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرویز صاحب کے ائی ایک ”خاص تربیت یافتہ“ اصحاب جو برسوں ان سے منسلک رہے، اب ڈاکٹر صاحب کی صفوں میں نظر آتے ہیں، کیونکہ ان کا قدیم مشن — قدیم اسلام کو غلط ثابت کرنا — یہاں ذرا سنجیدہ، علمی، اور سائنٹیفک ہے۔

ڈاکٹر صاحب انکارِ دینِ قدیم، اور تخریبِ اسلام کے لئے — جس کو وہ احکامات و تقریب عنوان ”اسلام کی تعمیر نو“ (Re-Construction of Islam) — تبصیر کرتے ہیں — جو ”فلسفہ“ پیش کیا ہے، وہ مغربی اصطلاح میں ”فلسفہ ارتقا“ اور مشرقی اصطلاح میں ”فتنہ استراق“ کہلاتا ہے، یہ فلسفہ یا فتنہ موصوف کی

اختراع نہیں بلکہ کافی مدت سے یہودیوں اور مسیحیوں کا ”چبایا ہوا لقمہ“ ہے (ملاحظہ فرمائیے کتاب العقیدہ والشریعہ و تطور الفقہ الاسلامی، بحوالہ دفاع عن العقیدۃ والشریعہ لعلاّمہ محمد غزالی المصری — مطبوعہ دارالکتب الحدیثی) جس کا مقصد اس کی ابتداء آفرینش ہی سے یہ تھا کہ اسلام کی موجودہ شکل کو ارتقا کی ”شعبہ بازی“ قرار دے کر اسلام اور عیسائی کلیسا کو ہم رنگ اور ہم شکل ثابت کیا جائے تاکہ جس طرح مغربی نسل — یورپین اقوام — نے عیسائی کلیسا کے جبروت کا جوا اتار پھینکا ہے اور ”مادر پدر آزاد“ ہو گئے ہیں اسی طرح مسلمانوں کی آنے والی نسل بھی اسلام اور اس کی صحیح تعلیمات کا جوا آسانی سے اتار پھینکے اور ”پابندی اسلام“ سے آزاد ہو جائیں ”پیر مغربی“ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا؟ اس کے لئے ڈاکٹر صاحب، ان کے قلمی رفقا اور ان کے مکتب فکر کی شہادت کافی ہے۔

اسے ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی کہنے یا کچھ اور کہ ان کی عقل و خرد، شعور و احساس، فہم و ادراک، اور ہوش و حواس کی آنکھ ٹھیک اس ماحول میں جا کر کھلی، جہاں اس ”فلسفہ“ کا چرچا اس شدت سے تھا کہ ہم مشرقیوں کو بھی اس کی گونج اور صدائے بازگشت کبھی کبھی سنائی دیا کرتی تھی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ موصوف کی ”ساخت و پرداخت“ اور تعلیم و تربیت ان ہی ”ارتقائی فلاسفہ“ کے سپرد ہوئی، جن کے دل و دماغ کا سب سے بڑا کائنات ”مذہب اسلام“ تھا، اس لئے ان کے لائق اور قابل فخر تلمیذ رشید کا ان سے ”متاثر“ ہونا، بلکہ ان کا ”معتقد“ اور ان سے علمی حلقہ میں ”مرعوب“ اور مسحور“ ہونا ایک فطری امر تھا، کیونکہ بقول خود ان کے :

”ایک یکساں ”نظام فقہ“ کی تشکیل میں ایک اور امر یہ مانع

تھا کہ ہر مذہب فقہ کے پیرو اپنے ”بانی“ اور ”شیوخ“ کا غیر معمولی

احترام کرتے تھے، اور بالعموم ان کی رائے سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔

— ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، جہاں کوئی فقیہ، دوسرے مذاہب فقہ کے افکار و آراء سے متاثر ہو کر کسی مسئلہ میں اپنے موقف سے دستبردار ہو گیا ہو، امام ابو یوسف اپنی کتاب ”الرد علی سیر الاوزاعی“ میں بالعموم امام ابو حنیفہؒ کے موقف کی تائید کرتے ہیں، صرف دو تین مقالات پر مثلاً دارالحرب میں ”ربوا“ کے مسئلہ کی نسبت وہ امام اوزاعی کی حمایت کرتے ہیں۔

یہ امر بالکل فطری ہے، اور آج بھی بالعموم یہی ہوتا ہے کہ شاگرد اکثر امور میں اپنے استاد کا ہم خیال ہوتا ہے۔“

(فکر و نظر ج ۳ ش ۸، ص ۵۶۷)

اس فطری عمل نے ڈاکٹر صاحب کے مزاج پر گہرا ”ارتقائی“ رنگ چڑھایا، تا آنکہ ڈاکٹر صاحب کو ”فرقہ ارتقائیہ“ کا امام، اور گولڈ تسیر اور جوزف شاخت کی فکر کا آدمی بنادیا، اب وہ اس فن کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف اور اس کے اصول و فروع کے اس قدر ماہر ہیں، کہ وہ اپنے ”مغربی اساتذہ“ کے ”ارتقائی نظریات“ کی پورے شرح صدر کے ساتھ تبلیغ کرتے ہیں، اور جہاں ان کا کوئی نظریہ لائق توجیہ ہو، وہاں دلائل و براہین کے ساتھ اسے موجہ کر دیتے ہیں، اور اگر مشرقی فضا کے لئے وحشت آور ہو تو اسے نئے اور مانوس اسلوب میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو مقالہ ”سنت“ مشمولہ فکر و نظر ج ۱ ش ۱ ص ۱۶) اور اگر کسی ”اسلامی مسئلہ“ پر وہ لوگ ”ارتقائی دلائل“ پیش نہیں کر سکے، تو موصوف اس کے لئے جدید اصول وضع کرتے ہیں، اور نئے دلائل مہیا فرماتے ہیں، علمی اصطلاح میں کہنا چاہئے

کہ اس فن ارتقا میں ان کو ”مجتہد فی المذہب“ کا مقام حاصل ہے، (جسے بر خود غلط خوش فہمی سے انہوں نے ”اجتہاد فی الدین“ تصور کر لیا ہے) گویا علامہ اقبالؒ کے پیر رویؒ نے انہیں کو سامنے رکھ کر کہا تھا :

مرغ پر نارسہ چوں پراں شود
طعمہ ہر گربہ دراں شود!!!

فلسفہ ارتقا کے بنیادی اصول

اس فلسفہ ارتقا کی بنیاد جن ”اصول موضوعہ“ پر رکھی گئی ہے وہ بہت سادہ، مختصر، اور بظاہر دلفریب ہیں، یعنی :

الف : ”آنحضرت (ﷺ) اساسی طور پر بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے۔“

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۶)

ب : ”آپ (ﷺ) شارع --- قانون ساز --- نہ تھے اس لئے اسلام کی ترقی کے لئے نہ آپ (ﷺ) نے قانون سازی کی، نہ از روئے قیاس اس کے لئے آپ (ﷺ) کو فرصت تھی۔“

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۸)

ج : ”دور نبوی (ﷺ) میں بھی صحابہ کرامؓ اپنی عقل و فہم یا رسوم و رواج کے موافق خود ہی فیصلہ کیا کرتے تھے، اگر انتہائی غیر

معمولی حالات میں ذات نبوی (ﷺ) کو زحمت بھی دی جاتی، یا بہت خاص حالات میں قرآن کا سارا لینا ہی پڑتا، تو ان قرآنی اور نبوی فیصلوں کی نوعیت محض ہنگامی اور وقتی ہوتی، جنہیں قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، زیادہ سے زیادہ ”ایک گونہ نظیر“ ہی کہا جاسکتا ہے۔“ (فکرو نظر جلد ۱ ص ۱۸)

و: ”محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کو طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت (ﷺ) نے کوئی اقدام فرمایا ہے، لیکن اس کے لئے بھی آپ (ﷺ) اکابر صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، یعنی ان کا مشورہ تہائی میں یا پبلک میں حاصل کر لیا جاتا۔“ (فکرو نظر ج ۱ ص ۱۸)۔

ان فرضی مقدمات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کو بھی فلسفہ ارتقاء کے اصول موضوعہ میں شامل کر لیا گیا چنانچہ کہا گیا کہ :

ہ: ”قرآن تو عام اخلاقی اصولوں کے علاوہ کوئی قانون اپنے اندر نہیں رکھتا، وہ صرف ان ”علل و غایات“ کے اعتبار سے ابدی ہے جو اس سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔“ (فکرو نظر ج ۲ ص ۲۳۷)

(جن کو ان ”ارتقائی ڈاکٹروں“ سے پہلے.... امت میں کوئی بھی اخذ نہیں کر سکا۔ ناقل)

و: ”اور سنت کا اول تو (قرآنی بیانات سے باہر قانونی یا اخلاقی امور

کے متعلق) وجود ہی نہیں۔“ (فکر و نظر ج ۱ ص ۱۲)۔

ز: ”اور اگر اس کا وجود تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ کوئی متعین شی نہیں۔“

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۲)۔

ح: ”بلکہ وہ ایک ”عمومی محیط تصور“ اور ”تعالیٰ اصطلاح“ تھی جو کسی خاص مادے اور عنصر تک محدود نہیں ہوتی، نہ کی جاسکتی ہے، بلکہ مختلف کوائف و ظروف میں اس کی مختلف تعبیروں اور تطبیقوں کی گنجائش ہے۔“

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۸)۔

— (یعنی سنت کا وجود تو ہے، لیکن بالکل مبہم، غیر معقول، فلاسفہ یونان کا ہیولیٰ وجود ہے لیکن عدم سے بدتر۔ ناقل)

ان تمام مبادیات کو سامنے رکھنے سے جو اہم سوال کھڑا ہونا چاہئے تھا، وہ یہ ہے، کہ اسلام کا یہ عظیم الشان ”علمی ذخیرہ“ جو ہمارے سامنے تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، اصول وغیرہ کی شکل میں عبادات، عقاید، معاملات، اخلاق، حدود اور سیاسیات وغیرہ کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے، یہ آخر کہاں سے آیا؟ بس اسی سوال کے جواب کا نام ”فلسفہ ارتقاء اسلام“ ہے، پہلے اجمالاً ”اتنی بات ذہن نشین کرائی گئی کہ یہ سب عہد وسطیٰ کے فقہاء (اور محدثین) کی رنگ آمیزی ہے،“ (فکر و نظر ج ۱ ص ۱۶) اس کے بعد حدیث، فقہ، عقاید، اور اصول، الغرض علوم اسلامیہ کے ایک ایک شعبہ کو لے کر اس کے۔۔۔ بالکل فرضی۔۔۔ ارتقائی منازل بیان کئے جانے لگے اور اسلام کے ایک ایک جزئی مسئلہ کا سرا محمد ﷺ سے ”کٹ کر“ زمانہ بعد سے ”جوڑا“ جانے لگا، اور ساتھ کے ساتھ ہر مرحلہ پر امت مسلمہ کے قائدین اور دین اسلام

کے محافظین، ائمہ مجتہدین، فقہاء و محدثین بلکہ صحابہ و تابعین کی فرضی لغزشوں کے اسانے تراشے جانے لگے، اور یہ سب کچھ اتنی صفائی، چابکدستی، سبک روی، ملمع کاری، اور ”معصومانہ انداز“ میں کہا گیا کہ قاری خود بخود یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے کہ معاذ اللہ دنیا کا سب سے بڑا ”سازشی“ اور مکروہ مذہب اسلام ہے اور خطہ زمین کے سب سے بدتر، مکار اور فریبی ہر دور کے مسلمان علما کرام، محافظین اسلام ہیں ”معاذ اللہ۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ”اسلامی منہاج کی تاریخ“ (بزبان انگریزی جس کا ترجمہ سلسلہ مقالات ”فکر و نظر“ کی زینت ہے) اسی موضوع پر ان کا کامیاب ترین شاہکار ہے۔

فلسفہ ارتقا اسلام کے اختراع کا پس منظر

فلسفہ ارتقا اسلام کے یہ ”مباہوی“ اور ”اصول موضوعہ“ مغربی مزاج اور ذہنیت کی پیداوار اور ان کے منتقمانہ مقاصد کی صاف صاف غمازی کرتے ہیں، اور ان میں یہودی اور عیسائی سازش واضح طور پر جھلکتی نظر آتی ہے، درحقیقت :

”مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بد قسمت اور بے توفیق

گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی، اور

اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل ”خشک

دامن“ اور ”تہی دست“ واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام

سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا۔

(الفرقان لکھنؤ ج ۳۱ ش ۷ ص ۳۲)۔ از مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہ۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی یہ غوطہ زنی ایک ”آبدوز کشتی“ کی غوطہ زنی تھی کہ اسلام کی کشتی کو ڈائنامیڈ لگا کر تباہ کر دیں، اللہ تعالیٰ روز اول سے اس ”کشتی“ کے محافظ ہیں انا نحن نرلنا الذکر وانا له لحافظون۔ اس لئے یہ آبدوزیں خود ہی ڈوب گئیں اور فی النار والسقر ہو گئیں۔ (ازمدیر)۔

اصول فلسفہ ارتقا کا تجزیہ

----- چنانچہ پہلے اصول کو لیجئے، کہ ”آنحضرت ﷺ اساسی طور سے اخلاقی مصلح تھے“ یہ اہل مغرب کے نظریہ کی ترجمانی ہے انہیں آنحضرت ﷺ کو بہت بڑے مفکر، اچھے سیاست دان، عظیم قومی رہنما، بلند مرتبہ ریفارمر اور مصلح اعظم کی حیثیت سے تسلیم کر لینے میں کبھی کوئی عذر نہیں ہوا، بنی نوع انسان پر آپ ﷺ کے عظیم الشان احسانات کو وہ بڑی فراخ دلی سے تسلیم کر لیں گے، اسلام کو ایک ”عظیم انقلابی تحریک“ کی حیثیت سے مان لینے سے بھی کبھی ان کو انکار نہ ہوگا، آپ ﷺ نے قرآن مجید کے ذریعہ سے، اصلاح عالم کا جو صور پھونکا، اور آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ نے فدائیت، جانبازی اور جانفروشی کے جو مظاہرے کئے، ان کو آنحضرت ﷺ کی بصیرت، دور اندیشی، اور سیاسی قائدانہ صلاحیتوں کا کرشمہ قرار دینے میں بھی انہیں کبھی کوئی باک نہ ہوگا، وہ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ مادر گیتی نے آپ ﷺ جیسا عظیم قائد، عظیم مدبر، اور داعی انقلاب پیدا نہیں کیا، وہ ڈاکٹر صاحب کے اس خراج تحسین کو بھی مان لیں گے، کہ :

”آنحضرت ﷺ کے کردار میں مذہبی اقتدار اور

جمہوریت کا کچھ ایسا حسین انداز کا امتزاج تھا جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔“ (یہ ہے نبی کی تعریف۔؟ معاذ اللہ۔ ناقل)

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۸)۔

الغرض آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کی تمام جزئیات جن کا تعلق خالص اخلاق سے ہے، ان کو تسلیم کر لینے میں انہیں ذرا تامل نہ ہوگا، بلکہ آپ ﷺ کے ذاتی اخلاق و عادات، صبر و استقامت، لیاقت و قابلیت کو بسرو چشم قبول کرنے میں بڑے عالی ظرفی کا ثبوت دیں گے، لیکن انہیں جس امر کے تسلیم کئے جانے سے انکار ہے اور جسے تسلیم کئے بغیر آپ ﷺ کے کمالات کی تمام ”گردان“ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ ”صاحب شریعت“ نبی تھے، آپ ﷺ جو کچھ فرماتے تھے یا جو کچھ کرتے تھے، وہ کبھی اپنے دل و دماغ، عقل و فہم اور بصیرت و ادراک سے نہیں بلکہ ”وحی الہی“ کے ذریعہ کہتے تھے اور مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے کرتے تھے، ”وحی الہی“ آپ ﷺ کے ہر قول و فعل، حرکت و سکون، نشست و برخاست، صلح و جنگ، اور عبادت و معاشرت کی ذمہ دار اور نگران تھی، اس لئے آپ ﷺ کا ہر قول و فعل دین و شریعت کا مستقل ماخذ اور وحی خداوندی کے مطابق دین کا ناقابلِ تنسیخ قانون ہوتا تھا، آپ ﷺ صرف نبی مرسل ہی نہ تھے، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ آپ تمام ادیان کے ناسخ بھی تھے، آپ ﷺ کی تشریف آوری سے دین موسوی، دین عیسوی، اور خطہ عالم کے تمام ادیان پر خطِ تنسیخ کھینچ گیا، وصول الی اللہ کے دوسرے تمام راستے بند ہو گئے، معراج انسانیت کی تمام سعادتیں صرف آپ ﷺ کے نقش قدم اور اسوہ حسنہ میں منحصر ہو گئیں اسی لئے آپ ﷺ کی بعثت کے بعد صرف ”امتیں“ نہیں، بلکہ امتوں کے نبی اور اولوا العزم نبی بھی آپ ہی کے فیصلے، آپ ہی کے قانون، آپ

ہی کی شریعت، آپ ہی کی تعلیم اور آپ ہی کی کتاب و حکمت کے تابع ہوں گے، اسی پر بس نہیں، بلکہ آپ خاتم النبیین اور آخری نبی بھی ہیں، آپ ﷺ کی وحی آخری وحی، آپ کی کتاب آخری کتاب ہے، اس لئے آپ ﷺ کی شریعت ایسی جامع اور ناقابل تنسیخ قانون شریعت ہونا چاہئے کہ اس کے بعد قیامت تک کے لئے کسی شریعت، کسی قانون، کسی دینی نظریہ، تھیوری اور اتھارٹی کی ضرورت باقی نہ رہ جائے۔ (ملاحظہ ہو حجتہ اللہ البالغہ باب الحاجہ الی دین تنسیخ الادیان ص ۱۱۸ مطبوعہ منیریہ)

الغرض ”دانشوران مغرب“ کو اپنی تمام علمی کاوشوں کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، رسالت، وحی، کامل، واکمل شریعت، اور ماموریت من اللہ سے انکار ہے اور شدید انکار ہے ورنہ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، آپ ﷺ کے بارے میں اخلاقی مصلح، عظیم مفکر، داعی انقلاب، محسن انسانیت وغیرہ نہایت خوبصورت القاب کے تسلیم کر لینے میں ان کا کیا بگڑتا ہے، ان کے مذاہب پر کیا حرف آتا ہے، ان کے تحریف ”شدہ مجموعہ کتب“ پر کیا زد پڑتی ہے، اور ان کی بہیمانہ خواہشات کی آزادروی کی کیا حوصلہ شکنی ہوتی ہے؟

یہ ہے فلسفہ ارتقا کا ”بنیادی پتھر“ جسے ہمارے ڈاکٹر صاحب نے دانایان فرنگ سے حاصل کیا اور بڑی سادہ مزاجی، مگر پر مکاری کے ساتھ اس پر ”ارتقا اسلام“ کی عمارت اٹھانا شروع کر دی، یعنی یہ کہ آنحضرت ﷺ اساسی طور سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے، آپ کو اس کی فرصت ہی کہاں ملی کہ آپ امت کے لئے قانون بناتے۔

ہم پھر ایک دفعہ اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں، کہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں ”اساسی طور پر اخلاقی مصلح“ کا نظریہ بظاہر کتنی ہی جاذبیت، دل آویزی

اور دل فریبی کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن اس کی تہ میں یقین مانیے ”آپ ﷺ کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت کے انکار“ کا ”چور“ چھپا ہوا ہے، ہم صاف کہیں گے کہ جن اہل مغرب نے یہ نظریہ پیش کیا، یہ ان کی کور چشمی، ہٹ دھرمی، منتقمانہ ہالنی کی دلیل ہے، اور ان کے جن مشرقی ”شاگردوں“ نے اسے قبول کیا یہ ان کی سادہ لوحی، خود فریبی اور ایمان سے محرومی کا نشان ہے، ہمارے ان ”فریب خوردہ“ دوستوں کو اگر ان الفاظ میں درشتی اور گرانی کا احساس ہو، تو میں ان سے بصد احترام، معذرت لرتے ہوئے درخواست کروں گا کہ مجھے یہ سوال کرنے کا حق دیجئے کہ قرآن مجید کی اس آیت میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے، کتاب الہی کے کس فقرے میں آپ کو ”ایسا المصلح“ سے خطاب کیا گیا ہے، حضور اقدس ﷺ کے کس ارشاد میں اس ”اساسی حیثیت“ کو بیان فرمایا گیا ہے، اور اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں کس ”صحابی“ تابعی، فقیہ اور امام نے یہ کہا کہ آپ ﷺ کی ”اساسی حیثیت“ ”اخلاقی مصلح“ کی تھی اور بس۔؟

کسی کو غلط فہمی نہ ہونی چاہئے، ہمیں آنحضرت ﷺ کے ”اخلاقی مصلح“ ہونے سے انکار نہیں، بلکہ ڈاکٹر صاحب کے ”اساسی“ نظریہ کے منفی پہلو سے انکار ہے یعنی ہم اور تمام دنیا اسلام آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت اور دین و شریعت پر ایمان لائے ہیں ”اخلاقی مصلح“ کا تصور ”عقیدہ نبوت“ کا جزو لاینفک ہے، اس لئے کہ ”اخلاقی اصلاح“ دائرہ نبوت میں آپ سے آپ آجاتی ہے، ہر نبی لازماً ”اخلاقی مصلح“ بھی ہوتا ہے، مگر ہر ”اخلاقی مصلح“ تو ”نبی“ نہیں ہوتا، دیکھنا یہ ہے کہ ان مغربی دوست نمادشمن کافروں اور معاندوں کے سوا بھی کسی اور محقق و مورخ کو کبھی یہ سوچا ہے، کہ آپ ﷺ اساسی طور سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح

تھے؟“ اور کیا آپ کی اس حیثیت سے کسی کافر کو بھی انکار ہے؟ اور کیا اس نظریہ کو تسلیم کر لینے سے ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کفر کی دلدل سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

ڈاکٹر صاحب! آپ جس فلسفہ کے زور سے بقول خود دین اسلام کی پوری عمارت کو منہدم کر دینے کا خواب دیکھ رہے تھے (ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد اش ۷-۸ ص ۱۰ سطر ۲) خود اسی کی بنیاد ”جنم میں گرتے ہوئے کنارے“ پر کھڑی ہے، یعنی آنحضرت ﷺ کے بارے میں ”خاتم النبیین“ کے عقیدہ کی بجائے اساسی طور پر اخلاقی مصلح“ کا نظریہ جسے انہوں نے اپنے یہودی اساتذہ سے حاصل کیا، اور ابلہ فریبی سے اپنے فلسفہ ارتقا کا اسے سنگ بنیاد بنا ڈالا ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب کے لئے دو ہی راستے ہیں، اگر وہ اپنے اس نظریہ پر جو انکار نبوت کے ہم معنی ہے، قائم رہتے ہیں، تو مسلمانوں کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ”ڈاکٹر صاحب کا آنحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت اور اسلام کی حقانیت پر ایمان نہیں، ان کا جگہ جگہ آپ ﷺ کو نبی یا پیغمبر (بغیر درود و سلام) کہنا اہل مغرب کی نقالی ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس نظریہ سے دستبردار ہو کر آنحضرت ﷺ کو تمام لوازم نبوت سمیت ”نبی“ ماننے کے لئے تیار ہوں تو ان کے فلسفہ ارتقا کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے، اس لئے انہیں یا اپنے ایمان و اسلام کو بچانا ہو گا یا اس مغرب کے چبائے ہوئے لقمے فلسفہ ارتقا کو؟ دونوں کو یک جا کرنے سے انہیں معذوری ظاہر کرنی ہوگی، خوب کہا ہے :

میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ

بڑے ہی تیز ہیں یورپ کے ”رندے“

(اقبال)

۲۔ اب ذرا دوسرے ”ارتقائی اصول“ پر غور کیجئے، کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ ”شارع“ نہ تھے، آپ ﷺ نے اسلام کی ترقی کے لئے قانون سازی نہیں کی، نہ از روئے قیاس اس کے لئے آپ ﷺ کو فرصت تھی۔ (ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ۱، ش ۱ ص ۱۸) یہ نظریہ بھی خالص یہودیانہ ذہنیت کی پیداوار ہے جسے ہمارے قابل رحم ڈاکٹر صاحب نے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ پیش کیا ہے، اور ان کی سادہ لوحی نے اسے ”وحی آسمانی“ کی طرح قطعی سمجھ کر اس فلسفہ ارتقائی بنیاد میں چن دیا، جس سے وہ قدیم دین اسلام کی پوری عمارت کی بنیاد اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، یہ نظریہ نہ صرف نبوت محمدیہ (علی صاحبها الصلاة والسلام) کو بلکہ پوری تاریخ نبوت کو مسخ کر دیتا ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد ﷺ تک جتنے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی آسمانی شریعت پر خواہ وہ جدید ہو یا قدیم، قائم تھا ”شریعت“ کے بغیر ”نبوت“ کا تصور ہی اہلسانہ خیال ہے، تاریخ نبوت میں ایک نبی کا نام تو بتلایا جائے جس کے پاس کوئی نہ کوئی شریعت نہ ہوئی ہو، کسی آسمانی قانون کا تابع، اور کسی قسم کے ”اصول تشریع“ پر قائم نہ تھا؟ (۱)

مگر یہ مسئلہ یہودی پروفیسر اسمتھ سے نہیں، بلکہ قرآن سے سمجھا جاسکے گا، ڈاکٹر صاحب کی مشکل یہ ہے، کہ وہ قرآنی آیات کو ”یہودی عینک“ کے بغیر پڑھنے سے محذور ہیں۔ خیر سنئے ڈاکٹر صاحب! قرآن اعلان کرتا ہے کہ :

”لکل امة جعلنا منكم شرعة ومنها جا۔“ (مائدہ ۴۸)

(۱) انظر فضل الرحمن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ”مزعمات“ کے ثبوت میں اسی طرح قرآن کریم کی

”آیات“ پیش کریں۔ فرضی قیاس آرائی، اور ”قلمی ساحری“ سے اب کام نہ چلے گا۔ ۱۲۔ مدیر

ترجمہ: ہم نے ہر امت کے لئے ایک شریعت، اور ایک منہاج مقرر کیا۔

”لکل امة جعلنا منسكا هم ناسكو م۔“

(الحج، ۶۷)

ترجمہ: ہم نے ہر امت کے لئے ایک راہ شریعت مقرر کی جس پر وہ چلائے۔

”شرع لكم من الدين ما وصى به نوحا والذي

اوحينا اليك وما وصينا به ابراهيم

وموسى وعيسى۔“

(الشورى، ۱۳)

ترجمہ: اللہ نے تمہارے لئے بھی اسی دین کی وصیت کی ہے جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی، اور جس کی وحی تمہاری طرف بھیجی ہے، اور جس کی وصیت ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی کی تھی۔

”ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها

ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون۔“

(الجن، ۱۸)

ترجمہ: پھر ہم نے آپ ﷺ کے لئے دین کی ایک شریعت

مقرر کی ہے، پس آپ ﷺ اسی کی پیروی کرتے رہیں اور

نادان لوگوں کی خواہشات کی پیروی ہرگز نہ کریں۔

لیکن ڈاکٹر صاحب ان قرآنی اعلانات کے علی الرغم، اعلان کرتے ہیں کہ نبی

(ﷺ) ”شارع“ یعنی صاحب شریعت نہ تھے، ہمیں حیرت ہے، کہ آج ڈاکٹر

صاحب ایسے ذی علم شخص کی بدولت اس ”بدیہی“ مسئلہ پر قلم اٹھانا پڑ رہا ہے جس کے انکار کی توقع کسی نادان، جاہل، مجنون، اور دیوانے سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی،

ڈاکٹر صاحب بھولتے ہیں یا وہ نہیں جانتے یا نہیں جانا چاہتے کہ نبی کو ”قانون سازی“ کی ضرورت نہیں ہوتی، نبی کو تو بنا بنایا ”قانون شریعت“ وحی آسمانی کے ذریعہ دیا جاتا ہے، اور نبی اس قانون شریعت کا مبلغ اور نافذ کنندہ ہوتا ہے خود بھی اس پر مضبوطی اور سختی کے ساتھ قائم رہتا ہے، اور امت کو بھی قولاً و فعلاً اسی کی تعلیم دیتا ہے، اسی لئے نبی کا ہر قول و فعل ”شرع الہی“ کی تفسیر و تشریح ہوتا ہے اور احکام شرعیہ کا ”ماخذ دوم“ ہونے کی وجہ سے حجت ہوتا ہے۔ ۲۳ سالہ تشریعی زندگی میں آنحضرت ﷺ ساکن و ساکت اور چپ چاپ بیٹھے نہیں رہے، بلکہ ہر آن اور ہر ساعت جو اقوال و افعال آپ ﷺ سے سرزد ہوئے، وہی تمام اقوال و افعال و تقریر (بیان سکوتی) ”قانون شریعت“ تھے اور اس قانون شریعت کی تدوین کے لئے کافذی فائلوں اور قرطاسی پرزوں کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ہزاروں صحابہ کرامؓ کی شکل میں زندہ ”ریکارڈ مشینیں“ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون شریعت کا ریکارڈ لینے اور اسے محفوظ و مدون کرنے میں مصروف عمل تھیں، دار ارقم اور مسجد حرام، مکہ مکرمہ میں، مسجد نبوی اور مسجد قبائینہ منورہ میں، وادی بدر، وادی حنین، اور میدان تبوک وغیرہ سفر میں اس قانون شریعت کی --- کلیات الشرعیہ --- لایونیورسٹیاں تھیں، جن میں اس قانون کے اصول و فروع اور ان کی عملی صورتیں سمجھائی اور عمل کرائی جاتی تھیں، ”وحی الہی“ ان طلبہ کو صبغة اللہ و من احسن من اللہ صبغة کی ڈگریاں دے رہی تھی، اور ”عنایت الہیہ“ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون کے لئے ان کو آلہ کار اور قانون شریعت کی نشر و اشاعت کا ٹیپ ریکارڈ بنا رہی تھی اور آیت کریمہ رضی اللہ عنہم رضوا عنه ان کی تصدیق و توثیق کر رہی

تھی کہ رہتی دنیا تک کوئی ان کو دروغ گو نہ کہہ سکے، ان کی صداقت، دیانت اور امانت پر حرف گیری نہ کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ”آپ کو اتنی فرصت ہی نہ تھی“ بے ادبی معاف ہو، تو میں کہوں کہ مغرب کی یہودی تعلیم و تربیت نے ان کو نبوت کے صحیح تصور سے اندھیرے میں رکھا ہے، اس لئے وہ بار بار نبی کے لئے ”قانون سازی“ کی فرصت کا سوال اٹھاتے ہیں، کیا وہ مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیں گے؟ کہ نبیؐ کی ۲۳ سالہ زندگی کا کون سا لمحہ وحی الہی کے تحت تشریع قانون سے خالی رہتا تھا، آپؐ کا تو کھانا، پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، گھر میں، گھر کے لوگوں سے اور گھر سے باہر اصحاب و اتباع سے ملنا جلنا، کیا یہ سب اقوال، احوال اور اخلاق مسلمانوں کے لئے ”شریعت“ نہ تھے؟ کسی کو مبالغہ کا وہم نہ ہو، بلاشبہ نبیؐ کا تو سونا بھی تشریع سے فارغ نہیں ہوتا، نہ اس حالت میں وحی الہی کا تعلق نبیؐ سے منقطع ہوتا ہے اس لئے کہ نبیؐ کی شان یہ ہے کہ ان عینی تنام و لاینام قلبی اس لئے نبیؐ کی ہر خلوت و جلوت، قول و فعل، صحت و مرض، بیداری و خواب، جینا اور مرنا سب امت کے لئے ماخذ قانون شریعت ہوتی ہے، قرآن عظیم اس کی شہادت دے رہا ہے۔ قل ان صلوتی ونسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین اسی لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنہ“

ترجمہ: اے نبیؐ کی امت تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں

بہترین نمونہ ہے۔“

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خاص قول و فعل اور عبادت و معاشرت کو نہیں، بلکہ سرِ تپا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات معصوم کو مسلمانوں کے لئے بہترین نمونہ عمل قرار دیا گیا ہے، اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نبیؐ کی شخصیت

سے جو کچھ بھی صادر ہوگا۔ وہ امت کے لئے شریعت، قانون اور دستور العمل بنتا چلا جائے

کا۔ (۱)

آپ چاہیں تو اسے یوں تعبیر کر لیں، کہ نہ نبی ﷺ شریعت الہیہ سے کبھی ایک انچ ہٹنے پاتا ہے، نہ شریعت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایک لمحہ کے لئے الگ ہو سکتی ہے، نبی جو راہ اختیار کر لیتا ہے، وہی راہ شریعت بن جاتی ہے اور نبی جہاں بیٹھ جاتا ہے، وہی ہیئت نشست شریعت کا قانون بن جاتی ہے۔

جب نبی کی زندگی اور موت کا ہر لمحہ رضائے الہی میں فنا ہو کر صرف خدا کے لئے وقف ہو کر رہ جاتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے، کہ نبوی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تشریع (بیان احکام شریعت) سے خالی جاتا ہوگا؟ جب کہ نبی کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر تعجب ہے کہ آپ ﷺ کو ”تشریع“ کی فرصت ہی کب تھی، اور ہمیں اس پر تعجب اور فخر ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو ”تشریع“ سے فرصت کب تھی اور کہاں تھی؟ (دیکھئے ”کی“ اور ”سے“ کا فرق کہاں سے کہاں پہنچ گیا)۔

ڈاکٹر صاحب نے شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وتحمیۃ) کے انکار تشریع پر کتنی وزنی اور معقول دلیل بیان فرمائی ہے یعنی ”قیاس یہ کہتا ہے“ مجھے ان کے خفا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو بصد ادب عرض کرتا، کہ آنجناب نے تمام شریعت اسلامیہ اور دین خداوندی کو رد کرنے کے لئے ”قیاس یہ کہتا ہے“ کی منطق، اختراع کی ہے اس کی بہ نسبت تو صرف ایک امر الہی (سجدہ آدم) کو رد کرنے کے لئے ”قیاس یہ کہتا ہے“ کی ”ابلیسی منطق“ کئی درجے زیادہ وزنی ہے، اس لعین نے

(۱) مگر مصیبت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کان میں گولڈنر نے پھونک دیا کہ حدیثیں سب زمانہ بعد کی

ہیں۔ ملاحظہ ہو الدراسات الاسلامیہ (از مدیری)

اپنے ”قیاس یہ کہتا ہے“ کو ثابت کرنے کے لئے منطقی انداز میں (انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقته من طین) غلط سلسلہ فرضی مقدمات (صغریٰ، کبریٰ) ترتیب دے کر ایک منطقی قیاس تو بیان کر ہی ڈالا، مگر ”آپ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا“ آپ نے صرف ”قیاس یہ کہتا ہے“ ہی پر کفایت فرمائی، اس ”قیاس“ کے لئے کچھ فرضی مقدمات ہی ترتیب دے لئے ہوتے۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے قیاس نے جو کچھ کہا ہے، یعنی ”نبی کو تشریع کی فرصت نہ تھی“ اسے ایک لمحہ کے لئے بفرض محال تسلیم کر لیجئے، تو کیا فوراً ”یہ سوال نہ ہوگا کہ کیا وحی نازل کرنے والا خدا بھی ”عَدِیم الفرصت“ تھا؟ اس نے اپنے نبی ﷺ کو ”لاقانونیت“ کی زندگی کیوں گزارنے دی، اور اگر قانون شریعت کی تدوین کے لئے ”ادارہ تحقیقات اسلامیہ“ ہی کی ضرورت تھی تو فرشتوں کا ایک ”بورڈ“ مقرر کر دیا جاتا، آخر جو کام آج ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی سی ”اداری“ کر ڈالنا چاہتی ہے، ڈاکٹر صاحب کا قیاس کیوں یہ کہتا ہے، کہ وہی کام نہ خدا کر سکتا تھا نہ اس کے فرشتے، نہ نبی ﷺ سے وہ ہو سکتا تھا، نہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ :

بریں عقل و دانش بیاہد گریست

کچھ بھی ہو ڈاکٹر صاحب کا ”قیاس“ کہے یا نہ کہے، لیکن واقعہ یہی ہے، کہ حق تعالیٰ نے تمام انسانی حاجات کے لئے کافی و وافی قانون شریعت ”قرآن و حکمت“ کی شکل میں نازل فرمایا، آنحضرت ﷺ نے اس کی تلاوت اور تعلیم فرمائی، قولاً و فعلاً تبیین (تشریح) فرمائی، مجتہدین، صحابہ، تابعین اور ائمہ دین نے اس کی تعبیر و تفسیر کو اس قدر نکھار دیا، کہ الحاد و زندقہ، اور تغیر و تحریف کے سب دروازے بند ہو گئے،

اب جو شخص اس تشریح و تفسیر پر حملہ کرے گا، اسے شریعت کا انکار کئے بغیر چارہ نہ ہوگا، ہمارے ڈاکٹر صاحب کا دامن ایمان اسی انکار کی خار زار میں الجھ کر تار تار ہو رہا ہے، نعوذ باللہ من فتنۃ الصدر۔

ڈاکٹر صاحب سالہا سال کی مغربی تعلیم اور ”استشرافی“ تربیت کے باعث ”انکار شریعت محمدیہ“ اور ”ہدم دین اسلام“ کے جس مقام پر راسخ القدم ہیں اس کے پیش نظر ان سے اور ان کے مکتب فکر سے بظاہر یہ توقع مشکل ہے، کہ وہ ہم غریب ”قداست پسندوں“ کی معروضات پر توجہ، اپنے مغربی نظریات پر نظر ثانی اور بیچارے اسلام پر ”رحم“ کرنے کے لئے تیار ہوں گے، بلکہ یہاں تو صورت حال یہ ہے کہ : ”میں کہوں گا حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟“ لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے کہ کم از کم ”معذرة الی ربکم“ کے درجہ میں سہی، اس سلسلہ میں کچھ مزید گزارش کی جائے ولعلہم یتقون۔

انکار شریعت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا وسوسہ کہئے یا شبہ، یہی ہے کہ نبی کو ”تشریح“ یا ان کے لفظوں میں ”قانون سازی“ کی فرصت کہاں تھی؟ حالانکہ اتنی بات ڈاکٹر صاحب بھی جانتے ہوں گے، کہ آنحضرت ﷺ کو ۲۳ سالہ تشرعی زندگی میں فرد اور معاشرہ دونوں سے متعلق تمام ہی امور سے سابقہ پڑا ہے، ذاتی اور نجی زندگی سے لے کر حکومت کے انتظام و انصرام، اور بین المملکتی، تعلقات تک سے متعلق آنحضرت ﷺ کے سامنے مسائل زندگی ایک ایک کر کے آئے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آپ نے (معاذ اللہ) ان پیش آمدہ مسائل کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ وحی الہی، فراست نبوت، اور ہمت مملکیہ یا ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں ملہمانہ بصیرت، کے ساتھ آپ ﷺ نے زندگی کی تمام مشکلات کا حل پیش کیا ہے، پیش آمدہ مسائل کی ایک ایک گرہ کو کھولا ہے اور زندگی

کے ”ہرموز“ پر آپ ﷺ نے امت کے لئے راستہ معین فرمایا ہے، کیا ان تمام امور کو آنحضرت ﷺ کی ”تشریح“ یا باصطلاح جدید ”قانون سازی“ نہ کہا جائے گا؟ نبی ﷺ کے لئے یہ تشریح کتنی آسان ہے، اس کے لئے کسی طویل فرصت، اور تحقیقاتی بورڈ کی قطعاً حاجت نہیں۔ کہ نبی ﷺ ایک دفعہ وضو کر کے دکھاتا ہے، تو ”کتاب الوضوء“ کی سینکڑوں جزئیات کی تعلیم و تشریح ہو جاتی ہے، نبی ﷺ وحی الہی کی روشنی میں امت کے سامنے نماز کی دو چار رکعتیں پڑھتا اور پڑھاتا ہے تو ”کتاب الصلوٰۃ“ کے ہزاروں مسائل کی تشریح کا دروازہ کھل جاتا ہے، اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج قربانی، جہاد، نکاح و طلاق، بیع و شراء، حدود و قصاص، صلح و جنگ وغیرہ عبادات و معاملات و معاشرت کے لاکھوں مسائل میں سے ایک ایک کی تشریح، نبی ﷺ اپنی عملی اور فعلی تعلیم سے چند منٹوں میں کر دیتا ہے، اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ نبی ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی بھی تشریح کے لئے ناکافی تھی؟

اور یہ تو آپ ﷺ کی فعلی تشریح کا حال ہے، اسی کے ساتھ اگر آپ ﷺ کے ارشادات، کلمات طیبات اور جوامع الکلم کو بھی ملایا جائے، تو تشریح نبوی ﷺ کا مسئلہ اور بھی اقرب الی الفہم ہو جاتا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال عرض کرتا ہوں، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک معصوم بچے سے ازراہ ملاطفت و مزاح فرماتے ہیں: یا ابا عمیر! ما فعل النغیر۔ (اے ابو عمیر! وہ چڑیا کیا ہوئی؟) یہ بادی الرائی میں ایک معمولی سافقرہ ہے جس کے حروف کی تعداد ۱۷-۱۸ سے زائد نہیں، لیکن یہی چند حرفی فقرہ جب لسان نبوت سے صادر ہو جاتا ہے، تو مزاج شناسان نبوت کو اسی سے بیسیوں بلکہ تقریباً ”ایک صد مسائل شرعیہ کا سراغ مل جاتا ہے“ ملاحظہ ہوں شروح حدیث۔ جس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اعلان برحق یہ ہو:

”اوتیت جوامع الکلم‘ واوتیت علم

الاولین والاخرین۔“

ترجمہ: ”مجھے جامع کلمات اور اولین و آخرین کے علوم عطا کئے گئے

ہیں۔“

اس نبی علیہ السلام کے بارے میں میں نہیں سمجھتا۔۔۔۔۔ کہ کسی مومن کے منہ سے یہ بات بھی نکل سکتی ہے کہ آپ ﷺ کو معاذ اللہ تشریع کی فرصت نہیں ملی۔

تقریب الی الفہم کے لئے وحی اور نبی ﷺ کے باہمی تعلق کو ”روح و جسم“ یا ”قوت برقی اور مشینی آلات“ کے مابین تعلق سے سمجھا جاسکتا ہے، جس طرح جسم کے تمام اعضا کی ساخت پوری، ٹھیک اور درست کردینے کے بعد قدرت الہیہ اس پر روح کا فیضان کرتی ہے، اور مرکز جسم۔۔۔۔۔ قلب۔۔۔۔۔ سے روح کا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے، تو تمام اعضا جسم فوراً اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، کان سننے لگتے ہیں، زبان گویائی میں مصروف ہو جاتی ہے، آنکھیں محو تماشا ہو جاتی ہیں، پاؤں تگ و دو کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، ہاتھ قبض و سط، داد و ستد، اور گرفت و گزار، میں منہمک ہو جاتے ہیں، الغرض جسم کے تمام آلات و جوارح، اور قوائے شعور و احساس کے یہ تمام افعال بظاہر جسم ہی سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، لیکن حقیقت شناس جانتا ہے کہ یہ تمام افعال ”روح“ کا فیض ہے، اور اعضا جسم اس کے لئے ”آلہ کار“ ہیں، یا کسی ”مشینری“ کے تمام پرزوں کو پوری طرح فٹ کر دینے کے بعد برقی خزانہ سے جب بجلی چھوڑی جاتی ہے اور ان مشینی آلات کا برقی طاقت کے ساتھ رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے، تو پوری مشین اور اس کا ایک ایک پرزہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے، یہاں بھی ان مشینی پرزوں کی حرکت اور عملی تگ و دو ان کی ذاتی نہیں، بلکہ یہ تو صرف قوت

کرمائیہ کے لئے ”آلہ کار“ ہیں، ٹھیک اسی طرح۔۔۔ لیکن بلا تشبیہ۔۔۔
 نبی ﷺ کے قوائے علمیہ و عملیہ کی تکمیل کے بعد جب نبی ﷺ کے
 قلب اطہر کا ”ملاء اعلیٰ“ سے رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے اور وحی الہی کی ”برقی روح“ کا
 اس پر فیضان ہوتا ہے، تو وحی کی تشریح و تفسیر اور اس کے منشا کی تفصیل و توضیح کے
 لئے نبی ﷺ کی شخصیت سراپا عمل بن جاتی ہے، پھر اس سے جو کچھ صادر ہوتا
 ہے، وہ ایک ظاہر میں کی نظر میں نبی کا عمل ہوتا ہے، لیکن حقیقت شناس جانتا ہے کہ
 یہ سب وحی الہی کی کار فرمائی ہے، نبی ﷺ اس کے لئے جارحہ (آلہ کار) کی
 حیثیت رکھتا ہے، وما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى۔

پھر جس طرح یہ ناممکن عادی ہے کہ جسم کے تمام اعضا بالکل صحیح سالم ہوں،
 اور روح کا تعلق بھی جسم سے قائم ہو، لیکن جسم، روح کے اشارہ چشم و ابرو کی تعمیل
 نہ کرے، یا مشینی پرزے بالکل ٹھیک حالت میں اپنی اپنی جگہ فٹ ہوں، اور بجلی کا
 کنکشن بھی ان سے ٹھیک ٹھیک قائم ہو لیکن اس کے باوجود یہ مشینی آلات گردش
 میں نہ آئیں، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے، کہ نبی ﷺ جن کے قبل از نبوت ہی
 اعضا و جوارح، ملکات و قوی، احساسات و رجحانات، اور اخلاق و عادات کو ہر نقص سے
 پاک کر دیا جاتا ہے، کے ساتھ سلسلہ وحی قائم ہو جانے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی
 آپ منشاء وحی کی تعمیل میں کوتاہی کریں، ارشاد خداوندی ہے :

ما ضل صاحبکم وما غوی، وما ينطق عن

الہوی، ان هو الا وحی یوحی۔

(انجم- ۵۲ تا ۵۱)

ترجمہ: ”نہ تمہارا نبی راہ بھٹکا، نہ کج راہ ہوا، وہ اپنی خواہش سے

نہیں بولتا، وہ تو صرف وحی ہے جو اس کے پاس بھیجی جاتی ہے۔"

اس لئے کہ اس رابطہ کے بعد نبی کا ہر قول و فعل، اور خلق و عمل وحی ربانی کی آمد داری سے وقوع پذیر ہوتا ہے، پھر جس طرح لوہا، پیتل وغیرہ کے سیال اور پگھلے ہوئے مادہ کو مختلف قالبوں میں اندیل دیا جاتا ہے، اور وہ جو ایک مادی وحدت تھی ان قالبوں میں جا کر نوع در نوع شکلوں میں متشکل اور مختلف ڈیزائن کے گونا گوں پرزوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح، بلا کیف و تشبیہ، وحی الہی جب نبی ﷺ کے عملی قوالب میں ڈھلتی ہے، تو اعتقادات، عبادات، معاملات، سیاسیات، معاشیات، اور اخلاق کے تشریعی قوانین کی شکل میں متشکل ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے اور حکمت کا نام پاتی ہے۔ وبعلمہم الكتاب والحكمة (ای السنۃ کما فسر بہ کبار الصحابة والمفسرین)۔

الغرض نہ وحی خداوندی نبی ﷺ کے عمل کے بغیر۔۔۔ اپنی تفصیلی تشریحات و تعبیرات میں۔۔۔ ظہور پذیر ہوتی ہے نہ نبی ﷺ کے عمل کو وحی سے جدا کیا جاسکتا ہے، وحی کا صحیح مفہوم اور اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر اسی وقت ممکن ہوگی جب کہ اسے اعمال نبویہ کے جزئیاتی قوالب (یعنی احادیث نبویہ) میں ڈھال کر پڑھا جائے گا، تب ہی اس پر عمل ہو سکے گا، کون نہیں جانتا کہ وحی الہی "صلوٰۃ" کا حکم دیتی ہے، لیکن یہ نماز نبی کے عمل میں متشکل ہو کر ہی سامنے آئی ہے، صلوا کما رایتمونی اصلی۔ وحی الہی "زکوٰۃ" کا حکم دیتی ہے، یہ حکم اپنی تفصیلی نوعیت کے ساتھ سنن نبویہ کے آئینہ میں ہی جلوہ گر ہو سکتا ہے، و قس علی ہذا، یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی نبی مرسل کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی، بلکہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب (ﷺ) کو بھی بھیجا گیا، تاکہ احکام کتاب کی تفصیل و تعیین تعبیر

و تشکیل اور اس کے رموز و اسرار اور تشریحی قوانین کی توضیح کرے، (۱) واللہ اعلم۔
 ۳۔۔۔۔۔ اب ہم اس فلسفہ کے تیسرے ”فرضی“ اصول پر بحث کریں گے، اس میں
 کہا گیا ہے کہ :

”صحابہ کرام پیدا ہونے والے نزاعات کا فیصلہ، اپنی عقل و فہم
 یا رسوم و رواج کے مطابق خود ہی کر لیا کرتے تھے۔ صرف انتہائی غیر
 معمولی حالات ہی میں آنحضرت ﷺ کو فیصلہ کی زحمت دی
 جاتی تھی۔“ ۳۔ اور بہت ہی خاص حالات میں قرآن کا سہارا لینا پڑتا
 تھا، ۴۔ لیکن ان قرآنی اور نبوی فیصلوں کی حیثیت بھی محض ہنگامی
 اور وقتی واقعات کی ہوتی تھی، ۵۔ اس لئے ان کو تشددانہ طور پر
 قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، ۶۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ان کو ”ایک
 گونہ نظیر“ ہی کہا جاسکتا ہے۔
 (فکر و نظر ج ۱ ص ۱۸)۔

یہ چھ کے چھ فقرے بھی خالص یہودی ذہنیت کی پیداوار ہیں، جن میں کفر
 و نفاق عریاں رقص کر رہے ہیں پہلے فقرے میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ دور نبوی میں
 ”لا قانونیت“ کا دور دورہ تھا، وہ لوگ کسی اصول، ضابطہ، قاعدہ، اور قانون کے پابند نہ
 تھے، اسلام سے پہلے وہ اپنی عقل و خرد اور رسوم و رواج کی جس ڈگر پر چلا کرتے تھے،
 اسلام کے بعد بھی وہ اسی پر بدستور چلتے رہے، اسلام نے انہیں کوئی قانون عبادت،
 قانون معاشرت، قانون معاملات، قانون سیاست، قانون تعزیر، اور قانون اخلاق نہیں

(۱) اس بحث میں وحی اور صاحب وحی کے تعلق کے لئے جو مثالیں ہم نے دی ہیں، ان سے مقصود
 محض تقریب الی الفہم ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ وحی کی اصل کیفیت ہر قسم کی مثال سے بالاتر، ہر تشبیہ
 سے منزہ اور وراء الوباء ہے۔ ۱۲ از مقالہ نگار)

بلکہ ان کے لئے قانون عمل یا خود ان کی اپنی عقل تھی، یا لے دے کر اسلام سے پہلے کے وہ جاہلی رسوم و رواج جن کو معمولی تبدیلی کے بعد علیٰ حالہ رہنے دیا گیا تھا، کیا اس فقرے کے مضمرات یہی نہیں ہیں؟ اس مفروضہ سے ایک طرف دور نبوی کی تمام تاریخ مسخ ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف اسلام کی ”عدم افادیت“ بلکہ (معاذ اللہ) ”افویت“ پر مہر لگ جاتی ہے اور کیا یہ بعینہ ۱۔ لامنز (Lammens) ۲۔ مرجلیوٹ (Margoliouth) ۳۔ شاخت (Schacht) کا نظریہ سنت نہیں ہے۔

(فکرو نظر ج ۱ ص ۲۱)

دوسرے اور تیسرے فقرے میں صحابہ کرام کی تاریخ، مزاج اور ذہنیت کو اس قدر تاریک دکھایا گیا ہے جس سے زائد کا تصور ہمارے لئے ممکن نہیں۔ یعنی خدا و رسول کی طرف رجوع کرنے یا ان کے لفظوں میں سہارا لینے کی ضرورت صحابہ کرام صرف انتہائی غیر معمولی حالات، یا بہت ہی خاص حالات میں محسوس کرتے تھے، ورنہ غیر معمولی حالات میں بلکہ خاص حالات میں بھی وہ خدا و رسول سے بے نیاز ہی رہا کرتے تھے، امت کے تمام اکابر محدثین کو ”تاریخ ساز“ قرار دینے والے ”مجتہد“ کا اپنا ضمیر اگر اس غلط، بھونڈی، اور مکروہ تاریخ سازی پر ”نفریں“ نہیں کرتا تو تمام دنیا اندھوں کی نگری نہیں، تاریخ صحابہ کا ہر مبتدی طالب علم بھی اس پر نفریں کھے گا حالات صحابہ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں، کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ سورج کے منہ پر تھوکنے کے مترادف ہے،

چوتھے فقرے میں ”قرآنی“ اور ”نبوی“ فیصلوں کو محض ”ہنگامی اور وقتی“ قرار دے کر بعد میں آنے والی امت کا رشتہ ذات نبوی ﷺ سے کاٹنے اور آنحضرت ﷺ کی قیامت تک رہنے والی نبوت عامہ، پر کاری ضرب لگانے کی انتہائی مکروہ اور شرمناک کوشش ہے جو خالص منتقمانہ یہودی ذہنیت اور ابدیت دین

محمدی کے خلاف کھلی سازش ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس خالص افترا اور ”سفید جھوٹ“ کی کیا دلیل ہے کہ قرآن وحدیث اور خدا و رسول کے تمام فیصلے محض وقتی تھے، بعد کی امت کو ان کی پابندی سے چھٹی دے دی گئی تھی۔ جب قرآن کو تاقیامت باقی رہنا ہے، جب آنحضرت ﷺ قیامت تک کی نوع انسانی۔ اسود و احمر کے لئے نبی رحمت ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد آنے والے بھی آپ ﷺ کے اسی طرح امتی ہیں، جس طرح آپ ﷺ کے زمانہ کے لوگ تھے، جب اسلام ”ابدی صداقت“ ہے، جسے ہمیشہ رہنا ہے، تو ڈاکٹر صاحب کے کان میں کس شیطان نے یہ صورت پھونک دیا ہے کہ مسلمان قرآن کو کتاب اللہ سمجھا پڑھا ضرور کریں لیکن اس کے فیصلوں کو ہنگامی اور وقتی، اور اس زمانہ کے لوگوں کے لئے، کہہ کر ان سے جان چرایا کریں، آنحضرت ﷺ کو ”نبی“ مانا کریں، لیکن آپ ﷺ کے فیصلوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کریں کہ وہ صرف انہی ظروف واحوال اور اسی وقت کے لئے تھے، اسلام کو ”دین حق“ تو تسلیم کیا کریں لیکن اس اعتقاد کے ساتھ کہ اسلام کے تمام قوانین ہماری ”رائے“ کے تابع ہیں ہمیں اپنے زمانہ اور حالات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل کا اختیار ہے اپنے کو نبی کے ”امتی“ کہا کریں لیکن ساتھ ہی یہ نظریہ بھی رکھیں کہ ہم نبی کے کسی ”فیصلہ“ کے اور قول و عمل کے پابند نہیں وہ تو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے تھے :

ع ”تو ہی بتا کہ پھر کافری کیا ہے“

سچ یہ ہے : یریدون لیطفوا نور اللہ بافواہم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

پانچویں فقرے میں ان ”مفروضات بالا“ کے نتیجہ کے طور پر صاف صاف ”کافرانہ“ اعلان کر دیا گیا جس کے سننے کی تاب بھی میرا خیال ہے کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتی، یعنی ”خدا کا فیصلہ بندوں کیلئے اور نبی کا فیصلہ امت کے لئے قانون کا درجہ نہیں رکھتا“ انا للہ۔

ڈاکٹر صاحب جس ”حکومت“ کے نمک خوار ہیں ذرا اس کے بارے میں تو کوئی اعلان کر کے دیکھیں، کہ ”اس حکومت کا ”دستور“ ہم لوگوں کے لئے ”دستور کا“ اور اس کا ”قانون“ ہمارے لئے ”قانون“ کا ایسا درجہ نہیں رکھتا جسے متشددانہ طور پر حرف بہ حرف نافذ کیا جائے، اسی وقت آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا، لیکن یہ تمام مسخرہ پن خدا و رسول اور قرآن و حدیث ہی کے ساتھ سوچتا ہے، لیکن ایسے مسخروں کے بارے میں خدا تعالیٰ کا اعلان بھی سن رکھئے :

قل ابا للہ وآیا تہ و رسولہ کنتم تستہزءون
لا تعتذروا قد کفرتم بعدایمانکم۔

(التوبہ: ۶۵-۶۶)

ترجمہ : ”اے نبی آپ اعلان کر دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے دل لگی کرتے ہو؟ بہانے نہ بناؤ! تم دعوائے ایمان کے باوجود ”کافر“ ہو گئے ہو۔“

چھٹا فقرہ اس سے بھی بڑھ کر ”یہودیانہ“ ہے، ہمارے ”لائق رحم“ ڈاکٹر صاحب خدا و رسول کے فیصلہ کو ”نظیر کامل“ ماننے کے لئے بھی تیار نہیں، کیونکہ ان کی ”اسلامی تحقیقات“ کو اس سے بھی خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہے بلکہ وہ اسے صرف ”ایک گونہ نظیر“ قرار دیتے ہیں، گویا ”ماتحت عدالتوں“ کے لئے ”عدالت عالیہ“ کا فیصلہ جس احترام کا مستحق ہے، بلکہ ایک متوازی اور ہم مرتبہ عدالت کے لئے

دوسری عدالت کا فیصلہ جس قدر لائق احترام ہے، ڈاکٹر صاحب کے ”ماڈرن اسلام“ میں خدا اور رسول کے فیصلوں کو اتنا احترام بھی حاصل نہیں۔ استغفر اللہ۔

پھر ڈاکٹر صاحب کے اشہب قلم کی سبک خراہی ملاحظہ کیجئے کہ وہ ایک ہی سانس میں پے پے ہونے لگتا ہے اور زندیقانہ دعویٰ کی بھرمار کئے جاتے ہیں، لیکن ان کے لئے حرام ہے کہ کسی ایک دعویٰ کی بھی عقلی یا نقلی توجیہ پیش کریں یا دلیل پیش کریں، صرف اس لئے کہ ان کے ان تمام دعاوی کی ”سند“ ان کے استاذ محترم یسودی پروفیسر جناب اسمتہ کے ارشادات ہیں جو ان کے حافظہ میں محفوظ ہیں اور بس! اور ان کا نام لینا مصلحت کے خلاف ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب سے باب التماس کروں گا کہ آپ براہ کرم مسلمانوں کو ”قداست پرستی“ میں مبتلا اور ”قبرستانوں کی طرف رخ کرنے والا“ رہنے دیں (۱) مسلمان اس نام نہاد ”جدید اسلام“ کو لے کر کیا چائیں گے، جس میں خدا اور رسول کو بھی فیصلے سے معزول کر دیا گیا ہو، آپ کے یہ نظریات مسٹر پرویز کے نظریہ ”مرکز ملت“ ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے، آخر اس ایچ پیچ اور لاگ پیٹ کی کیا ضرورت ہے؟ صاف صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ ”ہم اس زمانہ میں خدا کو خدا، رسول کو رسول، اور اسلام کو دین کی حیثیت سے ماننے کے لئے تیار نہیں، اس کے بعد جس قسم کی تحقیقات کا ”شوق فرمائیں“ مسلمانوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، ورنہ پھر خدا اور رسول، قرآن و حدیث، اور دین و شریعت کے خلاف زہرا گلنے اور مکروہ پروپیگنڈا کرنے سے آپ کو کیا حاصل؟ بجز اس کے کہ ”اپنے کفر کے محضر نامہ“ پر دستخط کریں اور ”اقبالی مجرم“ بنیں اس لئے کہ مسلمان ہزار گنہ گار سہی، مگر اتنی ایمانی رمق ان میں بہر حال (۱) ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ماضی کی طرح قرآن و سنت کی طرف سادہ رجعت کے معنی یہ ہوں گے

کہ ہم قبرستانوں کی طرف رخ کر لیں۔ ملاحظہ ہو ”فکر و نظر جلد ۲ ش ۵ ص ۱-۳

اب بھی باقی ہے کہ جس ذات پر وہ ایمان لائے ہیں اس کے خلاف آپ کے ان ”زہر میں بجھے ہوئے تیروں“ کی بارش کو ٹھنڈے دل سے برداشت نہیں کرتے رہیں گے : ایاز! قدر خویش بہ شناس :

آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ مسلمان قوم اپنے نبی ﷺ کی حرمت کے معاملہ میں کتنی غیور، اور سریع الحس واقع ہوئی ہے، ”جرات رندانہ“ کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے، کتنی ڈھٹائی اور دریدہ دہنی کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ خدا و رسول کے فیصلے قانون نہیں بلکہ صرف ”ایک گونہ نظیر“ کا درجہ رکھتے ہیں۔ کس کے لئے؟ مسلمانوں کے لئے؟ خدا کے بندوں اور محمد ﷺ کے امتی کھلانے والوں کے لئے :

”تقوٰ بر تو اے چرخ گرداں تقو!“

۴۔۔۔۔۔ اب فلسفہ ارتقا اسلام کے چوتھے اور آخری اصول کو سامنے لائیے، اب تک جتنے اصول ذکر کئے گئے، ان میں خدا و رسول کے فیصلہ کا ذکر ”وقتی فیصلہ اور ”ہنگامی“ کے عنوان ہی کے ساتھ سہی، مگر بہر حال آتا ہے، مگر اس فلسفہ کے مختصر عین اعداء اللہ و اعداء الاسلام و اعداء المسلمین کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ کسی طرح دین اسلام کا رشتہ وہی خداوندی سے کاٹ کر ”انسانی افکار کی اختراع“ سے مربوط کر دیا جائے، چنانچہ یہ مقصد اس چوتھے ”ارتقائی اصول“ میں صاف صاف اگل دیا گیا، کہا گیا ہے :

”محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی

پالیسیوں کے طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ

صادر کرنے ہی میں آنحضرت ﷺ نے کوئی اقدام فرمایا، لیکن

اس کے لئے بھی آپ ﷺ اکابر صحابہ سے مشورہ کر لیا کرتے

تھے، یعنی ان کا مشورہ تنہائی میں یا پبلک میں حاصل کر لیا جاتا۔

(فکر و نظر ج ۱ ص ۱۸)۔

اس اردو عبارت کا مفہوم بالکل واضح ہے، یعنی ① چند پالیسیوں یا اہم اخلاقی اصولوں کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں فرمایا (۲) وہ فیصلہ بھی محض وقتی ہوتا تھا، دوسرے وقت یا زمانہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، (۳) پھر جو فیصلہ بھی آپ ﷺ نے فرمایا وہ ”وحی خداوندی“ یا ”آپ ﷺ کی تنہا رائے اور اجتہاد کا نتیجہ نہیں، بلکہ اکابر صحابہؓ کے نجی یا علانیہ مشورہ کا مرہون منت ہوتا تھا، لہذا اس عبارت سے مندرجہ ذیل سنگین نتائج برآمد ہوں گے :

۱ — محمد ﷺ کا پیش کردہ اسلام خدا کا نازل کردہ آسمانی دین نہیں تھا بلکہ معاذ اللہ اسلام، محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کی شورائی پالیسیوں کے فیصلوں کا مجموعہ اور انسانی ذہن و فکر کے مخترع اصولوں کا نام ہے،

۲ — اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ کے دور حیات میں بھی کبھی ”جامع و کامل نظام زندگی“ جو فرد اور معاشرے کی تمام شعبہ ہائے زندگی میں دخیل ہو، کے خواب سے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا، بلکہ اس کی ”کل کائنات“ ”کل امثالثہ“ اور ”کل سرمایہ“ چند مبہم قسم کے اخلاقی اصول یا پالیسیوں کے فیصلے تھے، ورنہ ان کے علاوہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو کوئی اعتقادی، عباداتی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی نظریاتی نظام نہیں دیا، نہ ہی کسی قسم کا کوئی فیصلہ فرمایا،

۳ — پھر چونکہ ڈاکٹر صاحب کے بقول یہ تمام اخلاقی اور پالیسی فیصلے بھی وقتی اور ہنگامی تھے، اس لئے رحلت نبوی ﷺ اور مرور وقت کے ساتھ ہی اسلام کا یہ ”امثالثہ“ بھی لٹ گیا، اس لئے مسلمانوں کو اسلام پر تو اناللہ پڑھ لینی چاہئے، اور اپنے

مسائل خود حل کرنے کے لئے نظامائے زندگی مرتب کرنے چاہئیں اور ”لادینی“ کو اپنالینا چاہئے ورنہ اسلام ان کی مشکلات کا علاج نہیں کر سکتا۔

اگر میں نے ڈاکٹر صاحب کی اس اردو عبارت کا مفہوم سمجھنے یا اس کے مضمرات کو بصورت نتائج ظاہر کرنے میں ٹھوکر کھائی ہو، تو میں طالب علم کی حیثیت سے اس کے صحیح نتائج کا خیر مقدم کروں گا، اور اگر الفاظ کی سختی نرمی سے قطع نظر میں نے اس اردو عبارت کی صحیح ترجمانی کی ہے، تو اس عبارت اور اس کے پیدا کردہ نتائج پر تبصرہ کا حق سر دست محفوظ رکھتے ہوئے، ان تمام دانشمندان ملت سے۔ جنہوں نے قرآن کے اور آنحضرت ﷺ کے فیصلوں کو ”وقتی“ کہہ کر بدل ڈالنے، اسلام کو محمد اور اصحاب محمد ﷺ (واصحابہ) کے ”شورائی گٹھ جوڑ“ کا نتیجہ قرار دے لینے اور اسلام کا کل اثاثہ چند ”وقتی پالیسیوں اور اخلاقی اصول“ جن کی تفصیل جناب ڈاکٹر فضل الرحمن ”صاحب بہادر“ بھی بتلانے سے قاصر ہیں۔۔۔ مان لینے کا فیصلہ نہیں کر لیا۔۔۔ اپیل کروں گا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے آرا و افکار، اور عزائم و مقاصد کی تہ کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔

ان ارید الا اصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ۔

(بینات جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ)۔

ڈاکٹر فضل الرحمن کی اسلام کے خلاف زہر افشانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى :

۴ مئی ۱۹۶۶ء سے ۱۱ مئی ۱۹۶۶ء تک امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں ایک مذاکرہ ہوا تھا جس میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس مذاکرہ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔

(ملرو انظر جلد ۴ ش ۱ ص ۹)

اسی ”عالمی مذہبی کانفرنس“ میں پاکستان کے مندوب، ادارہ تحقیقات اسلامی کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب بالقابہ صدر ادارہ تحقیقات اسلامی شریک ہوئے، اس طرح آپ کے لئے اپنے ہم مسلک وہم مشرب، ہم ذوق و ہمراز اور ہم نوالہ وہم پیالہ احباب سے شرف ملاقات، ہم کلامی اور سات آٹھ دن تک کچھ اپنی کہنے اور کچھ ان کی سننے کا زرین موقع ہاتھ آیا، ذرا تصور کیجئے امریکہ کا آزاد ماحول، پرنسٹن یونیورسٹی کی پُر کیف فضا، نہ خطرہ محتسب، نہ شور و شغب ملا، ہم اور آپ کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے، کہ سوز و ساز اور راز و نیاز کی کتنی داستانیں دہرائی گئی ہوں گی، اسلام کے کتنے مثالی معیار اور نصب العین طے ہوئے

ہوں گے اور ان کو بدلتے ہوئے مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا کیا منصوبے زیر غور آئے ہوں گے۔ (۱) ”روایتی اسلام“ کی تدفین کے لئے کن کن تدابیر پر سوچ بچار ہوئی ہوگی، زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ تجدید پسندانہ اصلاح اسلام کے کیا کیا وسائل و ذرائع زیر بحث آئے ہوں گے۔ فارسی شاعر کی زبان میں :

آنجا کرا دماغ کہ پرسد زباغیاں
بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

یہ تمام امور ہمارے لئے بہر حال پردہ غیب میں ہیں، البتہ ”مدیر فکر و نظر“ کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالہ، جو اسلام کی طرف سے آپ نے اس موقع پر پیش کیا تھا، کے اردو ترجمہ کرنے اور اس کی اشاعت کی زحمت فرمائی، مقالہ کا اردو عنوان ہے۔ ”اسلام پر تجدید پسندی کے اثرات“ یہ مقالہ ایک دو بار نہیں بلکہ کئی بار ہم نے بھی پڑھا۔ اس کے مضمرات پر غور کیا اور ڈاکٹر صاحب کی اسلام پر بحث کو خوب جانچا پرکھا، پہلے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر اسلامی ملک کے مندوب، اسلامی ادارہ کے سربراہ اور اسلام کے وکیل کی

(۱) ڈاکٹر صاحب کے مکتب فکر کے نزدیک اسلام کی تفسیر یہ ہے۔ ”اسلام نام ہے چند مثالی بیارات اور نصب العینوں کا جن کو بدلتے ہوئے معاشرتی مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے“ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶) یہ تفسیر انہوں نے گرو مہون اور بعض دوسرے نامور غیر مسلم محققین سے حاصل کی ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

”و صدیوں کا اسلام“ ”ان کی اصطلاح میں“ ”روایتی اسلام“ یا ”راخ العقیدہ گروہ کا اسلام“ کہلاتا ہے۔ جو ان کے نزدیک مردہ ہے“

حیثیت سے تشریف لے جا رہے ہیں، ان کے نظریات کچھ بھی ہوں لیکن آخر قیامت تو نہیں آگئی وہ اپنی اس پوزیشن کا لحاظ کرتے ہوئے ”مذاہب عالم کانفرنس“ میں اسلام کی کچھ تو لاج رکھیں گے، مگر ”عالم اسلام“ کی امیدوں کے برعکس آپ نے سب کے سامنے اسلام کی وہ پٹائی کی اور جارحیت کا ایسا شدید مظاہرہ کیا کہ ہمیں اپنی خوش فہمی پر ماتم کئے بغیر اور مدیر فکر و نظر کو حکومت اور ادارہ تحقیقات دونوں کی طرف سے ”ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں“ کا اعلان کئے بغیر نہ بن پڑی، وہ فرماتے ہیں :

”یہ مقالہ اسی مذاکرہ میں پڑھا گیا، جن خیالات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے وہ فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ ہیں، حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔“

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۹)

ہم تمام عالم اسلام بالخصوص مسلمانان پاکستان کی طرف سے ”فکر و نظر“ کے مدیر محترم کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سو فیصد قسم کے مقالہ کی ذمہ داری سے انکار کر دیا، ان کا یہ اقدام مستحق صدمہ مبارکباد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مکروہ پروپیگنڈہ کی ذمہ داری نہ کوئی اسلامی حکومت اٹھا سکتی ہے اور نہ کوئی سنجیدہ ادارہ اس بارگراں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہ اعلان نہ کرتے تو ملک اور بیرون ملک کے زخمی دل مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوتی۔

البتہ یہ معما ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ شاید فکر و نظر کے مدیر محترم اسے حل کر سکیں کہ ایک شخص کسی حکومت یا ادارہ کا نمائندہ اور سفیر بن کر جائے لیکن جب وہ فرائض سفارت دے چکے تو حکومت اور ادارہ اپنے نمائندہ کی ذمہ داری سے انکار

کر دے، ادارتی اور سفارتی تاریخ میں اس کی کتنی مثالیں ملیں گی۔؟ یہ تو دیکھنا تھا کہ اگر کسی نمائندہ نے حکومت یا ادارے کی پالیسی کا احترام کئے بغیر کوئی بیان جاری کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ معزول کر دیا جاتا ہے بلکہ اس کے خلاف مناسب کارروائی بھی عمل میں لائی جاتی ہے مگر ہماری ناقص معلومات میں یہ کبھی نہیں آیا کہ سفیر، عمدہ سفارت پر، نمائندہ، منصب نمائندگی پر اور صدر، کرسی صدارت پر بدستور فائز رہتے ہوئے اپنی حکومت اور ادارہ کی پالیسی سے لاتعلقی بیان دیتا رہے۔ اس کے باوجود نہ اسے کسی قسم کی سرزنش کی جائے، نہ اس کی معزولی عمل میں آئے، نہ اسے کسی درجہ میں قابل مذمت تصور کیا جائے، بلکہ اس تمام قصہ کو ”فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ“ کہہ کر گول کر دیا جائے۔

اور اس معما میں ناقابل فہم پیچیدگی اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب کہ ہم فکر و نظر کے فاضل مقالہ نگار کے مقالہ میں صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی صاف صاف نمائندگی ان الفاظ میں پڑھتے ہیں :

”صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ“

ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات اور جدید

ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا ہے“

۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی۔“

(صفحہ ۲۶)

”ادارہ تحقیقات اسلامی کے مطالعہ نے بتلایا۔ الخ“ ”ادارہ

تحقیقات کا استدلال صفحہ ۲۷“

”فاضل مقالہ نگار“ کے یہ بیانات کسی وکیل، بیرسٹر اور جج کے سامنے رکھئے

کیا وہ یہ فیصلہ دے گا کہ مقالہ نگار صرف اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے؟ ڈاکٹر

صاحب کے یہ الفاظ پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنی زبان سے نہیں، بلکہ صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی زبان سے بول رہے ہیں :

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات ان کی
ان ہی کی محفل سجا رہا ہوں چراغ اپنا ہے رات ان کی

پھر اس معما کی الجھن میں مزید بر مزید اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ”مقالہ“ جو ایک خاص ماحول میں پڑھا گیا تھا، بجائے اس کے کہ اسے دفن کر دیا جاتا، مگر ہوا یہ کہ ایک طرف ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ اس مقالہ کے اردو، عربی، بنگلہ تراجم اپنے مجلات میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پورے پاکستان بلکہ کل عالم اسلام اور دیگر ممالک میں اس شر کو پھیلاتا ہے۔ اور دوسری طرف بڑی معصومیت اور ابلہ فریبی سے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی شائع کرتا ہے :

”یہ مقالہ نگار کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے حکومت پاکستان یا

ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

اگر واقعی ادارہ تحقیقات کو اس سے کوئی تعلق نہیں، تو مختلف زبانوں میں بڑی

آب و تاب کے ساتھ اس کی اشاعت کے کیا معنی؟

ہمیں ادارہ تحقیقات کی اس پالیسی اور طرز عمل سے اندیشہ ہے کہ جس طرح

آج ”مدیر فکر و نظر“ نے اپنے صدر محترم کے متعلق اعلان کر دیا، اسی طرح کل ان

کے اسی اعلان کے بارے میں ادارہ کے کوئی دوسرے مدیر صاحب یہ اعلان نہ کر دیں

کہ :

”ڈاکٹر صاحب کے مقالہ سے متعلق ”مدیر فکر و نظر“ نے جو اعلان لا تعلقی فرمایا

ہے ”فاضل مدیر فکر و نظر“ کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حکومت پاکستان یا ادارہ

”الفاظ اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

ایا یہاں ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فکر و نظر کے فاضل مدیر سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ : آپ اپنے ادارہ کی پالیسی کا اعلان بصد شوق کریں، لیکن حکومت پاکستان کی پالیسی کے اعلان کا منصب انہیں کب سے تفویض ہوا۔؟ یہ سوال اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ اگر ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کے صدر محترم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن کا مقالہ ”غیر ذمہ دارانہ“ ہو سکتا ہے تو ان کے نائب مدیر فکر و نظر کے اعلان پر کون اعتماد کرے گا۔؟ اگر واقعہً حکومت پاکستان کی پالیسی سے ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کا کوئی تعلق نہیں تھا، تو حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات و نشریات یا کسی اور متعلقہ محکمہ کی جانب سے کیوں اس سے بیزاری کا اعلان نہ کیا گیا؟ یا حکومت کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اس قدر غیر اہم اور لایعنی ہے کہ وہ اس کے بارے میں کسی وضاحتی بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔؟

بہر حال ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ خود ایک معما ہے اس پر مدیر فکر و نظر کا اعلان ”الفاظی“ ”معمادور معما“ ہے۔ باایں ہمہ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ اس ”غیر ذمہ دارانہ“ مقالہ ”سے لاتعلقی کا“ ”غیر ذمہ دارانہ اعلان“ تو کر ہی دیا :

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

مقالہ سے متعلق ان ابتدائی امور کے بعد اب اس کے مشمولات پر نظر ڈالئے
موصوف اپنی بحث کے حدود متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”یہاں مجھے جس مسئلے سے بحث کرنا ہے وہ کافی حد تک

محدود اور بسیط ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلامی دنیا اور دوسری

وسیع تر دنیا دونوں کے لئے بہت زیادہ فوری اہمیت رکھتا ہے میرا

ارادہ، تجدید یعنی جدید زمانے کے مطابق اپنے آپ کو کرنے، یا زیادہ

واضح الفاظ میں جدت پسندی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اور اسلامی دنیا پر جدید طرز زندگی کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے اس کا ایک مجموعی جائزہ لینا ہے۔ اس سے خود اسلامی دنیا اور دوسری وسیع تر دنیا کے لئے مستقبل قریب میں مسلم معاشرے میں مناسب حد تک متوقع تبدیلیوں کی نوعیت اور وسعت واضح کرنے میں مدد ملے گی۔“

(صفحہ ۱۰)

آپ اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ موصوف تجدید، تجدید، اپنے کو جدید زمانے کے مطابق ڈھالنے یا واضح الفاظ میں جدت پسندی کے عوامل، اثرات اور تدابیر پر بحث کریں گے، یعنی اسلام کو ”نئی دنیا“ کے مطابق کتنا بدلا جا چکا ہے، کتنا بدلا جاسکتا ہے، کس طرح بدلا جاسکتا ہے اور یہ بدلنا کیوں ضروری ہے؟ اس اقتباس میں موصوف نے دو جگہ اسلامی دنیا کے ساتھ ”دوسری وسیع تر دنیا“ کے لئے اس مسئلہ کی ”بہت زیادہ فوری اہمیت“ کا جو ذکر فرمایا ہے اسے کسی طرح نظر انداز نہ کیا جائے، موصوف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تبدیلی میں اسلامی دنیا کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن ”دوسری وسیع تر دنیا“ بالخصوص مسیحیت، یہودیت اور چینی اور روسی کمیونزم کے عالمین بڑی بے چینی سے منتظر ہیں کہ مسلمان اپنے اسلام اور اسلامی ورثہ کو خیرباد کہہ کر لادینیت، سیکولرزم یا مذہب کی بگڑی ہوئی صورت کو اپنا کر کب ہماری سطح پر آجاتے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ اپنی اصلی شکل میں صحیح مذہب اگر کوئی موجود ہے تو وہ اسلام ہے۔

اس حرف آغاز کے بعد موصوف اصلاحی تحریکوں کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں وہابی تحریک اور سنوسی تحریک اور ان جیسی دوسری تحریکوں کا ذکر کرتے

ہوئے فرماتے ہیں:

”لیکن انہیں کسی طرح بھی جدت پسند اصلاحی تحریکیں نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ صاف طور پر ان کی سرگرمیوں کی حدود تمام کی تمام مسلمانوں کے ماضی کے چوکھٹے میں منحصر ہیں۔“

(صفحہ ۱۰)

یعنی جدت پسندی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسلام کے ماضی سے وہ اپنا رشتہ بالکل پیہ کاٹ لے اور یہ تحریکیں اس شرط سے محروم تھیں۔ اس کے بعد جدت پسندی کے اصل نقطہ آغاز کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”دنیاۓ اسلام میں تجدد کے عمل دخل کی ابتداء اس وقت ہوئی جب کہ مغربی طاقتوں کی مسلمان ممالک کے ساتھ فوجی اور سیاسی مڈ بھینٹ ہوئی۔“

(صفحہ ۱۱)

اس ذیل میں وہ شیخ محمد عبدہ مصری اور سرسید احمد خان کی سائنسی تحریک کا ذکر کرتے ہیں اور ان دونوں میں مشابہت اور مفارقت کی صورتیں ذکر کرنے کے بعد ان دونوں تحریکوں کے تباہ کن حشر کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد وہ جدت پسندی کے ایک اور مرحلہ کی نشاندہی کرتے ہیں جسے ان کی اصطلاح میں علامہ محمد اقبال کا مرحلہ کہا جاسکتا ہے اس کے بارے میں موصوف کا خیال ہے کہ:

”اس مرحلے میں مسلمانوں کا معذرت خواہانہ انداز مغرب کے خلاف ایک جارحانہ انداز کی شکل اختیار کرتا ہے اور ان کی مدافعت، جارحیت میں بدل جاتی ہے، مغرب کے خلاف اس طرز فکر نے جو کہ صریحاً دو رخا پن کا حامل ہے، قدامت پسندوں اور جدت پسندوں کی صفوں کو باہم ایک دوسرے کے بہت قریب کر

دیا، اتنا قریب کہ بعض دفعہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔“
(صفحہ ۱۴)

موصوف کے نزدیک جدت پسندی کی یہ تحریک بھی قدامت پسندوں کی نظر میں ناکام ہو کر رہ گئی، ان تمام تحریکات کی ناکامی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس سلسلہ میں موصوف نے بڑی جرأت مندانہ بات کہی ہے، ان کا یہ ”تجرباتی نظریہ“ ان کی ”اسلامی ذہنیت“ کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :

”یہ سوال کہ خالص دنیوی اقلیت اور سائنسی ذہنیت کتنی دور تک اور کتنی گہری ہو سکتی ہے، اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال اس سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں، کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے، تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک مذہب کو زندگی پر قطعی طور سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے، جب تک زندگی پر مذہب اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے تو ایک طرف خالص دنیوی عقلیت اور سائنسی ذہنیت اور دوسری طرف روایتی مذہبی تصورات و اعمال دونوں کو ایک دوسرے سے خواہ کتنی بھی سختی سے الگ الگ رکھا جائے، مذہب دنیوی افکار کو بھی داخل ہونے سے بڑے موثر طریقے سے روکے گا۔ یہ بات اگرچہ بظاہر متناقض نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہی ہے۔“
(صفحہ ۱۵)

خلاصہ یہ کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی جڑ ”مذہب اسلام“ ہے اس لئے مسلمان اگر اس بیماری سے شفا یاب ہو کر ترقی کرنا چاہتے ہیں

تو راستے کے اس پتھر کو ہٹائیں، مذہب اسلام کو زندگی سے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے پر مجبور کریں، بس مسلمان جس قدر مذہب سے دور اور لامذہبیت کے قریب ہوتے چلے جائیں گے، اسی قدر ان کے سامنے زندگی کی ترقی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جائیں گی، اور ان کو ترقیاتی عروج پورا پورا اس دن نصیب ہوگا جس دن وہ مذہب اسلام کو بالکل خیر باد کہہ دیں گے۔ اس کے بعد موصوف اپنے مقالہ میں اسلام کی جگہ لامذہبیت کو اپنانے کی دعوت برابر دیتے چلے گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ علماء اسلام کی طرف سے اسلامی عقائد اور احکام کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”علماء اسلام کا یہی وہ نقطہ نظر ہے جو اسلامی دنیا میں

سیکولرزم، لامذہبیت کے پھیلنے کا براہ راست ذمہ دار ہے“

(صفحہ ۱۶)

پھر اس کی مثال کے لئے ”شرح زکوٰۃ کو ملحدانہ منطق کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں :

”واقعہ یہ ہے کہ جدید زندگی اور روایتی اسلام“ (جو

آنحضرت ﷺ سے اب تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔ ناقل)

کے درمیان ٹکراؤ کے اس تمام عرصہ میں علماء کی اکثریت کی

طرف سے جس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا رہا ہے، وہ حقیقت میں

سیکولرزم کا براہ راست مدد و معاون ہے۔“ (صفحہ ۱۷)

ایک جگہ پاکستان میں اسلام کی ضرورت سیکولرزم کے فعال اور موثر قوت بننے تک کو بڑی صراحت سے ذکر کرتے ہیں :

”مزید برآں پاکستان کے دو حصے ہیں، جو جغرافیائی لحاظ سے

ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں اور یہ صورت حال ہندوستان تک کو درپیش نہیں اب جب تک کہ سیکولرزم کو مثبت ترقی کے لئے ایک فعال اور موثر قوت نہ بنائی جاسکے، ان ملکوں کے لئے یہی ایک صورت ممکن نظر آتی ہے کہ وہ مذہب کو مملکت کی اساس تسلیم کریں۔“ (صفحہ ۲۳)

ایک جگہ اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی مشکلات اور اس کے مقابلہ میں ایک سیکولر مملکت کی آسانیوں کو بڑے لچاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتے ہیں :

”لیکن یہی وہ اصل سوال ہے، یعنی اسلام کی نئی تعبیر کی دریافت، جس کا ذہنی سطح پر حل تلاش کرنے میں سرکاری پالیسی مایوس کن رہی ہے۔ اولاً ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس طرح کے تمام مسائل کے حل، جیسے کہ اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا، اور صنعتی اور ٹیکنیکی تبدیلی سے جو معاشرتی نتائج نکلیں گے، ان کے پیش نظر ترقیاتی پروگرام کیا ہوں، ایک سیکولر مملکت میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں، کیونکہ سیکولرزم تو ہے ہی روایتی رکاوٹوں اور تعصبات سے نجات پانے کے لئے ایک جرات مندانہ قدم، خواہ اس کے لئے کتنی بھی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے، اب چونکہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے اسے ان مسائل کے حل کرنے کے لئے بڑی مشکلات درپیش ہیں۔“

(صفحہ ۲۴)

ایک مقام پر ان نام نہاد مشکلات کے حل کے لئے بزعم خود تعبیر و تاویل کا قابل قبول طریقہ پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں تعدد ازواج کی بحث کو اٹھا کر حسب عادت اس پر طویل تقریر کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک مرد کے لئے ایک بیوی کا ہونا ہی ”مثالی“ حیثیت رکھتا ہے، مگر زمانہ نزول کے معاشرے سے اسے مصالحت کرنا تھی اور اس معاشرے میں تعدد ازواج کی جڑیں گہری تھیں اس لئے اسے قانونی سطح پر تعدد ازواج کو قبول کرنا پڑا:

”تاہم رسول مقبول علیہ السلام کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس مثالی معاشرے کو بتدریج اپنائیں گے۔ بہر حال تاریخی لحاظ سے ہوا برعکس، رسول کریم ﷺ کے انتقال کے بعد بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں، جن کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں آئیں اور یہ چیز اس معاملے میں قرآن کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی۔“ (صفحہ ۲۰)

آنحضرت ﷺ کی طرف جس آرزو کی نسبت کی گئی ہے، اس کا علم موصوف کو کن ذرائع سے ہوا؟ یہ تو انہیں کو معلوم ہوگا، لیکن ان کی عبارت سے اتنی بات بہر حال صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے مثالی معاشرہ کا جو تصور ہے، اسے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سکے نہ خلفاء راشدین، نہ صحابہ، نہ تابعین نہ ائمہ مجتہدین، نہ چودہ سو سالہ امت، بلکہ موصوف کے بقول یہ تمنائے نبوی ﷺ کبھی شرمندہ وقوع نہ ہو سکی البتہ تعبیر و تاویل کے جدید

تیشے سے چاہا جاتا ہے کہ قرآن کو تراش تراش کر یہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا جائے، غالباً پاکستان میں مسلم فیملی لاز کے ذریعہ پہلی دفعہ آپ ﷺ کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے مارشل لاء کی فرصت تلاش کی گئی۔ سبحان اللہ حضور انور ﷺ کی آرزو کا انکشاف ہوا کس کو؟ چودہ سو سال بعد کے ڈاکٹروں کو، جن کے نزدیک اسلام خود ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اسی کے ذیل میں انہوں نے مسئلہ غلامی کا ذکر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

”اور یہی غلامی کے مسئلے میں ہوا، جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اخلاقی محرک عمل میں لایا گیا، کہ اس کی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی ہے، اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجوہ ہیں۔“

(صفحہ ۲۰)

تاریخی وجوہ کچھ بھی ہوں، لیکن مذاہب عالم کا نفرنس کے بھرے مجمع میں تمام دنیا کے نمائندوں کے سامنے یہ اعلان تو کر ہی دیا کہ نہ صرف تعدد ازواج اور مسئلہ غلامی بلکہ پورے اسلام کو سمجھنے، اس کے منشا کو اپنانے، اور اسلام کی روح پر عمل کرنے میں، آنحضرت ﷺ سے لے کر اب تک اسلامی تاریخ کی تمام صدیاں ناکام رہیں۔ صحیح اسلام کا سراغ تحقیقات اسلامی کے ادارہ کو رہا ہے۔ اسی کے متصل آپ نے اسلامی عقائد پر بھی بحث کی ہے، تمہیداً فرماتے ہیں :

”ہم نے اب تک جن مثالوں کا انتخاب کیا وہ قانونی و

اجتماعی معاملات کی ہیں۔ لیکن عقائد کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم

نہیں۔“

(صفحہ ۲۱)

یعنی مسلمانوں کا نہ صرف نظام قانون غلط ہے بلکہ نظام عقائد بھی غلط، اس کے بعد اس غلطی کی حمایت کے لئے آپ ایک عجیب و غریب اصول پیش فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے :

”دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے باوجود ان تمام اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں وہ قرون وسطیٰ کے نقطہ نظر اور روایتی طرز فکر سے مختلف ہے۔ سند کو مان لینا، اور خوش اعتقادی ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، اور یہ سکہ جدید دنیا میں اب چالو نہیں رہا، جب آپ سند کو مانتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً خوش اعتقادی ہوتا ہے۔“

(صفحہ ۲۲)

موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کے تمام اعمال، عبادات اور عقائد کا مدار سند ہے اور سند کو مان لینے سے چونکہ خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے، اس وجہ سے یہ سکہ جدید دنیا میں چالو نہیں رہا، لہذا ثابت ہوا کہ دین اسلام کا کوئی عقیدہ کوئی قانون، اور کوئی عمل ”جدید دنیا“ کی حمایت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ موصوف کو کس ”جدید آدمی“ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کے مذہب میں سند اور خوش اعتقادی کا سکہ پھینک دیئے جانے کا مستحق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سکہ امریکہ، برطانیہ اور روس بلکہ تمام ممالک میں اور تمام حلقوں میں بڑی مقبولیت سے چالو ہے۔ وہ کون سا ملک ہے جہاں بین الاقوامی سفیروں، عدالتی بیانون، ماہرین فن کی شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا، دنیا کا وہ کونسا جدید ملک، معاشرہ اور فرد ہے جس کے نزدیک کسی کا کسی کی بات پر اعتماد کرنا، اسے سند تسلیم کرنا اور خوش اعتقادی اور پسندیدگی کا اظہار کرنا ناقابل معافی جرم ہے؟

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اصول کب سے چل نکلا ہے، کہ جو سکے دنیا میں چالو نہ رہے، خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ اسے باہر پھینک کر ”حماقت آمیز دانشمندی“ کا مظاہرہ کیا جائے، عقل و نقل یہ اصول تو تسلیم کرتی ہے کہ اگر کوئی سکے واقعی بے قیمت، کھوٹا اور ردی ہو، اسے بڑی خوشی سے پھینک دیجئے، جس کم جہاں پاک لیکن جس سکے کو چودہ سو سال سے دنیا کی ہر سنجیدہ قوم جانچ پرکھ کر اس کے قیمتی جوہر ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اسے محض اس وجہ سے پھینک دینا کہ چند احمق اسے کھوٹا بتلانے لگے ہیں، کیا یہ عقل و خرد کا دیوالیہ نکال دینے کے مترادف نہیں۔؟ پھر جس جدید دنیا کا ذکر خیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کیا اس میں قرآن و حدیث، نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم، حشر و نشر، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا سکے چالو ہے۔؟ اگر نہیں تو پھر جدید دنیا کی خاطر یہ تمام سکے بھی پھینک دیجئے۔ (اور موصوف ان سب کو پھینک چکے ہیں) ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے اس فقرہ میں جو خیال آرائی کی ہے اگر ہمیں ان کا اور پرنسٹن یونیورسٹی کے سنجیدہ مذاکرہ کا احترام ملحوظ نہ ہوتا، تو ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ”دیوانے کی بڑ“ اور ”بازاری گپ شپ“ سے زائد نہیں تھی، دیوانہ گفت و ابلہ باور کرد۔

ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں کیا وہ اتنا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عمومی محور وہی چیزیں رہی ہیں جن کا سکے قوموں کی حماقت، بگڑی ہوئی ذہنیت اور مسخ شدہ عقل کی وجہ سے دنیا میں چالو نہیں تھا، اب اگر ان کا یہ اصول صحیح ہو کہ جدید دنیا میں جس سکے کی چلت نہ ہو اسے رد کرنا ہی صحیح عقلیت ہے تو انبیاء علیہم السلام کی جانب سے پیش کردہ توحید، رسالت، تصور قیامت، بعث بعد الموت، حشر و نشر وغیرہ مسائل جو اس وقت کے چلتے سکوں کے

علی الرغم پیش کئے گئے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ادارہ تحقیقات سے کیا فتویٰ صادر ہوگا؟ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا سکہ فرعونی ماحول میں، ابراہیم علیہ السلام کے نظریات کا سکہ نمرودی ماحول میں، اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کا سکہ مکی اور عربی ماحول میں کب چالو تھا؟

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے تحقیقاتی ادارہ میں ”سوچ و بچار“ کا سکہ چالو نہیں، اس لئے وہ کسی بات کے کہہ ڈالنے سے پہلے اتنا سوچ لینے کے قائل نہیں، کہ ان کے اس نظریہ کی زد میں کون کون آجائے گا۔

چالو سکے کی بحث چل نکلی تو دل چاہتا ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک گزارش مزید کر دی جائے، وہ یہ کہ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ جدید دنیا کی بگڑی ہوئی اور خدا سے باغی انسانیت کے ماحول میں انبیاء علیہم السلام کے ماثر کی ”سند“ اور ان سے ”خوش اعتقادی“ کا سکہ نہیں چلتا، لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لئے ”پرنسٹن یونیورسٹی“ میں مقالہ خوانی نہیں کرتے رہیں گے، سنت بنی آدم ان پر بھی آخر کار جاری ہو کر رہے گی، اور موت کا آہنی چنگل انہیں بھی ایک نہ ایک دن دبوچ کر رہے گا، وہ ہمیں بتلائیں کہ بازار آخرت میں کونسا سکہ چلے گا۔ کیا پرنسٹن یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے ”ابن سینا اور راسخ العقیدہ اسلام“ اور اسلام پر تجد و پسندی کے اثرات ”قسم کے مقالے؟

”اس خیال است و محال است و جنوں۔“

انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں اسی ”روایتی اسلام“ کا سکہ چلے گا۔ جس کے ایک ایک حرف کا مذاق اڑانا ہی ان کے نزدیک تقاضائے ”جدید عقلیت“ ہے۔ اگر ہماری یہ گزارش ان کے نزدیک ”سندی خوش اعتقادی“ میں داخل ہو تو قرآن مجید پڑھ کر دیکھیں اس کا اعلان آج بھی وہی ہے جو کل تھا :

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى و
يتبع غير سبيل المومنين نوله ما تولى و نصله
جهنم و ساءت مصيراً۔
(النساء رکوع ۱۷)

ترجمہ: ”اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس
پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستے کے خلاف تو ہم
حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے
ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا۔“

(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

ڈاکٹر صاحب اس آیت کے آئینے میں اپنے اس نظریہ کی اور اس مقالہ کے
دوسرے نظریات کی اور دیگر تمام مقالات کی اصل صورت دیکھ لیں۔ الغرض ڈاکٹر
صاحب کا یہ اصول ایک عجوبہ ہے، اب ذرا سنیں کہ اس ”عجوبہ“ کی زد میں وہ دین
اسلام کی کن کن چیزوں کو لے آتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

”اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے ہر قسم کے جادو،
ٹوٹکے پر یقین کرنے، کرامات پر زور دینے، اور بھونڈی شکل میں
روحانی شعبہ بازی کی۔ رسول اللہ ﷺ کے معراج کو عام
طور پر جس طرح پیش کیا جاتا ہے، وہ اس طرح کے توہمات پرستی کی
جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا ایک مثال ہے۔“

(صفحہ ۲۱)

صرف وہ کرامات جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، ان ہی کی اگر فہرست

مرتب کر لی جائے تو ایک اچھا ضخیم مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔ اور معراج نبوی ﷺ کا ذکر قرآن مجید، احادیث متواتر جن کے راوی تیس کے قریب صحابہ ہیں، کے علاوہ تاریخ و سیرت کی ہر بڑی چھوٹی کتاب میں اجمالاً یا تفصیلاً موجود ہے اور چودہ سو سالہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے اور ضروریات دین میں داخل ہے مگر ڈاکٹر صاحب کی توہمات پرستی کی داد دیجئے کہ آپ نے کرامت، معجزہ اور معراج نبوی ﷺ کے ڈانڈے، جادو، ٹوٹکے اور بھونڈی شعبہ بازی سے جاملائے۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ اتباعی عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا، اور حدیث، سیرت اور تاریخ کے تمام مآخذ کے علاوہ قرآن مجید میں بھی کیسے درج ہو لیا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ :

”معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب مسلمان جزیرہ عرب سے باہر

نکلے اور خاص طور سے عراق میں ان کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا، تو

انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ حضرت مسیح

علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان پر اٹھائے گئے

تھے معراج کو جسمانی شکل میں پیش کرنا پڑا“

(صفحہ ۲۱)

چونکہ موصوف کی ”جدید دنیا“ میں کسی دعویٰ کی دلیل اور سند پیش کرنا خوش اعتقادی کا دوسرا رخ ہے، اس لئے اگر آپ یہ سوال اٹھائیں گے کہ موصوف کو ”معلوم یہ ہوتا ہے“ کا انکشاف کن ذرائع سے ہوا؟ اور اس کی سند اور دلیل کیا ہے؟ تو آپ پھر سے ”سندی خوش اعتقادی“ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ آپ اسلامی عقائد کے بارے میں موصوف کے تمام انکشافات بلا چون و چرا تسلیم کرتے جائیں۔ ”سندی خوش اعتقادی“ کے عفریت سے نجات کی بس یہی ایک صورت ہے البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ قرآن مجید سے آپ اسراء اور معراج

نبوی ﷺ کا ذکر لے بیٹھیں گے، لیکن اس سلسلہ میں معراج کا صحیح مفہوم جو موصوف نے ازراہ عنایت بیان فرمادیا ہے اسے سن کر اطمینان کر لیجئے، فرماتے ہیں :

”قرآن مجید نے کئی جگہ رسول کریم ﷺ کے بعض آفاق گیر روحانی مشاہدات کا ذکر کیا ہے جن میں آپ کی الوہی شخصیت طبعی حدود سے بلند و بالا تر ہو کر حقیقت اولیٰ کے محیط کل سے جا ملتی ہے۔“
(صفحہ ۲۱)

اس تفسیر میں آپ کو ”آفاق گیر روحانی مشاہدات“ آپ ﷺ کی الوہی شخصیت ”طبعی حدود سے اس کی بلندی و برتری“ ”حقیقت اولیٰ“ اور ”محیط کل“ جیسے مبہم، مجہول، اجنبی بلکہ بعض لایعنی الفاظ اور مفہوم ضرور ملیں گے، لیکن معراج جسمانی جیسے بالکل واضح، آسان اور عام فہم مسئلہ کی توہمات پرستی سے نجات پانے کے لئے ضروری ہے، کہ آپ موصوف کے اسی لایعنی قسم کے لفظی گورکھ دھندے پر ایمان لے آئیں، ورنہ صدر ادارہ تحقیقات کی جانب سے خوش اعتقادی کا فتویٰ موجود ہے، کیونکہ یہ ”جدید دنیا“ ہے یہاں قرون وسطیٰ کے سکے اور اصول بدل چکے ہیں :

بریں عقل و دانش نباید گریست

موصوف نے توہمات پرستی کی جو مشین گن نصب کی ہے، اس کا سارا مسالا ختم نہیں ہوا، ابھی اس کی گولہ باری باقی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

”اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے جو شکل اختیار کی ہے وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا۔“
(صفحہ ۲۱)

بطور خلاصہ آخری بات یہ کہ :

”غرض قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے بالکل برخلاف
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد معجزات منسوب
 کر کے آپ ﷺ میں ایک حد تک شان ایزدی پیدا کرنے کی
 کامیاب کوشش کی گئی۔“
 (صفحہ ۲۱)

”گویا صرف معراج، کرامت، شفاعت اور معجزات ہی نہیں، یہ تو صرف ”ایک
 مثال“ کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں ورنہ اس اصول کی روشنی میں ان امور کے علاوہ
 اسلام کے جس جس عقیدہ، عمل، یا مسئلہ کے لئے بھی کسی کا دل چاہے تو ”خوش
 اعتقادی“ اور ”توہمت پرستی“ کا ہلکا سا فقرہ چست کیا جاسکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ
 یہ رابعہ معجزات نبی ﷺ کو خدا بنانے کا یہ ”کامیاب عمل“ کس کی ستم ظریفی
 ہے؟ تمام دنیا کے نمائندوں کی بھری محفل میں اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کی زبان سے
 سنئے :

”نبی علیہ السلام کو ایک ”اساطیری رنگ“ میں پیش کرنے کا
 یہ عمل جس کا مصدر و منبع ایک سے زیادہ عناصر تھے ”راخ العقیدہ
 گروہ“ بھی برابر اس میں شریک رہا اور اسے اس نے قبول کیا۔“
 (صفحہ ۲۱)

”راخ العقیدہ گروہ“ یعنی صحابہؓ و تابعینؓ سے لے کر آج تک کے تمام علماء صلیحاً
 ”خدا سازی“ کے اسی شغل میں لگے رہے، پوری امت پر ”اساطیری رنگ آمیزی“
 اور ”خدا سازی“ کا الزام اس عجوبہ زمان کی طرف سے لگایا جا رہا ہے، جو اسی مجلس
 میں اور اسی مقالہ میں چند سطر پہلے سند کو خوش اعتقادی قرار دے کر اساطیری (بے
 سند) افسانہ طرازی کرتا ہے اور آپ کی الوہی شخصیت کے بے سرو پا دعوے ہانکتا

ہے۔ : چہ دلاور است دزدے کہ بکفت چراغ دارد :

پھر ”کثیر التعداد معجزات“ اور ”شان ایزدی“ پیدا کرنے کی تک بھی عجیب ہے، کیا قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے کثیر التعداد معجزات کا کہیں ذکر نہیں ہے؟ کیا قرآن عزیز بھی ان کے بقول ”اساطیری رنگ میں خدا سازی کی کامیاب کوشش کرتا رہا“ خدا جانے ان کو کس نے بتلادیا، کہ اگر نبی کے لئے معجزہ کو تسلیم کر لیا جائے تو نبی خدا بن جاتا ہے، کیا ان کو معجزہ کی اتنی حقیقت بھی معلوم نہیں کہ، ”معجزہ صرف خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے نبی کے فعل کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ البتہ عالم اسباب سے بالا تر کسی چیز کا اس کے ہاتھ پر ظاہر ہونا اس کے دعوائے نبوت اور مامور من اللہ ہونے کی حقانیت کی دلیل ہوتا ہے۔“

موصوف نے اسلامی تاریخ کی تیرہ چودہ صدیوں کے تمام علماء کی جس طرح تجہیل و تمہیق اس ”مذہب عالم کانفرنس“ میں کی اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں :

”گزشتہ تیرہ صدیوں کے دوران فقہائے اسلام اپنی بحث و نظر میں جن تحقیقاتی نتائج پر پہنچے ہیں، اگرچہ انکا پوری سنجیدگی و توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے اور ان کو قرار واقعی اہمیت دینی چاہئے لیکن اس کے باوجود یہ دیکھنے میں آئے گا کہ اکثر معاملات میں ان کے تحقیقاتی نتائج یا تو صحیح نہ تھے، یا وہ اس معاشرے کے لئے موزوں تھے جس میں وہ رہتے تھے نہ کہ آج کے معاشرے کے لئے۔“

(صفحہ ۲۷)

تیرہ صدیوں کے فقہاء اور ائمہ اجتہاد کے تحقیقاتی نتائج کا پوری سنجیدگی اور توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی قرار واقعی اہمیت اہل نظر کے نزدیک کیا ہوگی؟ یہ بحث اپنی جگہ رہی البتہ موصوف کے نزدیک ان کی قرار واقعی اہمیت یہی ہے کہ :

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

(معاذ اللہ)

یعنی ان کے عقائد غلط، ان کی تحقیقات محض رنگ آمیزی، ان کا شعور و فہم قرآن و سنت کے صحیح مطالعہ سے محروم، ان کی تفسیری حدیثی اور فقہی تشریحات ناقابل قبول، ہاں قرآن و سنت اور اسلام کا صحیح فہم میک گل یونیورسٹی کے طالب علم اور یہودی پروفیسر اسمتھ کے شاگرد عزیز اور نور نظر اور ان کے ادارے کو نصیب ہوا، ان کے بقول یہی اصل وجہ ہے کہ اس گروہ کو ادارہ تحقیقات کی صورت میں منظم کر کے اسلام کی نوک پلک سنوارنے اور اسے جدید زمانہ مذہبی یعنی مذاہب عالم اور دیگر نظریہ ہائے حیات سے ہم آہنگ کرنے کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے، چنانچہ اس کی تفصیلی روئداد بھی موصوف نے مذاہب عالم کے نمائندوں کے سامنے رکھی، فرماتے ہیں :

”صدر محمد ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ“

ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات اور جدید

ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا“

۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی۔“

(صفحہ ۲۶)

اسی کے ساتھ موصوف نے ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے قیام اس کے اغراض و مقاصد، ان دونوں اداروں کے تعلق کی نوعیت کا ذکر کیا، اور ان کے الفاظ میں پہلی آزمائش یعنی مسئلہ سود کے بارے میں ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے پھس پھے رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس موقع پر ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کی جرأتِ زندانہ کا قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ ذرا الفاظ کی صولت اور شوکت ملاحظہ فرمائیے، ایسا لگتا ہے

کہ آپ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اتھارٹی کی پوزیشن میں مصروف گویائی ہیں :

”ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحقیقی مطالعہ“ نے بتلایا کہ

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عرب میں ربا کا جو واقعہ نظام مروج تھا وہ انتہائی بھونڈے قسم کے معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا تھا اس لئے قرآن مجید نے بار بار کی تہیہات کے بعد اسے ممنوع قرار دیدیا اور یہ کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان فقہانے غیر ضروری طور پر اس ممانعت کا دائرہ ان تمام مالی معاملات پر کر دیا جن میں کہ اصل رقم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو، چنانچہ اس ضمن میں ادارہ تحقیقات کا استدلال یہ تھا کہ اسلام کو آج بروئے کار لانے کے لئے سب سے پہلے تو یہ لازمی ہے کہ قرآن مجید کے احکامات کا تاریخی پس منظر سمجھا جائے تاکہ اخلاقی، روحانی اور معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں قرآن مجید کس قسم کی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے، ان کا تعین کیا جائے، نیز آج کے سیاق و سباق میں قرآن کی عملی تطبیق لفظاً نہیں کی جاسکتی۔“ (صفحہ ۲۷)

حکومت کے قائم کردہ اس آئینی ادارہ کا یہ نقطہ فکر اور طرز تعبیر یعنی تیرہ صدیوں کی تحقیقات کو غلط قرار دینا، اور قرآن کی لفظی تعمیل کو حماقت بتلا کر اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح یا بلفظ صحیح تحریف و تبدیل کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں :

”یہ طریقہ سب طریقوں سے جنہیں عام طور پر اب تک

اختیار کیا گیا ہے، اس قدر انقلابی اور بنیادی لحاظ سے مختلف ہے کہ

یہ نہ صرف فقہ اور سنت نبوی ﷺ کو بلکہ قرآن مجید کے احکامات تک کو بھی تاریخی مطالعہ کا موضوع بتاتا ہے، اسے نہ محض ”روایت پرست علماء“ بلکہ بہت سے تجدد پسند بھی قبول کرنے سے سنجیدگی کے ساتھ تامل ہی کریں گے۔“ (صفحہ ۲۸)

مطلب یہ کہ تجدد پسندی کے جتنے طریقوں کا اب تک تجربہ کیا گیا ہے وہ سب ہیروئی تھے، ان میں اسلام کی بعض چیزوں کو بہر حال تسلیم کر لیا جاتا تھا لیکن ادارہ تحقیقات اسلامی کے ”ذہین کارندوں“ نے جو طریقہ در آمد کیا ہے، اس میں فرضی تاریخ کے خیالی افسانوں سے قرآن کے احکام یا بلفظ صحیح خود قرآن کو بھی بدلا جاسکتا ہے، اس لئے اس کے قبول کرنے کی جسارت لوگوں کو مشکل ہی ہو سکتی ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

اس سلسلہ میں موصوف نے اس طریقہ تحریف کے قبولیتی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے :

”اگر ایسا نہ ہوا تو راقم السطور اسلام کا اس کے سوا اور کوئی مستقبل نہیں دیکھتا کہ وہ کچھ عرصے بعد محض چند مذہبی رسوم بن کر رہ جائے گا جن سے کہ کچھ آنے والے وقت تک لوگوں کی جذباتی وابستگی قائم رہے۔“ (صفحہ ۲۸)

موصوف خواہ مخواہ پریشان ہیں، ان سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ صرف حکومت پاکستان کی مدد سے نہیں بلکہ اگر ان سے ہو سکے تو امریکہ اور روس اور ”وسیع تر جہید“ دنیا جس کے غم میں وہ پکھل پکھل کر کاٹا ہو رہے ہیں، کی مدد سے بھی اسلام کو بدلیں اس کے لئے جس قسم کے نظریات چاہیں اختراع کریں۔ اور جتنے بندوں کو

برکایا جاسکتا ہے برکائیں :

واستفزز من استعظت منهم بصوتک واجلب
علیہم بخیلک ورجلک و شارکھم فی الاموال
والاولاد وعدھم وما یعدھم الشیطان الا
غرورا۔

(بنی اسرائیل ۶۴)

الغرض آپ سے جو ہو سکتا ہے کر لیں، لیکن یاد رہے کہ اللہ دین کا حافظ ہے
دین محمد ﷺ کا ہی چلے گا، اور تعبیر و تشریح امام ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ
علیہ وغیرہم ہی کی چلے گی، اور آپ کے رفقا آسمان سے سورج اور چاند بھی لا کر رکھ
دیں، تب بھی مسلمان آپ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی جگہ شارع تسلیم نہ کریں
گے، نہ ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ ماننے کے لئے تیار ہوں
گے۔

یہ اس مقالہ کے چند اقتباسات تھے، موصوف نے اسلامی حکومتوں، بالخصوص
حکومت پاکستان کے دو رخا پن اور منافقت اور متجددین کی بھیڑ میں ذہنی بصیرت کے
فقدان اور ان کی مسلسل ناکامیوں کا ذکر بھی بڑی دلسوزی سے کیا ہے، مگر ہم بغرض
اختصار انہیں قلم انداز کرتے ہیں۔ البتہ ہمارا خیال ہے کہ موصوف نے اس طویل
مقالہ کی نوشت و خواند پر اپنا اور معزز شرکائے کانفرنس کا قیمتی وقت ناحق ضائع کیا،
کیونکہ اگر وہ چاہتے تو وہ اس تمام مقالہ کا خلاصہ پیش کر سکتے تھے، مثلاً وہ اتنا لکھ
دیتے۔

”جناب صدر محترم! و معزز حاضرین کانفرنس! آپ حضرات یہاں اپنے اپنے
مذہب پر مقالات پڑھیں گے، لیکن فقیر بد قسمتی سے جس مذہب کا وکیل بن کر حاضر

اس کا ماضی سیاہ، حال پریشان اور مستقبل خطرناک حد تک تاریک ہے، ماضی کا حال کہ تمام اسلامی عقائد مثلاً معجزہ، کرامت، شفاعت، معراج وغیرہ شروع ہی سے قائم پرستی کا پلندہ رہے ہیں، اور اسلامی قانون اور معاشرت کا یہ حال ہے کہ تعدد الادیان، مسئلہ غلامی، جزیہ اور اقلیتوں کے حقوق جیسے موٹے موٹے مسائل میں بھی امارے تیرہ صدیوں کے علما قرآنی روح سمجھنے، اسے اپنانے اور اسے رنگ آمیزی سے بہا کر کہنے سے محروم رہے، اب ان کی کس بات پر اعتماد کر لیا جائے۔ اور اسلام کا حال یہ ہے کہ موجودہ دور کی تمام مسلم حکومتیں دو رخنے پن اور منافقت کی شکار ہیں، تجدد پسند بصیرت کے فقدان میں مبتلا ہیں اور قدامت پسند اپنے طرز عمل سے سیکولرزم کے داعی ہیں، اس پریشان کن صورت حال سے گھبرا کر ہمارے صدر محترم نے اسلام کو تعبیر و تاویل اور تحریف و ترمیم کے ذریعے زمانہ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ادارہ تحقیقات اسلامی کی تنظیم میں فقیر اور فقیر کے ہم مسلک رفقا کو مامور فرمایا ہے۔ ہم نے اس ”انقلابی تعبیر“ کا ذریعہ بھی تلاش کر لیا ہے۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ قدیم و جدید دونوں حلقوں کی جانب سے اس کی مخالفت کی جائے گی، اس لئے، شرکائے کانفرنس! خدا را دنیا جہان کے مسلمانوں سے اپیل کرو کہ وہ ہماری ان ”بری بھلی تحقیقوں“ کا اثر قبول کر لیں ورنہ اسلام کا مستقبل خطرہ میں ہے۔“

بتلائیے! کیا اس خلاصہ میں تمام مقالہ نہیں آگیا۔؟ مدیر فکر و نظر راوی ہیں، دروغ برگردن راوی کہ اس مذاکرہ میں ایک مقالہ چینی مذاہب پر پڑھا گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن اس مقالہ پر تبصرہ کرنے والوں کے بورڈ کے ایک رکن تھے، چینی مذاہب کے مضمین میں چین کے موجودہ کمیونزم کا بھی ذکر آیا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمن نے چینی کمیونزم کے بارے میں کہا کہ آج یہ تمام مذاہب کے لئے سب سے بڑا اور گہرا چیلنج ہے، ”مدیر فکر و نظر“ بے چارے سیدھے آدمی ہیں، ڈرتے ڈرتے چبا چبا

کربات کرتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے جس قسم کی عقیدت اور وابستگی ہے، جس کا اظہار اسی مقالہ کے مندرجات سے بخوبی ہو جاتا ہے، اسے سامنے رکھتے تو اسلام کے مقابلہ میں ڈاکٹر صاحب چینی کمیونزم کو کیا بھارت کے سکھ ازم اور سیکولرزم کو بھی بڑی آسانی سے ”سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج“ قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ ان میں بھی مشکلات بہر حال اتنی نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب کو اسلام میں پیش آرہی ہیں، کیونکہ نہ ہو ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی کو اپنے مذہب کی اتنی ہی کامیاب و کالت کرنی چاہئے تھی۔

گرہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند

ایں چینیں ارکان دولت ملک راویران کنند

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک رجب ۱۳۸۶ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمن کے تحقیقاتی فلسفہ کے ضمنی اصول

حامداً و مصلیاً و مسلماً:۔ اما بعد:

ہم اس سے پہلے مقالہ میں ان ”بنیادی اصول اربعہ“ سے بحث کر چکے ہیں جن پر ڈاکٹر صاحب کے ”تحقیقاتی فلسفہ“ کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں، وہاں ہم نے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ یہ فلسفہ اور اس کے ”ارتقائی اصول“ استاذ فرنگ کے کافرانہ مزاج، ملحدانہ ذوق اور منتقمانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں، ان کا اصل مقصد ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت حقہ، شریعت کاملہ، اور آپ کی ”ماموریت من اللہ“ کے انکار کو نئی شکل میں پیش کرنا، ”ارتقا“ کی فرضی کڑیوں سے اسلام کو ”زمانہ مابعد“ کی مخلوق ثابت کرنا، اور اسلام اور کلیسائیت میں مشابہت دکھلا کر اسلام کی ”گرفت“ کو کمزور کرنا، اور اسلامی معاشرہ کو اسلام سے بدظن کر کے مسلمان نسل کو حرص و آز، ہواؤ ہوس اور خود رائی و نفس پرستی کے اسی جہنم میں دھکیل دینا، جس میں مغربی معاشرہ بھسم ہو کر انسانیت کے تمام بلند تصورات اعلیٰ اخلاق اور اقدار کو یورپ میں تباہ کر چکا ہے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب اور ان کے مکتب فکر نے شاطر فرنگ کے دام تزویر میں آکر اپنے اساتذہ کے اگلے ہوئے نوالہ، فلسفہ ارتقاء، کو وحی آسمانی کی طرح خوش آمدید کہا

اور قبول کر لیا، وہ اس فلسفہ کے ”جادو“ سے ایسے مسحور ہوئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر آج تک کے تمام ”خضر صفات“ علمائے حق پر ناروا حملے کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے، لیکن انہیں کبھی بھول کر بھی یہ سوچنے کی توفیق نہ ہوئی کہ یہ سارا افسانہ محض خیالی یا فرضی تو نہیں ہے؟ الغرض یہ ”مشرقی شاگرد“ اپنے ’مغربی استاذ‘ کے پوری طرح نقش قدم پر چلے فصلوا و اضلوا (خود بھی گمراہ ہوئے) اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا

ان سطور میں ان ”ضمنی اصول“ سے بحث کی جائے گی، جنہیں ”فلسفہ ارتقاء“ کے مختلف مراحل میں استعمال کیا جاتا ہے، ان سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈاکٹروں، اور ان کے مغربی اساتذہ کرام، کا انداز نگارش اور طرز تحقیق کیا ہے۔

پہلا اصول: فرضی تاریخ کی سنگ باری :.....

ڈاکٹر صاحب موصوف، پہلے اپنے اساتذہ مغرب کے نظریاتی ”ملغوبہ“ سے ایک ”ارتقائی خاکہ“ تیار کرتے ہیں، پھر اس کی بنیاد پر ایک خیالی ”شیش محل“ تعمیر کرتے ہیں، پھر اس میں بڑے اطمینان کے ساتھ فروکش ہونے کے بعد ظن و تخمین، قیاس و وہم کے ”دور مار میزائل“ سے خدا و رسول، کتاب و سنت، وحی و رسالت، فقہ و عقائد اور صحابہ و تابعین، فقہاء و محدثین، علما و صوفیاء اسلام پر ”فرضی تاریخ“ کی ایسی شدید گولہ باری کرتے ہیں کہ انسانیت لرز جاتی ہے، روح اسلام کانپ اٹھتی ہے، اور عقل و دانش سرپیٹ لیتی ہے۔ وہ ”گرے پڑے مواد“ کے ذریعہ اسلام کی مصنوعی، لیکن نہایت مکروہ اور بھونڈی، تصویر کشی میں ایسے ماہر فنکار واقع ہوئے ہیں، کہ اسلام اس تصویر کو دیکھ کر بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ:

بخندید وگفت ایں نہ صورت من است
و لیکن قلم در کف دشمن است
ترجمہ: ”ہنسا اور کہا: یہ میری تصویر تو ہرگز نہیں، لیکن کیا کیجئے،
قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔“

ان کے مقالات میں آپ کو ”قیاس یہ کہتا ہے“ ”اغلب یہ ہے“ ”معلوم یہ ہوتا ہے“ ”درحقیقت جو شہادت موجود ہے“ ”زبردست شہادت“ ”معلوم حقیقت“ ”غالبا“ ”اغلباً“ ”لازمًا“ ”یہ امر واضح ہے“ ”شاید کہ“ ”قسم کے الفاظ برابر ملتے چلے جائیں گے۔ یہی سائنٹیفک گولے اور تحقیقی ایٹم بم ہیں، جن کا وجود خارج میں مطلق نہیں ہوتا، لیکن موصوف اسلام کی آہنی دیواروں کو مسمار کرنے کے لئے ان ہی فرضی گولوں کی مسلسل بارش کئے چلے جاتے ہیں۔ لطف یہ کہ انہیں کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کی اس ”گولہ باری“ کی زد میں کون کون آسکتا ہے؟ یوں تو موصوف کے تحقیقی ”اسلحہ خانہ“ میں مفروضاتی گولہ بارود کی اتنی بھرمار ہے کہ ان کا ہر قاری اس سے واقف ہے، لیکن موصوف کے اس اصول کی مزید وضاحت کے لئے چند ابھرتی ہوئی مثالوں کا پیش کر دینا مناسب ہوگا:

۱۔۔۔۔۔ موصوف کی تحریک چونکہ اسلام کی آزادانہ مرمت، تغیر و تبدیل، اور ہر طرح کی تحریف و تصرف کی داعی ہے۔ اس لئے وہ کھل کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ:
”زمانہ حال کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے
اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح، اور اسلام کے قطعی اور منصوص
مسائل میں قطع و برید اور تحریف و تغیر نہ صرف یہ کہ جائز ہے،
بلکہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔“

ان کے اس نظریہ پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ شریعت محمدیہ (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقابلہ میں وہ ایک نئی شریعت ایجاد کرنا چاہتے ہیں، آخر اسلام میں اس کی گنجائش کہاں سے پیدا ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس پر وحی آئی ہے؟ یا آپ خود وحی آسمانی کے مدعی ہیں کہ جس کے ذریعہ خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ احکامات کو منسوخ قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں؟ یہ سوال یقیناً بڑا دقیق تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ”یہودی تعلیم“ بھی کچھ ”یوں ہی سی“ نہ تھی، وہ میک گل یونیورسٹی کے صرف متعلم ہی نہیں، بلکہ معلم اور پروفیسر بھی رہ چکے تھے، اس لئے انہوں نے سب سے پہلے ”سنت“ کے مفہوم کی بحث چھیڑ دی اور اس کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ انہوں نے صریح طور پر شریعت نبویہ کا انکار کرتے ہوئے لکھا :

(۱) ”در حقیقت جو شہادت موجود ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا

ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ”اساسی طور“ سے بنی نوع انسان کے اخلاقی مصلح تھے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۶)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آج کل کی اصطلاح کے

مطابق وسیع معنوں میں ایسے قانون ساز، شارع، نہ تھے کہ دین و دنیا کی ہر بات کی تفصیلات مرتب فرماتے ہوں۔“

(حوالہ بالا صفحہ ۱۷)

اب ذرا غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ دعویٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اساسی طور پر صرف ایک اخلاقی مصلح تھے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وسیع معنوں میں شارع یا آج کی اصطلاح میں قانون ساز نہ تھے کتنا

ہوا اور لگتا اہم دعویٰ ہے۔ قرآنی اعلانات کے خلاف، تاریخ نبوت کے مناقض، منصب نبوت کی ضد، اجماع امت کے منافی، اوصاف نبوی کی نقیض، خالص افتراء، عظیم بہتان سراپا طوفان، لیکن ڈاکٹر صاحب اس زہر تلخ کو ”در حقیقت جو شہادت موجود ہے“ کے کیسپول میں بند کر کے ملت اسلامیہ کے حلق سے نیچے اتار دینے کے درپے ہیں، ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں، کہ یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟ اور یہ شہادت کہاں موجود ہے؟ جناب کی عدالت عالیہ میں یہ شہادت کس نے پیش کی ہے؟ اور اس کا شاہد کون ہے؟ صرف جناب کا وہم، یا استاذ محترم کا ارشاد؟ آپ نے دیکھ لیا کہ دعویٰ ہے اس زمانہ میں نفی شریعت و نبوت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا اور دلیل ہے فرضی ”حقیقت“ اور خیالی ”شہادت“!

۲۔ اسی سلسلہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ جب آپ کو احساس ہوا کہ ”در حقیقت جو شہادت موجود ہے“ کی خالی فائرنگ سے تشریع نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصر محکم مسامحہ نہیں کیا جاسکتا، تو موصوف نے اس کے لئے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی استعمال کر ڈالا۔ یعنی :

”قیاس یہ کہتا ہے کہ آنحضرت جو وقت وفات تک اہل عرب

کی اخلاقی اصلاح (۱) کی شدید جدوجہد میں مصروف، اور اپنی قومی

(۱) واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تحریر میں ”نفاق“ اور ”الحاد“ کا زہر اس قدر خفی اور مسمومانہ انداز میں ملانے کے عادی ہیں کہ وہاں تک عام نظر کا پہنچنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے، یہاں مصروفیات نبوی کے ذیل میں ”اصلاح امت“ اور ”خلافت الہیہ کی تنفیذ“ یا کوئی اور لفظ جو اسلامی ذوق کے مناسب ہوتا۔ کی بجائے ”عرب کی اخلاقی اصلاح“ اور ”(بقیہ بر صفحہ آئندہ)“

ریاست کی تنظیم میں مشغول رہے۔ ان کو اتنا وقت کہاں مل سکتا تھا کہ وہ زندگی کی جزئیات کے لئے قوانین مرتب فرماتے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۷۱)

ان کے اس ”قیاس یہ کہتا ہے“ پر ہم پہلے مقالہ میں کسی قدر بحث کر چکے ہیں، یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ ایک طرف ان کے ”سنگین ادعاء“ کو رکھئے اور دوسری طرف ان کے استدلال اور ثبوت کو ملاحظہ فرمائیے، چاہتے ہیں کہ صرف ”قیاس یہ کہتا ہے“ کی ”پھونکوں“ سے نبوت محمدیہ کے آفتاب عالمتاب کی شمع فروزاں کو گل کر دیں، گویا خدا و رسول، وحی و نبوت جیسے حقائق واقعیہ کو میک گل یونیورسٹی کے ”ڈاکٹر“ کے دائرہ قیاس میں آنا چاہئے، بد قسمتی سے اگر کچھ محکم حقائق ان کے ”قیاس مقدس“ کے دائرہ میں نہ آسکیں تو ان کا وجود نہ صرف مشکوک ہو جائے گا بلکہ ڈاکٹر صاحب بالقلبہ اس کی قطعی ”نفی“ کا دعویٰ بھی کر ڈالیں گے، پھر ان کے ”قیاس یہ کہتا ہے“ کی گہرائی، گیرائی اور وسعت کا اندازہ بھی کیجئے جب ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کی زد میں لایا جاسکتا ہے، اور محض قیاس آرائی کے بل بوتے پر نفی تشریع کا طوفان برپا کیا جاسکتا ہے، تو اسلام کے دوسرے مسائل قطعیہ اور اسلامی تاریخ کی دوسری بلند پایہ ”شخصیات“ کے بارے میں یہ ”قیاسی منجیق“ کیوں نصب نہ کی جائے گی، اندریں صورت اب تو اسلام کا ”وجود“

اپنی قومی ریاست کی تنظیم کے الفاظ خالص دجل و نفاق اور الحاد و زندقہ کی قطعی دلیل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی ایسا تصور (یا عقیدہ) مشکل ہی سے برداشت کر سکتے ہیں جو ان کے مغربی آقاؤں کے لئے گرانی طبع اور ناگواری خاطر کا باعث بن سکتا ہو (م ی)

صرف ڈاکٹر صاحب کے ”قیاس یہ کہتا ہے“ کے رحم و کرم پر ہے، اسلام کے جس مسئلہ پر بھی ان کے قیاس کو طیش آجائے، (خواہ اس کی حقانیت پر بیسیوں دلائل موجود ہوں) بس سمجھنا چاہئے کہ اب اس کی خیر نہیں، چنانچہ شرح زکوٰۃ حرمت ربوا، حرمت شراب، حدود اللہ وغیرہ ان کے اسی قیاسی طیش کا نشانہ بن چکے ہیں، آئندہ خدا ہی جانتا ہے کہ اور کون کون سے مسائل پر یہ مشق ستم جاری رکھی جائے گی۔

۳۔ اب اس قیاسی اصول کی تیسری مثال دیکھئے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مغربی مفکر، ڈارون، نے انسان اور بندر کی بعض مناسبات کو سامنے رکھ کر قیاس کی کڑیاں کچھ اس طرح سے ملائیں کہ انہیں انسان میں، بندر ہی کی ارتقائی شکل نظر آئی، اور انہوں نے بڑی شد و مد اور نہایت بلند باگی سے یہ اعلان کر دیا کہ انسان کا مورث اعلیٰ اور جد امجد حضرت بندر ہیں، یعنی بندر ہی نے جسمانی ارتقائی مراحل کے تحت ترقی کرتے کرتے انسانی روپ دھار لیا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ہمارے ڈاکٹر صاحب نے پہلے (اپنے ذہن ہی ذہن میں) یہ فرض کر لیا، کہ ”وحی الہی“ اور نبوت محمدیہ (علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام) نے غریب اسلام کو (چند اخلاقی اصولوں کے علاوہ) کسی قسم کا کوئی اعتقادی، عباداتی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی نظام نہیں بخشا، اسلام اپنے اصل منبع سے بالکل خشک لب اور تہی دامن نکلا تھا، اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ قرون وسطیٰ کے فقہاء، محدثین، متکلمین، اور سلف صالحین نے اسلام کی تشکیل و تکمیل کا بیڑا اٹھا لیا۔ چنانچہ اسلامی عقائد، عبادات، اخلاق، اور سیاسیات وغیرہ کا تمام ذخیرہ، ان کے بقول، اسی دور کے شخصی آراء و افکار کی پیداوار ہے، گویا کوئی اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ اسلام کا سلسلہ سند (یا سلسلہ نسب) ذات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور ذات خداوندی سے

وابستہ ہے، اس لئے کہ بقول ان کے اسلام کے مورث اعلیٰ اور جد امجد تو قرون و سطی کے مفکرین کے شخصی نظریات، باہمی نزاعات، نیز ایرانی، اور باز نپینی روایات ہیں، ڈارون کے لفظوں میں یوں کہئے کہ کوئی اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ انسان کے جد امجد حضرت آدم ہیں انسان کے مورث اعلیٰ تو حضرت بندر ہیں، صرف دم مرور ایام سے گھستے گھستے غائب ہو گئی ہے۔

اس نظریہ کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ احادیث نبویہ تھیں، جن میں قرآنی آیات بینات کی علمی اور عملی تعبیر و تشریح اور تشکیل کو ہر پہلو سے متعین کر دیا گیا ہے، اور انسانی زندگی کے تمام دینی اور دنیوی معاملات سے متعلقہ اصول و فروع کی تفصیل اور عملی صورت اس معجزانہ انداز میں بیان کر دی گئی ہے کہ کسی جائز کے لئے جور و انحراف کی، کسی مہول کے لئے تاویل کی اور کسی زندیق کے لئے زندقہ پھیلانے کی مطلق گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی۔ ایمان و عمل کی بحث ہو یا جبر و قدر کی، اطاعت امیر کا مسئلہ ہو یا سلطان جائز کے خلاف آواز اٹھانے کا، امر بالمعروف کے حدود ہوں یا نہی عن المنکر کے، صلح و آشتی کے اصول ہوں یا حرب و پیکار کے، الغرض قیامت تک پیدا ہونے والی تمام ضرورتوں سے متعلقہ ہر قسم کی ہدایات (اجمالاً یا تفصیلاً) احادیث نبویہ میں امت کو دیدی گئی ہیں۔ قرآن کریم نے اس امت کو امت وسط، معتدل امت، کا خطاب دیا تھا۔ اسی لئے حدیث نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر معاملہ میں اعتدال پر مبنی ہدایات و احکام امت کے لئے متعین فرما دیئے اور تفصیلاً (کھول کھول کر) بتلا دیا، کہ فلاں فلاں مسئلہ میں افراط یا تفریط کے حدود یہ ہیں، اور نقطہ اعتدال یہ ہے۔

حاصل یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے تجدد پسندانہ اجتہاد کی بڑی روک احادیث نبویہ تھیں، جو اصطلاحاً متواتر، مستفیض اور مشہور ہیں، یا کم از کم صحیح اور مقبول اسانید کے

ساتھ کتب حدیث میں جمع کر دی گئی ہیں، اور جہاں تک انسانی وسائل کی رسائی ہو سکتی تھی ان کو روایت اور درایت کے ہر پہلو سے چھان پھٹک کر امت نے قبول کیا ہے اور اس بارے میں حق تعالیٰ کی تائید غیبی (۲) نے خارق العادہ طریق پر حضرات محدثین رحمہم اللہ کو حفظ و ضبط، نقد و انتقاد، جرح و تعدیل اور فہم و بصیرت کی وہ بحیرا عقول صلاحیتیں عطا فرمائیں کہ انہیں سامنے رکھ کر ایک لمحہ کے لئے بھی عقل سلیم یہ تسلیم نہیں کرتی کہ علوم نبوت کی حفاظت میں کسی قسم کی بھی غفلت، کوتاہی اور تساہل کی گنجائش رہی ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب بھی معمولی دل گردے کے آدمی نہ تھے، وہ برسہا برس تک مغرب کے ”ڈارون صفت ارتقائی“ فلاسفہ کی آغوش شفقت کے پروردہ تھے، آپ ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ سے کام لے کر آگے بڑھے اور قیاس و وہم، ظن و تخمین کی کڑیاں ملا کر، بزعم خود، ثابت کر دیا کہ انسان کا مورث اعلیٰ بندر ہے، یعنی ”یہ تمام احادیث بھی عمل ارتقا کا کرشمہ ہیں، اور سیاسی جنگوں اور نزاعی بحثوں کی پیداوار ہیں، دیکھو شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد جو خانہ جنگی شروع ہوئی اس میں اس وقت کے لوگوں نے (جو صحابہ اور تابعین ہی ہو

(۲) یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے مکتب فکر کے لوگ، جب بھی اسلام کے کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس سے پہلے وہ دو مفروضے سامنے رکھ لیتے ہیں ایک یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی کوئی حفاظت نہیں کی، نہ اس کے لئے کوئی ایسا انتظام فرمایا جسے خدائی انتظام، غیبی انتظام، یا تائید خداوندی کا نام دیا جاسکے، دوم یہ کہ جن ہاتھوں کو دین کی امانت اور اس کی حفاظت سپرد کی گئی تھی اور مشیت الہیہ جن کو حفاظت دین کے لئے آئے اور ”جارحہ“ (کارکن) کی حیثیت سے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی، ان کے علم و فہم اور عقل و بصیرت کی سطح، موجودہ دور کے ”بندگان شکم“ کی سطح سے پہلے نہ تھی تو ہو سکتی ہے لیکن اس سے بلند بہر حال نہیں تھی۔ معاذ اللہ (م۔ ی۔)

سکتے ہیں) فلاں فلاں احادیث وضع کیں اور ان کا فرضی سلسلہ سند ذات نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب کر دیا، اس لئے فرض کرنا چاہئے کہ یہ احادیث اسی ارتقائی فتنہ کی پیداوار ہیں اور دیکھو فلاں موقع پر خوارج کا فتنہ کھڑا ہوا، اس موقع پر فلاں قسم کی احادیث کی نشر و اشاعت ہوئی، اس لئے یقین کرو کہ اس سلسلہ کی تمام احادیث کا جد امجد بھی فتنہ ہے، لیکن حدیثیں پیش کرنے والے ان میں قوت پیدا کرنے کے لئے ”یوں ہی“ ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتے رہے، اور دیکھو فلاں موقع پر فتنہ اعتزال کی وجہ سے ایمان و عمل اور جبر و قدر کی بحثیں چھڑیں اس موقع پر فلاں نوعیت نو کی احادیث کا نشو و نما ہوا اور اس وقت کے اکابر محدثین نے مصالحنہ حدیثیں بنا بنا کر۔ ان میں تقدس کی شان پیدا کرنے کے لئے انہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا، وقس علیٰ ہذا۔

احادیث نبویہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا تحقیقی شاہکار یہی ہے کہ وہ کسی خاص ”نوعیت“ کی احادیث کے مناسب تاریخ اسلامی کے کسی مرحلہ کا انتخاب کر لیتے ہیں، (جو احادیث پر کسی بھی طرح منطبق ہو سکے اور احادیث بھی اس پر منطبق ہو سکیں) اس کے بعد حدیث اور واقعہ کی باہمی مناسبت ان کے اسی قیاسی دعویٰ کے لئے کافی ہو جاتی ہے، کہ یہ احادیث اس واقعہ میں ظہور پذیر ہوئیں، اس لئے مان لینا چاہئے کہ محدثین نے ان معاصرانہ واقعات کو ماضی کی طرف موڑ دیا ہوگا، اس سلسلہ میں خود ان کی اپنی تصریحات ملاحظہ فرمائیے اور اس ضمن میں ان کی قیاس آرائی کی داد دیجئے :

”معلوم یہ ہوتا ہے“ کہ راویان حدیث کی سرگرمیاں

قاضیوں اور ققیہوں کے عمل اور طریق کار سے نہ صرف غیر متعلق

تھیں، بلکہ بسا اوقات ان کے علی الرغم جاری تھیں، فقہا اپنے فقہی امور ”زندہ اور جاری سنت“ کی بنا پر طے کرتے تھے اور فقہ کی توسیع کی غرض سے اپنی ”ذاتی رائے“ کے ذریعہ حاصل شدہ مواد کی ”آزادانہ تعبیر“ کرتے تھے اس کے برعکس راویان حدیث اپنا بنیادی کام یہ سمجھتے تھے کہ وہ صرف روایت پر اکتفا کریں، کیونکہ ان کی غرض یہ تھی کہ کسی طرح فقہی نظام میں ثبات و استقرار پیدا ہو۔ اگرچہ قلت مواد کے باعث یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ فقہا اور راویاں حدیث کا ٹھیک ٹھیک کیا تعلق تھا، لیکن ”یہ امر یقینی ہے“ کہ بالعموم یہ دونوں فریق ایک قسم کے تناؤ کے دوسرے تھے، جن میں ایک فقہ کی نشو و نما اور ترقی کا معاون تھا اور دوسرا اس میں ثبات و استقرار پیدا کرنا چاہتا تھا۔“ (فکر و نظر جلد ۱۳ ص ۴۳، ۱۴، ۱۵)

اس فقرہ میں موصوف نے فقہ اور حدیث کے ربط و تعلق کی جو فرضی تصویر کھینچی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس کا جائزہ لیجئے، بد قسمتی سے ان کے مغربی اساتذہ اتنا مواد فراہم نہیں کر سکے جس سے انہیں فقہا اور راویان حدیث کے مابین ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح تعلق کا سراغ مل جانا ممکن ہوتا، لیکن اس ناممکن صورت حال میں بھی ”سروش مغرب“ کی جانب سے ان کے کان میں ”معلوم یہ ہوتا ہے“ اور ”یہ امر یقینی ہے“ کا القاء کروایا گیا کہ :

۱۔ راویان حدیث فرضی احادیث بنانے اور انہیں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں سرگرم تھے۔

۲۔ فقہا اپنے فقہی امور ”اپنے اپنے علاقہ کے رسم و رواج“ جس کا

خوبصورت لقب ان کی اصطلاح میں ”زندہ اور جاری سنت“ ہے۔ کی بنیاد پر طے کیا کرتے تھے، اور فقہ کی توسیع اور ترقی کے لئے ان کا سارا زور اپنی ذاتی رائے سے حاصل شدہ مواد کی آزادانہ تعبیر پر صرف ہوتا تھا، (یعنی قرآن اور سنت نبوی علیہ السلام کی طرف وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔)

۳۔ گویا نہ تو راویان حدیث اور ان کی سرگرمیوں کو فقہاء اور ان کے طرز عمل اور طریق کار سے کوئی ادنیٰ تعلق تھا، نہ فقہاء نے محدثین کی طرف التفات کی کبھی زحمت گوارا کی تھی، بلکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے علی الرغم اپنا اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے، یوں یہ دونوں فریق ایک ڈوری کے تناؤ کے دو سرے بن کر رہ گئے تھے، جن کے درمیان، مقصد، عمل، اور طریق کار کے اعتبار سے کوئی نقطہ اتحاد اور جہت وحدت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ ”قلت مواد“ کے باوجود موصوف نے یہ فرضی تاریخ کیسے مرتب کر لی، اور اسلامی تاریخ کے کون سے سن میں یہ ہولناک واقعہ پیش آیا؟ اور اس فرضی تاریخ کے دور میں اسلام کا کیا بنا؟

لیکن کیا کوئی ڈاکٹر صاحب سے دریافت کر سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف بلکہ بالکل ضد، اور علی الرغم اپنی اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے والے دونوں فریق پھر کب سے متحد ہوئے؟ بالآخر ان میں ملی بھگت کا مرحلہ کیونکر پیدا ہو گیا؟ اور فقہی احکام و مسائل کے نکر قرآن و حدیث کے موافق کیسے مرتب ہونے لگے؟ ان دونوں فریقوں کو ضد و عناد کے طرز عمل سے کس نے ہٹایا؟ اور ان دونوں کے فطری مزاج، مختلف مقاصد، اور الگ الگ طریق کار میں کس چیز نے تبدیلی پیدا کر دی؟ وہ کون سے عوامل تھے جو بالآخر فقہاء و محدثین کو ایک ہی سطح پر کھینچ لائے؟

ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ان سوالات کا پیش کرنا لغو ہے، ان کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ اسلامی تاریخ سے ناواقف متجددین، جدت پرستوں کو

الوہا کر اسلام کے عظیم الشان ذخیرہ فقہ و حدیث کا رشتہ ذات نبوت صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹ دیا جائے، اس کے لئے انہوں نے یہ سارا فرضی افسانہ تراش لیا، ان کی ہا جانے کہ اس لا یعنی افسانہ نگاری سے کسی قسم کے سوالات ابھر سکتے ہیں، مزید سنئے:

”یہ امر واقعہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کی جو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں ان کا سلسلہ روایت صحابہ بلکہ تابعین اور تبع تابعین تک آخر ختم ہو جاتا ہے، لیکن جیسے جیسے وقت گزرنا گیا ”معلوم ایسا ہوتا ہے“ گویا حدیث کی تحریک نے داخلی تقاضے سے مجبور ہو کر سلسلہ روایات کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس کے فطری مرکز و محور یعنی ذات رسالت تک پہنچا دیا“

(فکر و نظر ج ۱ ص ۴۳)

یہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ”یہ امر واقعہ ہے“ اور ”معلوم ایسا ہوتا ہے“ کے دو فرضی بم گرائے اور تمام ذخیرہ حدیث کو بھسم کر کے رکھ دیا، فرضی تاریخ کا طوفان برپا کیا، اور محدثین کی پوری جماعت کی تمام محنت پر پانی پھیر دیا، اگر آپ ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کریں گے تو وہ فوراً بگڑ جائیں گے کہ یہ واقعہ کہیں خارج میں بھی موجود ہو سکتا ہے؟ یا یہ صرف جناب اور جناب کے مغربی اساتذہ کا خانہ ساز واقعہ ہے۔

یا یہ سوال کیا جائے کہ دوسری صدی کی کتنی تصانیف جناب تک پہنچ سکی ہیں؟ اور ان میں مرفوع احادیث کا اوسط کیا ہے؟ اور موقوف احادیث کا اوسط کیا ہے؟ اور یہ کہ تحریک حدیث کا مفہوم آپ کے تحقیقاتی ادارے میں کیا ہے؟ اور اس کے اصلی تقاضے کیا تھے؟ اور یہ کہ سلسلہ روایات کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے فرضی طور پر ذات

رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دینے کا افسانہ کس ناول میں آپ نے پڑھا ہے؟ اور کس ماخذ سے آپ کو اس ”پراسرار تحقیق“ کا انکشاف ہوا ہے؟

ڈاکٹر صاحب کے ”اساطیری افسانہ“ کو واقعات کی ترازو میں تولنا چاہو، تو دوسری صدی کی تصنیف ”الموطا“ کی مرفوع اور موقوف احادیث کی الگ الگ فہرست مرتب کر کے ان دونوں کا اوسط نکالو، اس کے بعد دوسری صدی کے بعد کی تصنیف ”مصنف ابن ابی شیبہ“ میں درج شدہ مرفوع اور موقوف روایات کا اوسط نکالو، پھر الموطا اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حاصل کردہ اوسط کا تقابلی جائزہ لو، آسانی سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس طرح واقعات سے آنکھیں بند کر کے یہ افسانوی طوفان برپا کیا ہے، اس قسم کے مزید اقتباسات بینات بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں ملاحظہ فرمائیے۔ اور ڈاکٹر صاحب کی مفروضات تراشی کی داد دیجئے۔

۴۔۔۔ اب اس فرضی تاریخ سازی، خیالی افسانہ نگاری اور خانہ ساز مفروضات کی چوتھی مثال ملاحظہ فرمائیے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور، احادیث (۱) متواترہ سے ثابت اور تمام امت مسلمہ کا مسلمہ عقیدہ ہے۔ حدیث، سیرت اور تاریخ کی کونسی کتاب ہے جو اس تاریخ نبوت و رسالت کے منفرد اور سرتاپا اعجاز واقعہ کے ذکر سے خالی ہے؟ لیکن چونکہ مغربی یونیورسٹیوں میں اسے شرف پذیرائی حاصل نہیں، اس لئے موصوف کی ”اسلامی غیرت“ نے پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) میں اعلان کیا۔ (لطف یہ کہ موصوف کا یہ اعلان ”مذہب عالم“ کانفرنس میں، پاکستانی

(۱) واضح رہے کہ اس واقعہ کے نقل کرنے والے صرف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعداد کم و بیش تیس تک پہنچتی ہے۔

مذہب، ادارہ تحقیقات اسلامی حکومت پاکستان کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے ہے) کہ :

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کو عام طور پر جس طرح پیش کیا جاتا ہے وہ اس توہمت پرستی کی، جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایک مثال ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۱ ص ۲۱)

یہ بحث تو اپنی جگہ رہی، کہ واقعہ معراج کے تسلیم کر لینے سے ”توہمت پرستی“ کا ”جن“ کیسے چمٹ جاتا ہے؟ اور یہ کہ اس قسم کی ”توہمت پرستی“ کی مثالوں کا۔ جن میں سے یہ ایک مثال ہے۔ کتنا بڑا ذخیرہ موصوف کے ”نہانخانہ دل و دماغ“ میں بھرا پڑا ہے، اور یہ کہ انہیں یہ انکشاف کیسے ہوا کہ قرآن مجید معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ثبوت سے خالی ہے۔ چونکہ ہم اس مقالہ میں موصوف کے نظریات سے نہیں بلکہ ان کے اصول تحقیقات سے بحث کر رہے ہیں اس لئے یہاں صرف موصوف سے اس عقیدہ کی تاریخ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں میں یہ عقیدہ کیسے پیدا ہوا؟ سنئے ارشاد ہے :

”معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب مسلمان جزیرہ عرب سے باہر نکلے، اور خاص طور سے عراق میں ان کا عیسائیوں سے سابقہ پڑا، تو انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان کی طرف اٹھائے گئے تھے۔ معراج کو جسمانی شکل میں پیش کرنا پڑا۔“

(حوالہ بالا)

آپ جانتے ہیں، کہ مسلمان بے چارے خلافت صدیقی کے دور ہی سے جزیرہ

عرب سے باہر نکل پڑے تھے، اور اب تک عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں ان کی آمد و رفت جاری ہے اور عیسائیت سے سابقہ تو انہیں عرب کے اندر ہی پڑ رہا تھا اور وہ بھی عہد نبوی علیہ السلام میں، لیکن چونکہ موصوف کا ”معلوم یہ ہوتا ہے“ کسی خاص دور کی نشاندہی کرنے اور اس کے لئے کسی ماخذ کا حوالہ دینے کے تکلف کا عادی نہیں، بلکہ فرضی افسانہ نگاری سے حقائق کا مقابلہ کرنے کا خوگر ہے اس لئے ہم اور آپ کو اس ”فرضی تاریخ“ کے متعلق اتنا دریافت کرنے کا بھی حق نہیں، کہ اگر یہ عقیدہ عیسائیت کے جواب میں بنایا گیا تھا تو حدیث، سیر اور تاریخ کی تمام کتابوں کے علاوہ یہ واقعہ قرآن مجید میں کس نے درج کر دیا۔ (کیا ڈاکٹر صاحب کے اس مفروضہ کو کوئی بھی عقل باور کر لے گی؟ کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم، اسلامی عقائد، ”عیسائیت“ سے در آمد کیا کرتے تھے۔؟ اور کیا اس قماش کے لوگوں کے واسطہ سے نقل شدہ اسلام اور قرآن پر اعتماد کر لینے کی کوئی گنجائش رہ سکتی ہے؟ استغفر اللہ) اسی سلسلہ کی ایک دو مثالیں اور سنتے جائیے :

۱۔.....

”اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے (جس کی بنیاد متعدد آیات قرآنی اور متواتر احادیث نبویہ اور اہل حق کے اجماع پر ہے، ناقل) جو شکل اختیار کی (ہے) وہ عیسائیوں کے کفارے کے عقیدہ کا جواب تھا“ (حوالہ بالا)

۲۔.....

”جب اپنے زمانے کی سیاسی زندگی میں عوام الناس نے اپنی روحانی امنگوں اور باطنی تمناؤں کی تکمیل کا سرو سامان نہ پایا تو ان میں تیزی سے یہ تصور پھیلا کہ ”مردے از غیب بروں آید و کارے بکند“

نجات دہندہ کے انتظار کی ایک شکل مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی (۱) کا عقیدہ تھا جو عیسائیت سے ”مستعار“ لیا گیا اور کچھ عرصہ بعد اہل سنت والجماعت کے عقائد کا جزو بن گیا“
(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۲)

.....
”اس کی دوسری شکل وہ تھی جس نے شیعہ حلقوں میں جنم لیا اور“
شروع کے صوفیاء کی کوششوں سے ”اہل سنت“ کے عقائد میں جگہ پائی یہ تھا ”مہدویت“ کا عقیدہ“ (حوالہ بالا)

الغرض ڈاکٹر صاحب کی فرضی تاریخ سازی، بے سرو پا خن آرائی، لایعنی افسانہ نگاری، ان کا ایسا تحقیقی شاہکار، اور ان کے فلسفہ ارتقا کا ایسا ضمنی اصول ہے جس کے ذریعہ وہ خدا اور رسول حدیث و سنت، فقہ و تصوف، عقائد و کلام، پر برابر سنگ باری کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی واقعہ کا صحیح بیان تو ان کے مزاج ارتقا و تجدید و تعمیر اسلام کے بالکل ہی منافی ہے، کسی مسئلہ پر علم و یقین کی روشنی میں بحث کرنا ان کے ”تحقیقی“ معیار (سائنٹیفک ریسرچ) سے بہت ہی فروتر ہے، اور کسی بحث میں راست روی، راست بنی، اور راست گوئی تو ان کی لغت سے بالکل ہی خارج اور مہمل الفاظ

(۱) اس مسئلہ پر ضرورت کے بقدر اکابر علماء کرام بہت کچھ تفصیل فرما چکے ہیں یہ عقیدہ بقول امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ و نفعنا .علومہ) ”تقریباً دو صد احادیث موثرہ سے ثابت، اور ضروریات دین میں داخل ہے اس سے انکار یا اس کی تاویل قطعی کفر ہے (ملاحظہ ہو ”التصریح بما تواتر فی نزول المسیح“ ”عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام“ اور ”اکفار الملحدین فی ضروریات دین“)

ہیں ان کے ”معلوم یہ ہوتا ہے“ کی منطق ”اتنی ہمہ گیر“ واقع ہوئی ہے کہ اس کے ذریعہ جب چاہیں کسی بھی قطعی مسئلہ کو رد و انکار کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔
(آئندہ ان کے دوسرے ضمنی اصولوں پر بحث کی جائے گی واللہ الموفق والمعين)
(بینات رمضان ۱۳۸۶ھ)

ادارہ تحقیقات اسلامی کا ماڈرن اسلام ایک نظر میں

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلنی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا
نام دے کر جسے ”مذہب“ کا رکھا تھا محفوظ
دور حاضر نے وہ ”منشور کہن“ بیچ دیا

آج سے ساڑھے گیارہ سو سال پیچھے کا منظر تاریخ کی دور بین سے ماضی کے
بہرہ کے میں جھانک کر دیکھو تمہیں اس وقت کے ”عقلیت پرستوں“ کا کھڑا کیا ہوا
ایک فتنہ عریاں ناچتا نظر آئے گا۔ اس فتنہ نے کتنے اہل اللہ کا خون اپنے سر لیا۔ خدا
کے کتنے مقبول بندوں کو آزمائش میں ڈالا۔ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی کتنی شمعیں
گل کیں۔ تاریخ کے پارینہ اور اق سے دریافت کرو، وہ تمہیں یہ تمام دردناک داستان
ہوئے کرناک انداز میں سنائیں گے۔ یہ فتنہ جسے فلسفہ یونان کے توشہ دان سے غذا مہیا
کی جاتی تھی اور طرح طرح کے رنگین عنوانات سے جس پر کفر و اسلام اور ایمان
و شرک کے فتوے صادر کئے جاتے تھے اور مطلق العنان خلافت کی پوری قوت جس

کے نافذ کرنے اور زبردستی لوگوں کے سر منڈھنے میں مصروف تھی، اس کا نام فتنہ ”خلق قرآن“ تھا۔ اور اس فتنہ سے پنجہ آزمائی کے امتحان میں کامیاب ہونے والوں کے سرخیل حضرت امام احمد بن حنبلؒ تھے۔ اپنے تمام جبروتی جاہ و جلال کے باوجود اس فتنہ کو اپنی موت آپ مرتے ہوئے دیکھا گیا، اور وہ اہل حق جنہیں جبر و تشدد کی چکی میں پیس دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا سب نے دیکھا کہ ان کی ”حق کوشی“ نے انہیں ابدی زندگی کا وارث بنادیا ع

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کی بڑی مدت سے عادی ہو چکی ہے، آج اسی عقلیت، اسی فلسفہ، اسی رنگینی، اسی آب و تاب اور اسی قوت و جبروت کے ساتھ ایک فتنہ تمام ممالک اسلامیہ میں کھڑا کیا گیا ہے اور جسے خلق قرآن نہیں بلکہ بعد میں آنے والا مورخ ”فتنہ خلق اسلام“ کا نام دے گا اور جسے فلسفہ یونان سے نہیں بلکہ ”فلسفہ مغرب“ کے علمی ذخائر سے غذائی رسد مہیا کی جاتی ہے، میں آج چراغ تمنا لے کر کسی احمد بن حنبلؒ کی تلاش میں نکلا ہوں جو اپنے نحیف بدن پر کوڑوں کی ضربیں برداشت کر جائے، لیکن اس فتنہ کو ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اتار دے، آج کسی احمد بن نصر کو ڈھونڈنے چلا ہوں جس کی لاش تختہ دار پر مسلسل چھ سال تک لٹک کر یہ اعلان کر سکے کہ :

”اسلام حادث نہیں قدیم ہے، یہ قرون وسطیٰ کی پیداوار

نہیں، خدا کا نازل کردہ ہے۔“

اس کے ساتھ میں ان دوستوں کو جنہوں نے اس فتنہ کے قبول کر لینے پر آمادگی اختیار کر لی ہے یا اس کے خلاف سکوت مصلحت آمیز کا پُر امن راستہ تجویز کر لیا ہے،

کسی کا یہ پیغام دینے چلا ہوں۔۔۔ فریق اول کو یہ کہ :

تم نے مغرب سے خریدے ہیں اندھیروں کے جہاز
تم نے خود کو کب تقدیر وطن بیچ دیا
اور فریق دوم کو یہ کہ :

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی!
کیا کہیں نعرہ ”بت خانہ شکن“ بیچ دیا

دور جدید کے جس فتنہ کا ذکر آپ کے سامنے لایا گیا، اسے جدید اصطلاح میں
تجدد پسندی کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اس تجدد پسندی کا تنظیمی مرکز ادارہ تحقیقات
اسلامیہ (راولپنڈی) ہے۔ خبر ملی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ نے ”اسلامی قانون“
کے موضوع پر ایک جامع کتاب کی تدوین کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے وقت کی نزاکت
کے پیش نظر ہمیں چند مختصر لیکن ذرا صاف صاف باتیں عرض کر دینی چاہئیں۔

(۱)

ادارہ تحقیقات اسلام

اگر یہ صحیح ہے کہ کسی ادارہ کے اعتماد یا بد اعتمادی، مقبولیت یا مردودیت، افادیت
یا لغویت اور کشش یا نفرت کا مدار اس کی عمارتی نمائش، در و دیوار، فرش فروش ساز
وسلمان اور کتاب خانہ یا لائبریری پر نہیں ہوتا، بلکہ اس بارے میں اصل چیز اس کے
اقدار، اس کی روایات، اس کا طرز فکر اور طرز عمل ہوا کرتا ہے۔ اور پھر ان تمام امور
کا انحصار اس کے رجال کار، عملہ اور مجلس ادارت پر ہوا کرتا ہے تو ہمیں اعتراف کرنا
چاہئے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی بیچ سالہ کارکردگی اور اس کی اقدار و روایات، امت

مسلمہ کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ اس ادارہ نے جن ڈاکٹروں، پروفیسروں اور مفکرین کی جماعت اپنی ادارتی تشکیل کے لئے منتخب کی ہے نہ ان کو امت پر اعتماد ہے، نہ امت کو ان پر اعتماد ہے۔ نہ ان کے نزدیک امت کا اسلام صحیح ہے، نہ امت کے نزدیک ان کا ”جدید اسلام“ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ وہ امت کے تمام عقائد کو بیک جنبش قلم غلط اور توہم پرستی قرار دیتے ہیں اور امت ان کے نظریات کو ”استاذ مغرب“ سے حاصل کردہ بتلانے پر مجبور ہے۔ ان کے نزدیک پوری امت کا فہم حجت نہیں، اور پوری امت اس فیصلہ میں اپنے آپ کو حق بجانب تصور کرتی ہے کہ خود ان ہی کا فہم مسخ شدہ ہے۔ القصہ وہ امت کی کسی چیز کو صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں اور امت کے نزدیک ان کی تحقیق ناقابل تسلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ کی طرف سے ”ترجمانی مغرب“ کے مظاہرے تو بارہا ہوتے رہے ہیں لیکن ”ترجمانی اسلام“ کے بارے میں اس کی روش انتہائی حد تک مایوس کن بلکہ تباہ کن رہی ہے۔ اس ادارہ کے ”ارباب فکر و نظر“ نے تجدد پسندی اور اسلام کی نئی تشریح و تعبیر کی دریافت کے لئے تحریف والحاد کا جو وسیع جال پھیلایا ہے، اور اس کے لئے قرآن و سنت کے علاوہ اسلام اور اسلامی تاریخ کو جس بھونڈے انداز میں مسخ کیا ہے اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب التحریف والالحاد مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں اس ”دفتر تحریف“ کا اجمالی تعارف بھی آسان نہیں، لیکن پھر بھی بحکم ”مالا ید رک کله لا یتروک کله“ (جس چیز کو ہتمامہ حاصل نہ کیا جاسکے اسے بالکل ترک بھی نہیں کیا جاسکتا) ضروری ہے کہ چند تحریفی نمونے امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیئے جائیں تاکہ امت اس فتنہ ”خلق اسلام“ سے پوری طرح آگاہ ہو سکے اور علمائے امت کے لئے ”قدیم اسلام“ کو یکسر مشکوک قرار دینے والے ”پنج سالہ کودک نادان“ کے بارے میں ایمان و کفر کے شرعی فیصلہ میں آسانی پیدا ہو جائے۔

اسلام کا مفہوم

سب سے پہلے خود ”اسلام“ کو لیجئے۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا آرگن ”فکر و نظر“ اٹھا کر دیکھئے ”چودہ سو سالہ اسلام“ کے بارے میں آپ کو جگہ جگہ ”روایتی اسلام“، ”راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام“، ”تشکیلی دور کے بعد کا اسلام“، ”روایتی طرز فکر“، ”قدامت پسندی“ اور روایت پرستی کے الفاظ ملتے چلے جائیں گے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ادارہ سرے سے اس اسلام کا قائل ہی نہیں، بلکہ اسے قرون وسطیٰ کی مخلوق تصور کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے ہم نے اس فتنہ کا نام ”خلق اسلام“ رکھا۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں، بلکہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے دارالافتاء سے اس ”پارینہ اسلام“ کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا جاتا ہے :

”مسلمہ عقاید کے حامیوں کے پاس اسلام ضرور بیچ رہا مگر کس حال میں؟ محض پوست، مغز سے محروم، ایک ظاہری رسمی ڈھانچہ روح سے عاری۔“
(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳)

اور یہ کہ :

”اسلام غلو (انتہا پسندی) کے دو پاٹوں میں پس گیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قانون مبرم تھا جو راسخ العقیدہ گروہ کو اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ ثبوتی (سائنسی) فکر کو نیست و نابود کر دے۔“
(حوالہ بالا ص ۱۵۶)

مزید برآں یہ کہ :

”اگر قدامت پسندی اپنی روشن ضمیری سے محروم ہو جائے..... تو تمام تمدنی ڈھانچے کا تباہ ہو جانا یقینی ہے۔ بد قسمتی سے اسلام پر

یہی پٹا گزری۔ (جلد ۲ ش ۱ ص ۱۸)

چونکہ یہ چارہ صد (۱۳۰۰) سالہ پیر کھن اسلام تجدید پسند ادارہ تحقیقات کے نزدیک ”آزاد ہیمنہ زندگی“ میں خارج ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی پر سے اسے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور لادینیت (سیکولر ازم) کی دعوت دی جاتی ہے :

”اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال، خالص دنیوی جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں تو وہ کتنی دور تک اور کتنی گہری قابل قبول ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مذہب کو قطعی طور سے زندگی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔“

(فکرو نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۱۵)

گویا جب تک مسلمان مسلمان رہیں گے اس وقت تک وہ جدید ترقی سے محروم رہیں گے البتہ جب مذہب اسلام کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اس دن انہیں ترقی نصیب ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی نے ”روایتی اسلام“ کی جگہ ”ماڈرن اسلام“ پیش کیا اور اس کی ماڈرن تفسیر بھی کر ڈالی یعنی :

”اسلام چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا نام ہے جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنے عملی اظہار کے لئے ہمیشہ نوبینو اور تازہ بہ تازہ شکلیں تلاش کی ہیں اور وہ اسے ملتی رہی ہیں۔“

(فکرو نظر ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

چونکہ یہ چارہ صد (۱۳۰۰) سالہ پیر کھن اسلام تجدید پسند ادارہ تحقیقات کے نزدیک ”آزاد ہیمنہ زندگی“ میں خارج ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی پر سے اسے اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور لادینیت (سیکولرازم) کی دعوت دی جاتی ہے :

”اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال، خالص دنیوی جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں تو وہ کتنی دور تک اور کتنی گہری قابل قبول ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مذہب کو قطعی طور سے زندگی پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔“

(فکرو نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۱۵)

گویا جب تک مسلمان مسلمان رہیں گے اس وقت تک وہ جدید ترقی سے محروم رہیں گے البتہ جب مذہب اسلام کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا اس دن انہیں ترقی نصیب ہوگی۔ اس مقصد کے پیش نظر ادارہ تحقیقات اسلامی نے ”روایتی اسلام“ کی جگہ ”ماڈرن اسلام“ پیش کیا اور اس کی ماڈرن تفسیر بھی کر ڈالی یعنی :

”اسلام چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا نام ہے جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے اپنے عملی اظہار کے لئے ہمیشہ نوبنو اور تازہ بہ تازہ شکلیں تلاش کی ہیں اور وہ اسے ملتی رہی ہیں۔“

(فکرو نظر ۲ ش ۱۱ ص ۶۹۶)

یہ گرجٹ کی طرح ہر لمحہ نوبہو اور تازہ بتازہ شکلیں تبدیل کرنے والا اسلام،
ادارہ تحقیقات اسلامی کے مفکروں نے کہاں سے ڈھونڈھ نکالا؟ کیا قرآن، سنت سے، یا
کسی امام و فقیہ یا کسی صحابی و تابعی کے قول سے؟ جی نہیں، بلکہ تاریخ ثقافت اسلامی
کے بعض نامور غیر مسلم محققین نے جیسے کہ جی فان گرومبون ہیں، یہ نقطہ نظر پیش کیا

—

(جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

اور ان ہی بعض نامور غیر مسلم محققین سے سیکھ کر ادارہ تحقیقات اسلامی نے
اسے تجدید پسندی کے نقار خانہ میں شامل کر لیا تاکہ دور حاضر کے جس نظریہ حیات کی
شکل میں دل چاہے اسلام کو تبدیل کیا جاتا رہے گویا :
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

(۲)

خدا تعالیٰ، وحی اور قرآن

عقل الہی :

اب اس اسلام جدید یا ماڈرن اسلام کے چند اصول و فروع ملاحظہ فرمائیے :

”خدا کے عالم الغیب والشہادۃ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا کہ

اسے صرف اسی قسم کی پیش گوئی کا حق ہے جس قسم کی پیش گوئی

ایک عام آدمی اپنی دانش و بینش اور تاریخی بصیرت کی بنا پر کر سکتا

ہے۔ اس سے بالاتر پیش گوئی چونکہ خدا کی طرف سے قبول نہیں

یہ گرجٹ کی طرح ہر لمحہ نوبہو اور تازہ بہ تازہ شکلیں تبدیل کرنے والا اسلام،
ادارہ تحقیقات اسلامی کے مفکروں نے کہاں سے ڈھونڈھ نکالا؟ کیا قرآن، سنت سے، یا
کسی امام و فقیہ یا کسی صحابی و تابعی کے قول سے؟ جی نہیں، بلکہ تاریخ ثقافت اسلامی
کے بعض نامور غیر مسلم محققین نے جیسے کہ جی فان گرومبون ہیں، یہ نقطہ نظر پیش کیا

—

(جلد ۲ ش ۱۲ ص ۷۷۹)

اور ان ہی بعض نامور غیر مسلم محققین سے سیکھ کر ادارہ تحقیقات اسلامی نے
اسے تجدید پسندی کے نقار خانہ میں شامل کر لیا تاکہ دور حاضر کے جس نظریہ حیات کی
فصل میں دل چاہے اسلام کو تبدیل کیا جاتا رہے گویا :
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

(۲)

خدا تعالیٰ، وحی اور قرآن

عقل الہی:

اب اس اسلام جدید یا ماڈرن اسلام کے چند اصول و فروع ملاحظہ فرمائیے :
”خدا کے عالم الغیب والشہادۃ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا کہ
اسے صرف اسی قسم کی پیش گوئی کا حق ہے جس قسم کی پیش گوئی
ایک عام آدمی اپنی دانش و بینش اور تاریخی بصیرت کی بنا پر کر سکتا
ہے۔ اس سے بالاتر پیش گوئی چونکہ خدا کی طرف سے قبول نہیں

کی جاسکتی اس لئے وہ تمام احادیث صحیحہ جن میں صراحتاً "یا مینا" پیش گوئی کی نوعیت پائی جاتی ہے انہیں ادارہ تحقیقات رد کردیتا ہے۔"

(ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد اش ۵ ص ۱۶)

۲۔۔۔۔۔ وحی اور نبی:

وحی اور نبی کے بارے میں ادارہ تحقیقات کی جانب سے یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ:

"وحی ہو یا نبی کا عمل، وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ خالص نظریاتی کلیات کے استنباط کی طرف توجہ دے سکیں۔"

(جلد اش ۱ ص ۱۷)

۳۔۔۔۔۔ قرآن و سنت:

قرآنی اور نبوی فیصلوں کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی کی عدالت عالیہ سے فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ :

"چنانچہ وحی ہو یا نبی کا عمل، وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آتے ہیں، چہ جائیکہ وہ خالص نظریاتی کلیات کے استنباط کی طرف توجہ دے سکیں۔"

(فکر و نظر جلد اش ۱ ص ۱۷)

۴۔۔۔۔۔ قانون نہیں، ایک گونہ نظیر:

"اس قسم کے واقعات کو (جن میں قرآن کریم اور نبی

کریم ﷺ نے کوئی فیصلہ فرمایا، ناقل) نبی کا معیاری نمونہ اور ایک گونہ نظیر تو سمجھا جاسکتا ہے اسے تشددانہ طور پر حرف بحرف قانون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۸)

۵۔ قرآنی احکام زمانہ نزول کے ساتھ خاص تھے:

”خود قرآن مجید میں بھی اسلامی تعلیمات کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جس کا تعلق عام قانون سازی سے ہے لیکن خود قرآن مجید کا قانونی یا قانون نما حصہ اپنی اس حیثیت کو پورے طور پر واضح کر دیتا ہے کہ اس کا تعلق خاص حالات و کوائف سے ہے۔“ (بعد کی امت ان سے فارغ، ناقل)

(حوالہ مذکور ص ۱۶)

۶۔ نصوص شرعیہ:

”ان کے ہاں نصوص قرآن کو بھی اجتہاد کی زد میں لایا جاسکتا ہے اور بدلا جاسکتا

ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

”سب سے اہم بات یہ ہے کہ اجتہاد کا دائرہ دراصل بہت محدود کر دیا گیا ہے، یہ کہا جاتا ہے کہ جو چیزیں قرآن و سنت کی نصوص سے طے شدہ ہیں ان پر تو کوئی اجتہاد چل نہیں سکتا۔ اجتہاد کا دائرہ دراصل وہ امور ہیں جہاں قرآن و حدیث کی کوئی نص نہیں ملتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محدودے چند امور کو چھوڑ کر جو بالکل موجودہ زمانہ کی پیداوار ہیں۔ قرآن و سنت کی کوئی نہ کوئی نص ہر

بات کے لئے موجود ہے۔“ (اب اگر پابند نصوص کو لازمی نظریہ کے طور سے تسلیم کر لیا جائے تو بیچارے ”ماڈرن اسلام“ کو ہمیشہ نوبہو اور تازہ بتازہ شکلیں کہاں سے ملیں گی اور نامور غیر مسلم محقق ”جی فان گروم بون“ کی روح کیسے خوش ہوگی۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۲۳۳)

۷..... ابدیت قرآن

”در حقیقت ابدیت ان علل اور غایات کو حاصل ہے جو قرآنی احکام کی تہ میں ہیں اور جو ہمیشہ قرآن سے صراحتاً ”یا کنایتاً“ یا سیاقاً“ اخذ کی جاسکتی ہیں۔“

(حوالہ بالا ص ۷۲۳)

”نصوص قرآن پر تبدیلی کئے بغیر اڑے رہنے سے ان کی علت غائی اور مقصد حقیقی کا فوت ہو جانا یقینی ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۷ ص ۷۶)

۸۔ نسخ قرآن

”قدا مت پسندوں کی اصطلاح میں جس طرح دور نبوی میں نسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری تھا ضروری ہے کہ اب بھی جاری رکھا جائے ورنہ کیا تاریخ کے حالات جم کر رہ جائیں گے؟“

(ملخصاً ”فکر و نظر جلد ۱ ش ۷ ص ۷۸“ جلد ۲ ش ۲ ص ۲۳۰)

مقام نبوت

اب ذرا اس طرف توجہ فرمائیے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ”ماؤرن اسلام“ میں ذات رسالت مآب ﷺ کا کیا مرتبہ ہے، سنت نبویہ کی کیا حیثیت ہے، اور احادیث مقدسہ کی کیا پوزیشن ہے؟

۱۔ — ”آنحضرت ﷺ کے بارے میں شارع ہونے کا تصور قرون وسطیٰ کی رنگ آمیزی ہے :

”اگر ہم آنحضرت ﷺ کی سیرت کو اس ”رنگ آمیزی“ سے الگ کر کے دیکھیں جو ”عہد وسطیٰ کے فقہاء“ نے پیش کی ہے، تو ہمیں یقینی طور سے ایسا کوئی رجحان نظر نہیں آتا کہ رسول اپنے وسیع ترین مفہوم میں صرف ایک قانون ساز تھے، جو انسانی زندگی کے لئے جملہ دقیق تمام تفصیلات یعنی انتظامی معاملات سے لے کر خالص ”مذہبی مراسم“ تک مہیا کر رہے تھے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۶)

۲۔..... نبی نہیں بلکہ اخلاقی مصلح

”در حقیقت جو شہادت موجود ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ”اساسی طور“ سے بنی نوع انسان کے ”اخلاقی مصلح“ تھے (یعنی آپ کی اساسی حیثیت نبی کی نہیں بلکہ اخلاقی مصلح کی تھی، ناقل) (حوالہ بالا)

۳..... وقتی فیصلے

”وقتا“ فوقتا“ کچھ انفرادی فیصلوں کو چھوڑ کر جن کی حیثیت ”محض ہنگامی واقعات“ کی ہوتی تھی۔ آپؐ نے اسلام کی ترقی کے لئے بہت کم ہی عام قانون سازی کی طرف توجہ فرمائی ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۶)

۴. اصطلاحی قانون ساز نہ تھے:

”ابتدائی اسلامی روایات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ آج کل کی اصطلاح کے مطابق وسیع معنوں میں ایسے قانون ساز نہیں تھے کہ دین و دنیا کی ہر بات کے لئے آپ قانونی تفصیلات مرتب فرماتے ہوں۔“

(جلد ۱ ص ۱۷)

۵ اور قومی ریاست، قیاس کہتا ہے

”قیاس یہ کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جو وقت وفات تک اہل مکہ اور عرب کی اخلاقی اصلاح کی شدید جدوجہد میں مصروف اور اپنی ”قومی ریاست“ کی تنظیم میں مشغول رہے ان کو اتنا وقت ہی کہاں مل سکتا تھا کہ وہ زندگی کی جزئیات کے لئے قوانین مرتب فرماتے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۸)

۶..... زبردست شہادت

”اس امر کی (کہ نبوی فیصلے قانون کا درجہ نہیں رکھتے بلکہ صرف ایک گونہ نظیر ہیں جنہیں ہر طرح بدلا جاسکتا ہے، ناقل)

ایک زبردست شہادت یہ ہے کہ اوقات نماز اور ان کی جزئیات کے بارے میں آنحضرت نے امت کے لئے کوئی غیر پکھدار اور جلد انداز نہیں چھوڑا (اوقات نماز کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ناقل)۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۸)

۷..... بڑی بڑی پالیسیاں

”محض مذہب یا حکومت سے تعلق رکھنے والی بڑی بڑی پالیسیوں کو طے کرنے یا اہم اخلاقی اصولوں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنے ہی میں آنحضرت نے کوئی اقدام فرمایا ہے۔“ (بحوالہ بالا)

۸..... وہ بھی صحابہ کے مشورہ سے

”لیکن اس کے لئے بھی آپ اکابر صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ یعنی ان کا مشورہ تنہائی میں یا پبلک میں حاصل کر لیا جاتا تھا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۸)

ان تمام فرضی مقدمات کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خالص ”وحی الہی“ کے فیصلوں کا سرے سے وجود ہی نہیں، کیونکہ اول تو آپ کو ”قومی ریاست کی تنظیم“ کے دہندوں سے (معاذ اللہ) فرصت ہی کہاں تھی کہ اسلام کی ترقی کے لئے آپ کچھ اصول و فروع کی تشریح فرماتے اور پھر جو بڑی بڑی پالیسیاں یا اہم اخلاقی اصول آپ نے طے فرمائے بھی، وہ وحی الہی اور فراست نبوت سے نہیں بلکہ سب کے سب صحابہ

کرامؑ کے نبی یا پبلک مشورہ سے فرمائے۔ مزید برآں یہ کہ وہ بھی محض وقتی اور ہنگامی تھے۔ اس لئے بعد کی امت ان کی مکلف نہیں۔ ہم آگے چل کر بتلائیں گے کہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اسی عقیدہ کے بارے میں فرمایا :

لعنة الله والملائكة والناس اجمعين على

هذه العقيدة الباطلة۔

ترجمہ : ”اس عقیدہ باطلہ پر خدا کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت“۔

(۴)

سنت نبویؐ

سنت نبوی علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی نے وقتاً فوقتاً جو فتاویٰ صادر فرمائے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :

(الف) ”سنت نبوی کوئی متعین چیز نہ تھی نہ اس نے انسانی

زندگی کی کوئی تفصیلی راہنمائی کی، جیسا کہ عہد وسطیٰ کے اسلامی

لٹریچر (حدیث و فقہ) سے سمجھ میں آتا ہے۔“

(فکرو نظر جلد ۱ ص ۱۶)

(ب) ”سنت صرف کسی خاص جہت کی طرف اشارہ کرتی

ہے۔ وہ منضبط قوانین کا کوئی سلسلہ پیش نہیں کرتی۔“

(جلد ۱ ص ۱۹)

(ج) ”پہلے سے فیصلے تیار کر لینے کا اصول رسولؐ کی اجمالی

تعلیمات کے خلاف ہے۔“

(حوالہ بالا)

(شاید رسول کی مخالفت ہی کے جذبہ سے ادارہ تحقیقات جامع کتاب مرتب کرنا چاہتا

ہے۔)

(د) ”سنت ایک عمومی محیط تصور اور تعالیٰ اصطلاح ہے۔“

(جلد اش ۱ ص ۱۸)

(ه) ”سنت کے مشمولات کا بڑا حصہ ماقبل اسلام کے رسوم و رواج

کے تسلسل پر مشتمل ہے، جس میں عربوں کا بڑا حصہ ہے۔“

(جلد اش ۱ ص ۱۱)

(و) ”سنت کا ایک بڑا حصہ قدیم فقہائے اسلام کے ”آزادانہ غور

و فکر“ کا نتیجہ ہے۔“

(حوالہ بالا)

(ز) ”قدیم فقہانے نئے نئے بیرونی عناصر کو بھی سنت میں شامل کر دیا

جو یہودی روایات اور باز نطنی و ایرانی انتظامی معاملات سے ماخوذ

تھے۔“

(جلد اش ۱ ص ۱۲)

(ح) ”سنت کا اطلاق صدر اول میں سنت نبوی پر ہی ہوتا تھا۔ تاہم

مسلمانوں کا عمل سنت نبوی کے تصور سے الگ نہ تھا بلکہ اس میں

داخل تھا۔“

(جلد اش ۱ ص ۳۵)

(ط) ”صدر اول کی سنت کا مجموعہ بڑی حد تک مسلمانوں کا پیدا کردہ

تھا“ (اسلام مخلوق مسلمانان ہے۔ ناقل)

(ظ) ”سنت کی تخلیق پیدائش کا ذریعہ شخصی اجتہاد تھا۔“ انا للہ وانا
الیہ راجعون۔ ناقل۔)

(۵)

حدیث نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

قرآن حکیم کے بعد شریعت اسلامیہ کا مدار حدیث نبوی پر ہے، اس
لئے کہ احادیث مقبولہ اسی مشکوٰۃ نبوت سے صادر ہوئی ہیں، جس پر قرآن کریم کا
نزول ہوا اور ان میں قرآن کریم کی تفسیر و تشریح اس شرح و بسط سے فرمادی گئی
ہے کہ اس سے الحاد و تحریف کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ
ایک طرف تمام امت مسلمہ نے حجیت حدیث کو ضروریات دین میں شمار کیا ہے۔
چنانچہ شرح تحریر میں ہے :

”سنت خواہ مفید فرض ہو یا واجب یا فرض و واجب کے علاوہ
کیلئے مفید ہو اس کا دینی حجت ہونا دین اسلام کا ایسا بدیہی اور واضح
مسئلہ ہے کہ جس کو ذرا بھی عقل و تمیز ہوگی، عورتوں اور بچوں تک
بھی وہ جانتا ہے کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ نبی برحق اللہ تعالیٰ کی
جانب سے جو خبر بھی دے گا وہ اس میں قطعاً صادق ہوگا“ اور اس کی
پیروی لازم ہوگی۔“
(تقریر التحریر جلد ۳ ص ۲۲)

اور دوسری طرف ہر دور کے ملاحدہ نے اپنے اپنے رنگ میں احادیث نبویہ کو

اشارہ بنایا، اور ان میں طرح طرح سے کٹرے نکالنے کی کوششیں کیں، یہ سلسلہ طوارج سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے، ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ارباب فکر و فکر نے اپنے ”خلق اسلام“ کے نقطہ نظر سے تمام احادیث نبویہ کو یکسر زمانہ مابعد کی پیداوار، اور ”خلق اسلام“ کے نقطہ نظر سے تمام احادیث نبویہ کو یکسر زمانہ مابعد کی پیداوار، اور حضرات محدثین کی ”تاریخ سازی“ قرار دے کر زمانہ گزشتہ کے تمام ملاحظہ کا قرض ادا کر دیا، ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے نظریہ ”خلق اسلام“ کی زد سے نہ احادیث متواترہ کو بچ نکلنے کی گنجائش دی گئی نہ احادیث مشہورہ کو، صحیحین کی احادیث کو معاف کیا گیا، نہ دیگر احادیث صحیحہ کو قابل معافی تصور کیا گیا، احادیث نبوت کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے طوفانی طومار کے کچھ اجزا نقل کرنے سے پہلے لسان الحکمت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ایک حکیمانہ فقرہ نقل کر دینا ضروری ہوگا، تاکہ اس ادارہ کے معاملہ میں ناظرین کو صحیح فیصلہ کا موقع مل سکے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

”اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہا من النقل المرفوع صحیح بالقطع، وانہما متواتران الی مصنفیہما وانہ کل من ینون امرہما فہو مبتدع غیر سبیل المومنین۔“
(حجتہ اللہ ص ۱۳۴ ج ۱ میزیہ)

ترجمہ: ”صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ ان دونوں میں جس قدر متصل مرفوع حدیثیں ہیں وہ قطعاً صحیح ہیں اور یہ کہ یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفوں تک متواتر ہیں، اور یہ کہ جو شخص ان کے مرتبہ کو بے وزن کرنا چاہتا ہے وہ

مبتدع ہے، اہل ایمان کے راستہ سے ہٹ کر کسی دوسرے راستہ پر چل رہا ہے۔“

اب حدیث نبوی کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی کا نقطہ فکر ملاحظہ فرمائیے، یہ طویل عبارتوں کا خلاصہ ہوگا :

۱۔۔۔۔۔ دوسری صدی تک :

الف ” : دوسری صدی کی تصانیف کا سلسلہ روایت صحابہ، تابعین اور تبع تابعین پر ختم ہو جاتا تھا لیکن جوں جوں وقت گزر تا گیا حدیث کی تحریک نے داخلی تقاضے سے مجبور ہو کر سلسلہ روایت پیچھے ہٹاتے ہٹاتے ذات رسالت مآب تک پہنچا دیا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۵)

ب ” : دوسری صدی کے وسط تک زمانہ مابعد کے پیدا کردہ اکثر مذہبی عقائد اور قیسی آراء آنحضرت کی طرف منسوب کئے جانے لگے تھے۔“

(حوالہ بالا)

۲۔۔۔۔۔ اخبار احاد :

”امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ایسی تمام حدیثوں کو رد کر دیتے تھے جنہیں بعد میں اخبار احاد سے موسوم کیا گیا۔ سبحانک ہذا بہتان عظیم۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۶)

۳۔۔۔۔۔ احادیث میں احتیاط کے باوجود :

”امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی تمام احتیاطی تدابیر کے

باوجود اس زمانہ تک متعدد احادیث کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ملایا جا چکا تھا۔ مثلاً (اس کے بعد کتاب الآثار کی چار حدیثیں مثالی ذکر کی گئی ہیں)۔“

(فکرو نظر جلد ۱ ص ۱۸)

۴۔۔۔۔۔ دوسری صدی کے دوران :

”دوسری صدی کے دوران ذخیرہ احادیث میں برابر اضافہ

ہوتا رہا۔“

(فکرو نظر جلد ۱ ص ۵)

۵۔۔۔۔۔ حدیث کا فطری تقاضا :

”تحریک حدیث جس کا ایک اہم سنگ میل فقہ اور فقہی احادیث کے دائرہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی جدوجہد تھی، کی فطرت متقاضی تھی کہ حدیث میں مسلسل توسیع ہوتی رہے اور نئے حالات کے پیدا کردہ تازہ مسائل سے نمٹنے کے لئے نئی احادیث منظر عام پر آتی جائیں“۔ گویا جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے اس کے لئے کوئی حدیث گھر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے۔ یہ فریضہ تھا جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین انجام دے رہے تھے۔ معاذ اللہ۔ ناقل :-

(فکرو نظر جلد ۱ ص ۱۳)

۶۔۔۔۔۔ بہتان عظیم :

”قدما محدثین خود تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اخلاقی امثال، پند و نصائح اور جوامع الکلم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ خواہ یہ انتساب درست ہو یا نا درست، البتہ فقہ و عقائد کی احادیث کے متعلق سلسلہ روایت کا پوری صحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ اب قابل غور یہ ہے کہ ترک صحت کے اصول کو کسی سطح پر بھی تسلیم کر لیا جائے، تو اسے کسی خاص دائرہ تک محدود رکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہو گا۔“ (حاصل یہ کہ اخلاقی امثال، پند و نصائح اور جوامع الکلم کی احادیث تو معاذ اللہ خود محدثین کے اقرار سے مشکوک ہیں، اور فقہ و عقائد کی احادیث قابل غور“ تکنیک سے مشکوک ہو گئیں۔ لہذا تمام احادیث کو زمانہ ما بعد کی مخلوق فرض کرنا چاہئے)۔

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۵)

۷۔۔۔۔۔ سلسلہ سند کا اضافہ :

”احادیث کا بیشتر حصہ درحقیقت قرون اولیٰ کی ذاتی اجتہادی انفرادی آراء“ سنت جاریہ“ ہیں۔ جن کو حدیث کے آئینے میں عکس پذیر کر دیا گیا، اور اس میں راویوں کے سلسلہ اسناد کا اضافہ ہو گیا۔ (یعنی جس طرح معاذ اللہ احادیث کی فرضی نسبت ذات محمدی کی طرف کردی جاتی تھی۔ اسی طرح راویوں کا فرضی سلسلہ سند بھی اس پر آویزاں کر دیا جاتا تھا)۔“ (فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۳)

۸۔۔۔۔۔ موید حدیث احادیث :

”سب سے پہلی حدیث جو حدیث کی تائید میں ملتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے، یعنی نصر اللہ عبدا سمع مقالتي“ الحدیث۔ ایک اور روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے ”لا الفین احدکم متکا علی اریکنه“ آخر میں ایک اور حدیث آتی ہے۔ ”حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج وحدثوا عنی ولا تكتبوا علی“ یہ تینوں حدیثیں آنحضرت کے ارشاد کی حیثیت سے قابل قبول نہیں، بلکہ انتہائی مشکوک قرار پاتی ہیں۔ (اس لئے فرض کرنا چاہئے کہ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یا ان کے کسی استاذ نے بنائی ہوں گی)۔

(فکرو نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۶ تا ۱۹)

۹۔۔۔۔۔ پیشین گوئی والی احادیث :

”یہاں ہم ایک عام اصول پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جس حدیث میں آئندہ واقعات کے بارے میں صراحتاً یا ضمناً پیش گوئی کی گئی ہو۔ یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سمجھا جائے گا۔ کہ وہ زمانہ مابعد میں ظہور پذیر ہوئی جب کہ اس حدیث میں ذکر کردہ واقعہ پیش آیا۔“

(فکرو نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۵-۱۶)

۱۰۔۔۔۔۔ تاریخ سازی :

”حدیث کا کام تاریخ نویسی نہیں بلکہ ”تاریخ سازی“ بن گیا

تھا جس کے نتیجہ میں معاصرانہ واقعات کو بشکل حدیث ماضی کی طرف پھر دیا جانے لگا۔“

(فکرو نظر جلد ۱ اش ۵ ص ۱۷)

۱۱۔۔۔۔۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی بصیرت اور پیش گوئی والی احادیث میں کوئی میل نہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمانانہ بصیرت اور منزل من اللہ اخلاقی نظام کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے والی عمیق تاریخی بصیرت برحق، لیکن اس عظیم تاریخی بصیرت اور اس سے پیدا ہونے والی پر عزم قوت فیصلہ میں اور اس قسم کی پیہنگوئی میں جو مثلاً مسلمہ کذاب کے خروج یا معتزلہ، خوارج اور شیعہ فرقوں کے ظہور سے متعلق حدیثوں میں پائی جاتی ہے، زمین و آسمان کا فرق ہے“ (بالکل یہی فرق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ادارہ تحقیقات کے تاریخی بصیرت کے تصور میں۔ اور اسلام کے پیش کردہ تصور نبوت میں بھی پایا جاتا ہے۔ ناقل)۔

(فکرو نظر جلد ۱ اش ۵ ص ۱۷)

۱۲۔۔۔۔۔ ضمنی پیش گوئی والی احادیث:

”لیکن پیش گوئی والی احادیث سے مراد صرف وہ احادیث نہیں جن میں مراحثاً کوئی پیشین گوئی ہو، بلکہ وہ حدیثیں بھی مراد ہیں جن میں بالواسطہ یا ضمناً کوئی پیشین گوئی کی گئی ہو۔ مثلاً یہ

حدیث ”القدریہ مجوس ہذا الامۃ“

(حوالہ بالا)

۱۳۔۔۔۔۔ احادیث اجماع :

”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع کے اصل شرعی ہونے پر دو حدیثیں پیش کی ہیں۔ ”ثلاث لا یغل علیہین قلب مسلم“ الحدیث اور ”اکرموا اصحابی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم“ والی حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پیشرو تصور اجماع سے خالی نہ تھے۔ لیکن ان کے زمانہ تک یہ بالکل فطری طور پر نشو و نما پاتا رہا۔ اور اس پر حجت لانے کی کوشش اس مرحلہ پر عمل میں نہیں آئی تھی۔ حتیٰ کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اجماع کے زبردست حامی ہونے کے باوجود کوئی حدیث نبوی پیش نہیں کرتے، متقدمین فقہاء کا اجماع پر اصرار کے باوجود کوئی حدیث پیش نہ کرنا حدیث کی نوعیت اور اس کی نشو و نما پر ایک معنی خیز تبصرہ ہے۔“ (اس لئے فرض کرنا چاہئے کہ احادیث اجماع بھی معاذ اللہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف کیں، یا ان کے کسی معاصر نے۔ ناقل)۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۵ تا ۱۹)

۱۴۔۔۔۔۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد :

”امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اجماع کی حمایت میں فرمایا

تھا۔ ونعلم ان عامتهم لا يجتمع على خلاف لسنة رسول
الله ولا على خطأ انشاء الله۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے
بعد جب حدیث کی اشاعت اور زیادہ کثرت سے ہونے لگی تو ان
کا یہ بیان ایک حدیث بن گیا اور مسند امام احمد بن حنبل، جامع
ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں لفظی رد و بدل کے ساتھ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو گیا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۵ ص ۲۲)

۱۵۔ — بعد کی صدیوں میں :

”ان ہی بعد کی صدیوں میں، یہ اللہ علی الجماعۃ“ والی حدیث
بہت مشہور ہوئی، اس تصور کو بعض دوسری حدیثوں میں بھی ظاہر
کیا گیا ہے۔ (الغرض اس مضمون کی تمام احادیث امام شافعی رحمۃ
اللہ علیہ اور ان کے بعد کے اکابر محدثین کی بناوٹ ہیں)۔ بریں
عقل و دانش نباید گریست۔ ناقل)۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۵ ص ۲۳)

۱۶: لغت اور حدیث کے مجموعے :

”لغت کی نہی تلی تعریف اگر احادیث کے مجموعوں میں راہ نہ
پاتی تو مقام حیرت تھا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۵ ص ۷۷)

۱۷۔ — لغت کی جنتی اور حدیث کے بل :

”لغت کی جنتی کے ذریعہ سے غیر قطعیت کے بل نکل

جانے کے بعد سیوطی کی جامع صغیر میں ”کل قرض جرم منفعۃ فہو ربا“ کی صورت میں یہ حدیث موجود ہے (اور اس عرصے میں عمل ارتقاء نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا، اور حضرت علی سے مروی ہو کر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بن گیا۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۷۸)

۱۸۔۔۔۔۔ فقہی احادیث اور ارتقائی عمل :

”فقہی احادیث میں ارتقائی عمل نے ان کے استناد کو مشکوک اور مشتبہ بنا دیا ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۸۷)

۱۹۔۔۔۔۔ احادیث الفتن :

”حضرت عثمان کے بعد کی سیاسی جنگوں اور کلامی بحثوں کے نتیجے میں اس قسم کی احادیث کا نشو و نما ہوا جن میں پیش گوئی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس قسم کی احادیث کو احادیث الفتن کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔“ (ان فرضی احادیث الفتن کو بنانے والے اس وقت کے صحابہ یا اکابر تابعین ہی ہو سکتے ہیں۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۸)

۲۰۔۔۔۔۔ حاوی حدیثیں :

”ان احادیث کی وجہ جواز کے لئے ایسی احادیث کی اشاعت کی گئی جو اس نوع کی تمام احادیث پر حاوی ہیں۔ مثلاً حضرت حذیفہ

کی یہ متفق علیہ روایت : قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما ما ترک شیئا الحدیث۔
(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۸)

۲۱۔۔۔۔۔ مثالی نمونہ :

”حدیث فتن کا ایک مثالی نمونہ بخاری و مسلم کی حسب ذیل روایت جو ان ہی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے :
: کان الناس یسئلون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر الحدیث۔ ان دونوں حدیثوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعی ارشادات کی حیثیت سے تسلیم کرنا ممکن نہیں۔“
(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۹ تا ۱۱)

۲۲۔۔۔۔۔ احادیث اجماع :

”اجماع (تمسک بالجماعت) سے متعلقہ احادیث بھی اسی زمانہ کے شدید سیاسی تقاضے پر مبنی ہیں۔“
(فکر و نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۱۱)

۲۳۔۔۔۔۔ خارجیت کا توڑ :

”خارجیت کی مخالف احادیث کی نمائندہ حدیث جو خارجیوں کی باغیانہ فطرت کے بالمقابل مکمل انفعالی سکون پسندی اور دنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتی ہے۔ صحیح مسلم کی یہ حدیث ہے : عن ابی بکرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ستكون فتن القاعد فيها خير من القائم الحديث۔ یہ حدیث خارجیوں کی فعالیت اور سیاسی امور سے ان کی دلچسپی کا توڑ کرتی ہے۔ (یہ بھی صحابہ یا اکابر تابعین میں سے کسی نے بنائی ہوگی، کیونکہ خارجی فتنہ کا زور اسی زمانہ میں تھا۔ ناقل)۔

(حوالہ بالا ص ۱۲)

۲۴۔۔۔ عقیدہ اجماع باطل :

”بعض اوقات ایسی احادیث جن میں دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی تعلیم دی گئی ہے، عقیدہ اجماع کو باطل کر دیتی ہیں۔ مثلاً ترمذی شریف میں عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی صحیح حدیث :
کیف بک اذا بقیت فی حشالۃ من الناس“

(حوالہ بالا)

۲۵۔۔۔ خارجی الاصل :

”لیکن سنیوں کی تمام احادیث یکسر مخالف خوارج نہیں۔ امام احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت کردہ ایک حدیث جس میں ایک ایسے سیاسی عقیدہ کا نفوذ پایا جاتا ہے جو بلاشبہ خارجی الاصل ہے : ”اوصیکم بتقوی اللہ الحدیث“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۱۳)

۲۶۔۔۔ مرجئیہ عقاید کا بہترین نمونہ :

”صحیحین کی مشہور و معروف حدیث ”وان زنی وان سرق“ جو خوارج کے عقیدہ تکفیر با کبار کے مقابلہ میں بنائی

گئی۔ مرجئیہ عقائد کا بہترین نمونہ ہے۔“

(حوالہ بالا صفحہ ۱۵، ۱۶)

۲۷۔۔۔۔۔ اعتدال پسندانہ خیال :

”مندرجہ بالا حدیث سے اس بات کا قوی احتمال تھا کہ بعض طبائع کی اخلاقی حس کو دھچکا لگتا اس کی جزوی ناگواری کو رفع کرنے کے لئے ابو داؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں نسبتاً اعتدال پسندانہ خیال پیش کیا گیا : عن ابی ہریرۃ اذا زنی العبد خرج منه الايمان الحديث صحیحین میں اس مضمون کی حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بہ الفاظ ذیل مروی ہے :

(جلد ۱ ص ۶۷)

۲۸۔۔۔۔۔ اعتزال کی مخالف احادیث

”معتزلہ چونکہ خوارج کے وارث تھے، نیز مذہبی ذہنیت کے لئے ”معتزلی عقلیت“ انسانیت پرستی کی بھدی شکل تھی۔ ”غالباً“ ان ہی دو خطرات کے پیش نظر کثیر تعداد میں ایسی احادیث کی تعلیم دی جانے لگی جن میں ارادہ، نیت اور عمل تینوں سطحوں پر جبر کی تعلیم دی گئی، جبر کی تعلیم پر مشتمل حدیث کی نسبتاً ابتدائی صورت کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا گیا۔ اس نوع کی احادیث میں چند در چند اضافہ ہوتا گیا۔ مثلاً مسند احمد کی یہ حدیث القدیریہ مجوس ہذہ الامۃ اس میں فلسفیانہ استدلال کا ایک ایسا

پچیدہ طرز اختیار کیا گیا ہے، جسے ساتویں صدی کے عربوں (صحابہ) کی طرف منسوب کرنا نادرست ہوگا، ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: "لاتجالسوا اهل القدر ولا تفاتحوهم۔ ابو داؤد"

(جلد ۱ ش ۶ ص ۱۵-۱۹)

”مسلم اور بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ”ان اللہ کتب علی ابن آدم حفظہ من الزنی“ اس زمرہ میں شامل ہے۔“

(حوالہ بالا ص ۱۹)

۲۹۔۔۔۔۔ احادیث تقدیر :

”بہت سی احادیث میں بڑے تعین اور بڑی وضاحت کے ساتھ روحوں کی تخلیق کے وقت بعض کے لئے جنت اور بعض کے لئے دوزخ کی تقدیر اور بعض احادیث میں انسانی سعادت و شقاوت کے بارے میں خدا کی بے پرواہی کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً بخاری و مسلم میں عبداللہ بن مسعود کی حدیث : حدثنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو الصادق الصدوق ان خلق احدکم۔ الحدیث۔“

(جلد ۱ ش ۶ ص ۲۰)

۳۰۔۔۔۔۔ خلاف جبریت :

” اوپر کی بحث سے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ احادیث صرف

جبریت، تقدیر، پر مشتمل ہیں، اہل سنت کی بعض احادیث، اگرچہ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اس مسئلہ پر بالکل مختلف زاویے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً بخاری و مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ”کل مولود یولد علی الفطرۃ“ یا ترمذی ابن ماجہ اور احمد بن حنبل کی روایت کردہ ”ہی من قدر اللہ“ والی حدیث یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ”نعم من قدر اللہ الی قدر اللہ“ اس دوسری قسم کی حدیث کے باوجود، ”جو جبر کی احادیث کے بالمقابل ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش سے عبارت تھی“ جبری احادیث سے اہل سنت بہت زیادہ متاثر ہوتے۔ (یعنی عقیدہ تقدیر کے قائل رہے۔ ناقل)۔“

(جلد ۱ ص ۶ ص ۲۲)

۳۱۔۔۔۔۔ احادیث تصوف :

”تصوف کی موافقت اور مخالفت میں روایت شدہ احادیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ اہل سنت ایک درمیانی راہ اختیار کرنے اور انتہا پسندی کے رجحانات کو بڑھنے سے روکنے میں کوشاں تھے۔ دگویا اسی کوشش کے سلسلہ میں یہ احادیث بنائی گئیں۔ ناقل)۔“

(حوالہ بالا)

۳۲۔۔۔۔۔ صوفی تحریک کا اثر و نفوذ اور اہل سنت کا

جذبہ باہمہ :

”صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں یہ حدیث جو درج ہے:

قیل یا رسول اللہ ای الناس افضل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومن یجاہد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ الحدیث۔ اس سے اس امر کا نمایاں ثبوت ملتا ہے کہ صوفی تحریک کا اثر و نفوذ کس قدر بڑھ گیا تھا اور اہل سنت میں باہمہ ہونے کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا۔

(گویا فرض کرنا چاہئے کہ بخاری کی یہ حدیث صوفی تحریک کے اثر و نفوذ اور اہل سنت کے ”جذبہ باہمہ“ کی پیداوار ہے۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۲۳)

۳۳۔۔۔۔۔ چبھتی ہوئی مثال :

”گوشہ نشینی اور ترک دنیا کے رجحان کے خلاف احادیث بھی ہمیں ملتی ہیں، جو تاثری قوت میں پہلی قسم کی احادیث سے کسی طرح کم نہیں، صوفیاء کے نظریہ توکل کی انتہائی تعبیرات کے برعکس کسب معاش کی احادیث، اور غالی زہد و تقشف کی مذمت کی احادیث اپنی شہرت کی وجہ سے محتاج مثال نہیں۔ (یہ تمام بھی اہل سنت کے جذبہ اعتدال کی پیداوار ہیں۔) البتہ اس مضمون کی چبھتی ہوئی مثال یہ حدیث ہے۔ ”رہبانۃ هذه الامة الجهاد فی سبیل اللہ عز و جل۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۲۴)

۳۴۔۔۔۔۔ انمل، بے جوڑ، مصنوعی :

”نسائی شریف کی یہ حدیث ”حب الی من الدنیا

النساء والطيب وقرة عینی فی الصلوة“ اس کے تینوں عناصر الگ الگ سنت نبوی کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن دنیوی مسرت اور دینی عبادت کے دو مختلف النوع اقدار کو ایک ہی سانس میں جس ائمل اور بے جوڑ طریقے سے مربوط کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک مصنوعی ترکیب ہے۔ جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہرگز منسوب نہیں کیا جاسکتا، یقیناً اس سے صوفیاء کی غیر مو تلف روحانیت کو نشانہ بنانا تھا اور بس۔“

(فکر و نظر جلد ۱ اش ۶ ص ۲۴)

۳۵۔۔۔۔۔ اصولی احادیث :

”ہم نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ان احادیث کی ہیں جنہیں ہم ”اصولی“ کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ احادیث جن پر مبادیات دین کی ساری عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ اگر اجماع اور حدیث جیسے بنیادی اصولوں کے بارے میں احادیث تاریخی طور پر غیر صحیح ثابت ہو جائیں تو دوسری بیشتر احادیث کی صحت یقیناً معرض خطر میں پڑ جاتی ہے (بلکہ بلفظ صحیح اسلام کی بنیاد اکھڑ جانے سے خود اسلام ہی کا قصر بلند مسمار ہو کر رہ جاتا ہے، اور یہی ادارہ تحقیقات اسلامی کے فتنہ خلق اسلام کا مقصد ازلی اور ہدف اصلی ہے۔ اور یہی درس حریت ادارہ کے مفکرین نے اپنے مغربی آقاؤں سے سیکھا ہے۔ ناقل)۔“

(فکر و نظر جلد ۱ اش ۷ ص ۱۰)

۳۶۔ اکثر و بیشتر کا گورکھ دھندا

”ہم نے یہاں لفظ ”بیشتر“ اور پہلے ”اکثر و بیشتر“ استعمال کیا، ہم نے تمام احادیث پر شک نہیں کیا، بیشتر اور تمام کا یہ فرق اہم ہے، لیکن صرف نظریاتی حیثیت سے، فی الحال ہمارے پاس اس فرق کی تعیین کے وسائل نہیں (لہذا تمام احادیث کو مشکوک فرض کرتے ہوئے۔ ناقل) ہمیں اب ہر حدیث کو (خواہ وہ متواتر ہو یا مستفیض، صحیحین کی ہو یا ان کے علاوہ کی، اس کی صحت پر امت کا اتفاق ہو یا نہ ہو۔ ناقل) فرداً جانچنا ہوگا اور تاریخی لحاظ سے اس کی صحت کو پرکھنا ہوگا۔۔۔۔۔“ (فکر و نظر جلد اش ۷، ص ۱۰)

۳۷۔ صحت اسناد حجت نہیں بلکہ کانتانی اور شاخت کی بحثیں اس کا فیصلہ کریں گی کہ وہ حجت ہے یا نہیں

”علم الرجال مسلمانوں کے عظیم کارنامہ کی حیثیت سے مسلم، محدثین کا اسنادی صحت اور صحیح اور غیر صحیح کے چھاننے میں انتھک محنت کرنا ہم پر بہت بڑے احسان کی حیثیت سے بسر و چشم، الغرض اسناد کی منفی حیثیت تو مسلم، لیکن اسے مثبت قطعی حجت قرار نہیں دیا جاسکتا، مانا کہ زید، مثلاً امام شافعی، ایک ثقہ راوی ہے، اور بکر مثلاً امام مالک بھی، اور یہ بھی تسلیم کہ زید کی بکر سے ملاقات ہوئی تھی، لیکن یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ زید نے بکر سے فلاں حدیث ضروری ہی روایت کی تھی۔“ (سبحان اللہ کیا شان تحقیق ہے، اگر زید نے بلا تحقیق بکر سے روایت کر ڈالی تو وہ ثقہ کیسے رہا۔ ناقل)

”اسناد کے مثبت قطعی حجت ہونے کے خلاف سب سے ”قوی اور قاطع دلیل“ یہ ہے کہ خود اسناد کا استعمال پہلی صدی ہجری کے اختتام سے شروع ہوا۔“ (اس قوی اور قاطع دلیل کی سند؟ ناقل)

”نتیجہ یہ کہ مثال کے طور پر بخاری اور مسلم کی پیشین گوئی والی حدیثوں کے اسناد

خواہ کیسے ہی قوی کیوں نہ ہوں ہم ان کی صحت کو قبول نہیں کر سکتے۔“ (ورنہ فتنہ ”خلق اسلام“ کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ ناقل) کیونکہ ان کی داخلی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ (ان داخلی شہادتوں کا خلاصہ یہی تو ہے، کہ حضور ﷺ اور عقل الہی ان عیشت گوئیوں کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس لئے فرض کرنا چاہئے، کہ یہ احادیث زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں جن کے ذریعہ سے معاصرانہ واقعات کا رخ یوں ہی تاریخ ساز محدثین نے ماضی کی طرف موڑ دیا، معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی جان سکتا ہے، کہ یہ شہادتیں اپنے اندر کتنا وزن رکھتی ہیں جن کی بنا پر تمام احادیث متواترہ، مشہورہ اور صحیحہ کو رد کیا جاتا ہے، اور اکابر ائمہ کو ”تاریخ ساز“ کا مقدس لقب دیا جاتا ہے۔ ناقل)

(نوٹ) ”اسناد پر دو نامور مستشرقین کاسستانی اور شاخت کی بحثیں قابل توجہ ہیں۔“ (جی ہاں دین اسلام کی صحیح بصیرت ”نامور مستشرقین“ کی بحثوں کو قابل توجہ قرار دیئے بغیر حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اسلام کی تعریف سے لے کر اس کے تمام اصول و فروع کے لئے ان ہی ”نامور مستشرقین“ کی زلہ ربائی فرض ہے، نعوذ باللہ من سوء الفہم۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد اش ۷ ص ۱۰)

۳۸۔۔۔ اساطیر الاولین

”در حقیقت بیشتر (بلکہ گزشتہ تحقیق کے پیش نظر تمام) احادیث مجموعہ ہیں ان کہاوتوں جیسے مقولوں کا جن کی تراش خراش خود قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائی مگر انہیں رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔“ (قال الذین کفرو ان هذا الاساطیر الاولین۔ ناقل)۔

۳۹۔۔۔ اجتماع نقیضین

”یہ نسبت سراسر بے بنیاد نہ تھی، اگرچہ ان مقولوں میں کہاوتوں کا اسلوب پایا

”الغرض یہ احادیث ایک وسیع الذیل اور عظیم المرتبت شرح ہیں سنت نبوی کی جس کے شارح قرون اولیٰ کے مسلمان ہیں۔“ (لیکن یہ شرح اپنی وسعت اور عظمت کے باوجود صحت سے محروم، اور شارحین کرام غیر صحیح روایات ذات نبوی پر تھوپنے والے۔ ناقل۔)۔“

چنانچہ سنت نبوی پر مبنی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ سلف صالحین کے بصائر و حکم کا مجموعہ بھی ہیں۔ (لیکن اس مجموعہ ”بصائر و حکم“ میں جگہ جگہ کیڑے بھی موجود ہیں، جن کو صاف کرنے میں ادارہ تحقیقات کے علمبردار خود اسلام ہی کا صفایا کر رہے ہیں۔ ناقل)۔“

۴۰۔۔۔۔۔ مرا نہیں اکڑا ہے

”اگرچہ ہم مجموعی طور پر احادیث کی تاریخی صحت کو مشکوک جانتے ہیں، لیکن ہم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ یہ جھوٹی یا جعلی ہیں۔“ (گویا مرا نہیں اکڑا ہے، لیکن ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے فتنہ ”خلق اسلام“ کی دعا سے یہ قرض بھی ادا ہو جائے گا۔ ناقل۔)

۴۱۔۔۔۔۔ تاریخ محکمہ جنتی

”حدیث عائشہؓ تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانا بنت
ست الحدیث۔ یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور
سری تمام کتب حدیث میں (مختلف اسانید کے ساتھ۔ ناقل) مروی ہے، لیکن چونکہ

تاریخی جنتی اس کی تائید نہیں کرتی اس لئے یہ روایت کسی طرح قابل قبول نہیں ٹھہرتی۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۹ ص ۳۳ و مابعد)

۴۲۔ ایمان سے محرومی

”ابن ماجہ کی حدیث عمرؓ ان آخر ما نزلت آية الربا“ الحدیث، اس حدیث کو حدیث صحیح سمجھنے والا نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان صحیح رکھتا ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، نہ آپ کی رسالت پر، اور روایت پرستی نے اس کی بصارت و بصیرت کی آنکھوں پر ”رواۃ پرستی“ کی پٹی باندھ دی ہے کہ ان کو اس ”افتراء حدیث“ کے سوا کچھ نہیں سوچتا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۶۴)

۴۳۔ کوفے کی نکسال

”بخاری شریف کی حدیث ابن عباس آخر آية نزلت على رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم الربوایہ حدیث کوفے کی نکسال میں گھڑی گئی۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۷۱)

۴۴۔ بصرہ کی نکسال

”غرض ربوا کے متعلق حدیثوں میں جو اختلاف واضطراب ہے، اس پر اگر کوئی معترض ہو تو اس کی زبان بندی کے لئے بطور عذر لنگ کے یہ بہتان عظیم حضرت عمر فاروق اعظم پر باندھا گیا (استغفر اللہ۔ ناقل) یہ بہتان بصرے کی نکسال میں گھرا گیا۔“ (حوالہ بالا)

۴۵۔۔۔ رواۃ پرستی اور بخاری میں کذب صریح

”یہ سمجھنا کہ صحیح بخاری کی ہر حدیث صحیح ہے، غایت روایت پرستی ہے، صحیح بخاری میں تو ”کذب صریح“ تک موجود ہے، جس سے ہر بخاری کا پڑھنے والا واقف ہے، زبان سے اقرار نہ کرے یہ اور بات ہے۔“ (لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۷۵)

۴۶۔۔۔ کتب صحاح چولہے میں

”صحاح تک کی ہر کتاب میں قرآن مجید کی محفوظیت ولا ریبیت اور خلق عظیم نبوی پر حرف لانے والی احادیث پاکر ان کتابوں کو پھاڑ ڈالنے اور چولہے میں بھونکنے کو جی چاہتا ہے۔“ (یریدون لیطفوا نور اللہ بافواہم واللہ متم نورہ

ولو کرہ الکافرون۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۲۷)

۴۷۔۔۔ بخاری، نسائی، ترمذی

”ایسی گمراہ کن حدیثیں منافقین نے ان کتابوں میں داخل کر دیں، جس طرح بخاری میں جمع قرآن کا پورا باب بنا کر داخل کر دیا، اور مختلف مقامات پر اس کی حدیثیں شہو نس دیں، یہی حال ترمذی، نسائی کا بھی کیا۔“ (یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ کتابیں اپنی اصل حالت پر ہوں جیسا کہ ان کا تو اتر خود اس کا شاہد ہے، مگر ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ”خالقین اسلام“ پر الحادی صغراء کا چونکہ غلبہ ہے اس لئے انہیں قند، زہر ہلاہل نظر آتا ہے۔ ناقل)

(حوالہ بالا ص ۲۷۳)

یہ ہیں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ڈاکٹروں، پروفیسروں اور ارباب فکر و نظر کے الحادی نظریات، جن کا حاصل یہ ہے کہ احادیث بالکل کیہ مشکوک، ناقابل اعتبار، جعلی

اور زمانہ مابعد کی پیداوار، اور اسلام قرون وسطیٰ کی مخلوق۔

(۶)

امت مسلمہ اور اجماع امت

دین اسلام کی تیسری بنیاد ”اجماع امت“ ہے، اجماع امت کی دین اسلام میں کیا اہمیت ہے؟ اس پر غور کرنے کے لئے ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ہوگی کہ دین اسلام خدا تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہے، اور قیامت تک کے لئے یہ تمام انسانیت پر حجت قائمہ ہے، اس لئے حکمت الہیہ کا تقاضا ہے کہ یہ قیامت تک کے لئے صحیح حالت پر محفوظ رہے، اور جن واسطوں سے یہ نقل ہوتا ہم تک پہنچایا قیامت تک پہنچے گا، ان تمام درمیانی کڑیوں کو اس کی فہم اور حفاظت میں منزه عن الخطا تسلیم کئے بغیر نہ اس کی حفاظت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے، نہ اسے قیامت تک کے لئے حجت قائمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امت مسلمہ کے کسی دور نے اسلام کو صحیح نہیں سمجھا، یا یہ کہ اس کی حفاظت کا حق ادا نہیں کیا، یا کسی غیر اسلامی نظریہ کو اسلام بنا ڈالا، تو اس مفروضہ کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ دین اسلام کے تسلسل کا رشتہ ٹوٹ گیا، اور یہ بعد والوں کے لئے اللہ کی حجت نہ رہا، یہ نکتہ ہم پر واضح ہے تاہم اس کی تائید کے لئے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی شہادت پیش کی جاتی ہے، شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ آیت ”هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ“ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

این آیت حکم است در میان اہل سنت و اہل بدعت، خدائے تعالیٰ

ہدی و دین حق را بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نازل فرمود، ووے

صلی اللہ علیہ وسلم آں را صحابہ تبلیغ نمود و صحابہ آں معنی کہ مراد حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بود فمیدند و بقرن تابعین رسانیدند ثم و ثم۔

زیرا کہ ارادہ الہی نہ محض تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، و نہ خروج آنجناب از عمدہ تبلیغ، اگرچہ سامعان نہ فہمند، بلکہ مراد ظہور دین حق است قرنا بعد قرن۔

پس کیسکہ گوید کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین حق را صحابہ رسانیدند، لیکن ایشان معنی کہ مراد بود نہ فہمیدند، یا فہمیدند اما غرض نفسانی حامل شد ایشان را بر کتمان آں، وے مبتدع است۔“

(ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۷۵)

ترجمہ: ”یہ آیت اہل سنت اور اہل بدعت کے درمیان ”فیصلہ کن“ ہے، خدا تعالیٰ نے ہدایت اور دین حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صحابہ کرام تک پہنچایا، اور یہ امانت تابعین تک پہنچائی، اور تابعین نے تبع تابعین تک اور تبلیغ اور فہم کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، (اور بغیر کسی انقطاع کے قیامت تک چلتا رہے گا۔)

اس لئے کہ ارادہ الہی نہ تو محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، نہ یہ کہ آپ فریضہ تبلیغ سے سبکدوش ہو جائیں، خواہ سننے والے سمجھیں یا نہ سمجھیں بلکہ مراد الہی یہ تھی کہ ہر قرن میں دین حق کے ظہور اور غلبہ کا سلسلہ جاری رہے، لہذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق صحابہ کو پہنچادیا

تھا، لیکن صحابہؓ نے اسے نہیں سمجھا، یا انہوں نے سمجھ لیا تھا لیکن غرض نفسانی کی وجہ سے اسے چھپایا (یا) اسلامی تاریخ کے کسی دور کے متعلق کوئی شخص دین کو نہ سمجھنے یا ظاہر نہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔) وہ بدعتی ہے، (اور اہل ایمان کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔“)

اس سے واضح ہو گیا ہو گا کہ امت مسلمہ کی محفوظیت اور اعتماد کا مسئلہ محفوظیت اسلام کی فرع کو ”لا تجتمع امنی علی الضلالة“ میں بیان فرمایا گیا ہے، (یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی) گویا جس طرح حرکت اصالة کشتی کی صفت ہے، لیکن تبعا ”کشتی نشین“ بھی اس سے موصوف ہوتا ہے اسی طرح خطا سے محفوظ ہونا اصالة اسلام کی صفت ہے، اور تبعا اس صفت سے امت مسلمہ مشرف ہے، پس اسلام اور امت مسلمہ کے درمیان رشتہ ملازمت ہے۔

یہاں ایک باریک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ بعض دفعہ ایک ہی چیز ایک اعتبار سے مقدم ہوتی ہے، اور دوسرے اعتبار سے مؤخر ہوتی ہے، مثلاً سلسلہ انسانیت میں حضرت آدم علیہ السلام جد اول ہیں، لیکن اگر سلسلہ نسب کو بیان کیا جائے تو آدم علیہ السلام کا نام سب سے آخر میں آئے گا۔ (مثلاً زید بن بکر بن عمرو بن محمود الی آخر السلسلہ) یا مثلاً مسئلہ توحید اور مسئلہ رسالت میں سے اول الذکر اپنی ذات کے اعتبار سے مقدم ہے، اور تصدیق کے اعتبار سے مؤخر ہے، جب تک نبی کی تصدیق نہ کی جائے اور اس کی رسالت پر ایمان نہ لائے توحید کی تصدیق ممکن نہیں، اس لئے جب تک ہم تبع تابعین پر اعتماد نہ کریں گے تابعین پر اعتماد بے معنی ہوگا، اور جب تک تابعین پر اعتماد نہ کیا جائے، صحابہؓ پر اعتماد کی کوئی صورت نہیں، اور صحابہؓ پر اعتماد کے بغیر ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد ممکن نہیں، اور آپؐ پر اعتماد کئے بغیر وحی اور فرشتہ وحی پر اعتماد نہیں ہو سکتا اور وحی پر اعتماد کئے بغیر خدا تعالیٰ کی ذات

بابرکات پر اعتماد نہ ہوا، الغرض جس طرح باپ کے واسطے کے بغیر دادا کی طرف اور دادا کے بغیر پردادا کی طرف سلسلہ نسب میں انتساب غیر معقول ہی نہیں، ناممکن بھی ہے، اسی طرح پچھلی صدی پر اعتماد کئے بغیر پہلی صدی کی طرف زقند لگانے کی حماقت بھی غیر معقول ہوگی، اس سے یہ معلوم ہوا کہ دینی معاملات میں سلف پر اعتماد نہ کرنا، ان کی اغلاط کو اجاگر کرنا اور فرضی تاریخ کی ان پر سنگ باری کرنا الحاد کا اصل سرچشمہ ہے۔

اب تک کی چودہ صدیوں کا باہمی تعلق سلسلہ عدد کا سا سمجھو، سلسلہ اعداد کی ایک کڑی کو غائب کر دیا جائے تو سلسلہ کا آگے جاری رکھنا ناممکن ہے، ۲ اور ۴ میں سے ۳ کا عدد گم کر دینے کے بعد نہ ۲ سے ۴ تک پہنچا جاسکتا ہے نہ ۴ سے ۲ تک لوٹا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی چودہ صدیوں میں ایک لمحہ بھی اگر ایسا فرض کر لیا جائے جس میں اسلام کو نہیں سمجھا گیا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسلامی تاریخ کے اول حصہ و آخر حصہ میں ایسی وسیع خلیج واقع ہو گئی جسے پاٹنا ناممکن ہے، اب فرض کرنا ہوگا کہ نہ اسلام وسیع خلیج کو عبور کر کے آگے بڑھ سکا، نہ بعد کی امت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ قائم رکھ سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اتباع سبیل المؤمنین پر زور دیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ”خرق اجماع“ (اجماع امت کے توڑنے) کو امت مسلمہ کے ہر دور میں فطرت اسلامیہ کے خلاف قرار دیکر ”حجیت اجماع“ کو ضروریات دین میں شمار کیا گیا ہے، ”اجماع امت“ کے بارے میں موجودہ دور کے ملاحظہ نے جو مشاغبات اور ”ہزلیات“ کا طوفان کھڑا کیا ہے، یہ براہ راست ختم نبوت اور اسلامی تاریخ کے خلاف ایک سازش ہے۔

نام نہاد ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ”فتنہ خلق اسلام“ کی تمام تر بنیاد امت مسلمہ کو جھٹلانے پر رکھی گئی ہے، اس فتنہ کا اصل منبع یہی ہے کہ امت مسلمہ کی ایک دو صدیاں نہیں بلکہ اس کی پوری تاریخ ہی اسلام کی صحیح فہم و بصیرت سے محروم رہی،

اور چاہا جاتا ہے کہ تمام ضروریات دین اور مسلمات دینیہ کو روند کر فرضی تاریخ کی سیڑھی سے تمام مسائل اسلام کا فرضی ”شان نزول“ مرتب کیا جائے، پھر اس خود ساختہ شان نزول کو سامنے رکھ کر اسلام کے نئے کل پرزے تیار کئے جائیں۔ اب اجماع امت، امت مسلمہ، عقائد اسلامیہ اور اجماعی مسائل کے بارے میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ملاحظہ کے تصورات کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے :

اجماع امت

۱۔ ”ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اجماع کے بارے میں جو احادیث مروی ہیں ان کی تاریخی صحت ناقابل یقین ہے۔“
(فکر و نظر جلد ۱ ص ۷۷)

۲۔ ”اگر اس آیت سے (یا قرآن کی کسی دوسری آیت سے۔ ناقل) اجماع کا اصول مستنبط ہو سکتا تھا تو امام شافعیؒ وغیرہ اسے اجماع کی دلیل کے طور پر ضرور پیش کر چکے ہوتے۔“
(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۸)

۳۔ ”ایک اجماع کو بعد کا اجماع بدل سکتا ہے۔“ (حوالہ بالا)

۴۔ ”اجماع ایک رواجی امر ہے، نہ کہ نظریاتی شی، جس میں حق و باطل کی بحث ہو سکے، اجماع درست نادرست یا قدرے درست اور قدرے نادرست ہو سکتا ہے، اس کے حق یا ناحق ہونے کی بحث عبث ہے۔“ (حوالہ بالا)

۵۔ ”اجماع امت جو مروجہ عقاید کے حامیوں کے یہاں

”فقہی اصل الاصول“ ہے، کا تجزیہ کر کے معلوم کیا جائے کہ آیا اپنی موجودہ شکل میں یہ اصل الاصول شرک کے خطرہ سے کافی طور پر محفوظ ہے یا نہیں؟ اگر محفوظ نہیں ہے تو امت کے بری عن الخطا ہونے کے عقیدہ پر مزید کون سی تحدید عائد کی جائے۔“
(فکر و نظر جلد ۱ اش ۹ ص ۲۶)

۶۔ ”اسلامی قانون اور فقہ کی تعبیر و ترجمانی کے کام میں امت کی کلیت کو بحیثیت مجموعی اس کے کسی دوسرے گروہ یا طبقہ پر جس میں ”ماہرین“ بھی شامل ہیں، تفوق اور برتری حاصل ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ اش ۹ ص ۲۷)

۷۔ ”تلخ تجربات کی بنا پر ہمیں معلوم ہے علم اور راست کرداری ہمیشہ ایک جگہ جمع نہیں ہوتیں، نہ ان میں سے کوئی صفت دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔“ (لہذا فرض کرنا چاہئے کہ اہل علم چونکہ راست کرداری سے خالی ہوتے ہیں اس لئے ملاحدہ مغرب کے شاگردان عزیز کو قانون فقہ کی تعبیر و ترجمانی کا حق ملنا چاہئے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۱ اش ۹ ص ۲۸)

۸۔ ”قرآن و سنت کے ان احکام کے فہم کی صلاحیت کا معیار کیا ہے؟ اسے متعین کرنے کے لئے محض بعض مدرسوں کی سندوں کو معیار قرار دینے پر مسلمان نہ اب تک متفق ہوئے

ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔“ (لیکن ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹروں اور مفکروں کی بھیڑ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مغرب کے کاسہ لیس ہیں، ان پر تمام مسلمان شاید متفق ہو چکے ہیں اسی لئے ”قانون کی جامع کتاب“ مرتب کی جا رہی ہے۔ ناقل۔)

(حوالہ بالا)

۹۔۔۔۔۔ ”قرآن کی وہ آیت اور حدیث جس پر اجماع کا عقیدہ مبنی ہے، دونوں کا تعلق تمام امت مسلمہ سے من حیث الکُل ہے، کسی خاص گروہ یا طبقہ سے ہرگز نہیں اور ان کی رو سے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے فہم کی سند اور اس کا اختیار امت مسلمہ کو من حیث الکُل مل جاتا ہے بلکہ ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تاویل کا اہل کون ہے، اور کون نہیں، اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک انتخابی بنیاد مستنبط کی جائے، امت مسلمہ فوراً اس امر کا انتخاب کے ذریعہ فیصلہ کرے کہ اس فقہی تعبیر کے اہل کون ہیں، تب ہی اہل رائے کے اجماع کے عامتہ المسلمین کے ساتھ ارتباط کا کوئی ٹھوس اور قابل عمل حل نکل سکے گا۔“

(نکر و نظر جلد ۱ ص ۹)

۱۰۔۔۔۔۔ ”اسلامی طریق انتخاب کی بنیاد مسجد پر ہے جو مسلمانوں کا ابتدائی اور اعلیٰ ترین انتخابی حلقہ ہے، جس میں اشخاص کی سیرت و کردار کی جانچ پڑتال ہوتی ہے، اور اسلامی علم پر زور دیا جاتا ہے۔“

(حوالہ بالا)

(۷) اہل حق سلف صالحین

۱۔ شدید تفکر و تعمق

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دار فانی سے تشریف لے جانے کے تقریباً ایک سو سال بعد، اس اخلاقی عملی رجحان کی جگہ شدید تفکر و تعمق نے لے لی۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کیونکہ ہر مذہب پر ایسا دور آتا ہے، جب کہ اس کا عالمی نظریہ اس کے ماننے والوں کے صرف اعمال میں متضمن نہیں رہتا بلکہ ان کی بنیاد پر عقائد کی تشکیل بھی ہوتی ہے۔“ (گویا جو کچھ ہر مذہب پر گزری وہی کچھ اسلام پر بھی گزری۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۰)

۲۔ غلو اور تشدد

”لیکن افسوسناک بات یہ ہوئی کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے دوران اسلام کے فکری ارتقاء میں ایک مقام ایسا آگیا جہاں معتزلہ اور ان کے مخالفین (اہل سنت۔ ناقل) دونوں فریقوں نے اپنی اپنی جگہ تجاذب اور تناؤ کے اس اصول کو یکسر فراموش کر دیا جس پر اخلاق کی عمارت کے قیام کا انحصار ہے اور جس کی قرآن نے بہ تاکید تعلیم دی ہے ان دونوں نے

((فکر و نظر جلد ۱ اش ۱۰ ص ۸))

” اس یک طرفہ جھکاؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی نظام کی طرح اخلاقی اصول کے بارے میں بھی اہل سنت والجماعت کو راہ اعتدال چھوڑ کر انتہا پسندانہ موقف اختیار کرنا پڑا۔“

(حوالہ بالا ص ۹)

”بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اہل سنت والجماعت وجود میں آئے ہی اس مقصد کو لے کر کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انسان کی بیچارگی محض کو جزو عقیدہ بنا کر رہیں گے۔“

(حوالہ بالا)

”لیکن جب اسلام کا پہلا تو سیدی دور ختم ہوا تو بد قسمتی سے شریعت کی پاسبانی ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جنہوں نے

اسلام کے بنیادی اور مثبت رخ سے بالکل بے اعتنائی برتی۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۱)

۶۔۔۔۔۔ مسلمانوں کا قانونی نظام

”ان کے قانونی نظام میں صرف تعزیریں اور پابندیاں ہی

نظر آتی ہیں، ان میں حیات آفرینی کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔“

(حوالہ بالا)

۷۔۔۔۔۔ مسلمانوں کا نظام عقائد

”یہ حقیقت کہ اہل سنت والجماعت نے اپنے عقیدہ

میں بعض عناصر دائیں بازو اور بعض بائیں بازو سے لے کر

داخل کر لئے ہیں، صرف محولہ بالا حدیث تک محدود نہیں بلکہ

واقعہ یہ ہے کہ امتزاج و اعتدال کی یہ حکمت عملی ہی اہل سنت

والجماعت کا اصل الاصول ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۶ ص ۴۱)

درمیانی راستہ (صراط مستقیم) پر چلنے والی اکثریت (سواد

اعظم) کا یہ تصور اگرچہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں سیاسی تقاضہ کی

پیداوار تھا، لیکن جب سیاسی دھڑے بندیوں کو عقائد، فقہ اور اخلاق

کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش ہونے لگی تو اس تصور نے

دینی عقیدہ اور فقہی مسلک کی شکل اختیار کر لی۔“ (حوالہ بالا)

۸۔۔۔۔۔ مسلمانوں کا سیاسی نظام

”اطاعت امیر کی احادیث کا ذکر کرنے کے بعد) لیکن

جب یہ جذبہ (اطاعت امیر) ایک عقیدہ بن گیا، اور یہ فرض کر لیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اس کی تائید ہوتی ہے، تو یہ عقیدہ تسنن کی عمارت کا ستون بن گیا، اور سنی مسلمان ہمیشہ کے لئے حزب اقتدار کے حامی ہو کر رہ گئے، خواہ اقتدار کیسے ہی ہاتھوں میں کیوں نہ ہو۔“

(جلد ۱ ص ۹)

۹۔ مسلمانوں کی ابن الوقتی

”بہ اس ہمہ اگر خالص سیاسی اطاعت و انقیاد کے عقیدہ کو بعض دوسرے قوی اخلاقی اور روحانی عوامل سے تائید نہ ملتی تو یہ عقیدہ کھلی سیاسی ابن الوقتی نہ بن جاتا، لیکن بد قسمتی سے بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عقیدہ کی بنا پر نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی بے عملی کی تلقین ہونے لگی۔ لیکن بایں ہمہ یہ ایک حقیقت رہی ہے، اور تاریخ اسلام کی اب بھی یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ ایک طرف سیاسی اطاعت پذیری کے جذبے کو عہد ”پروان چڑھایا گیا“ دوسری طرف عام اخلاقی بے عملی اور بے حسی کو فروغ دیا گیا، اور ان دونوں اسباب کے اجتماع سے نہ صرف یہ کہ سیاسی ابن الوقتی کے مواقع فراہم ہوئے بلکہ ایسا نظر آنے لگا کہ یہی عقیدہ راسخ ہے، اور اسی میں نہ صرف دنیوی بلکہ اخروی سلامتی کی ضمانت بھی ہے۔“

(حوالہ بالا ص ۱۰-۱۱)

۱۰۔ مسلمانوں کا جامد فکری نظام

”سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی مذہبی تاریخ کی ایک بہت نمایاں حقیقت جسے اسلامی معاشرہ کے حقیقی احیا کا متمنی کوئی مسلمان نظر انداز نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ یہ ہے کہ اسلام ہمیشہ نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ عقائد اور اخلاق کے لحاظ سے بھی انتہا پسندانہ نظریات کا شکار رہا ہے اہل سنت والجماعت اعتدال، مصلحت اور تطبیق کے نام پر ہی وجود میں آئے تھے۔۔۔۔۔ لیکن جب ان کا فکری نظام پورے طور پر مرتب ہو گیا تو یہ خود جامد، جابر، اور جارحانہ ذہنیت کے مالک بن گئے، اور اعتدال و تطبیق اور جذب و انجذاب کی بجائے خود تحرب کا شکار ہو گئے۔“
(حوالہ بالا ص ۱۲)

۱۱۔ مردہ کا ورثہ

”راخ العقیدہ گروہ کا نظام تعلیم اور ان کا نظام فکر محض مردہ کا ورثہ بن گیا، ان میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہی۔“
(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۳)

۱۲۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم

”قرون اولیٰ (بشمول دور نبویؐ دور صحابہؓ۔ ناقل) میں راخ العقیدہ مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں ترتیب دیا۔ (میک گل یونیورسٹی نہیں کھولی۔ ناقل) ان کی درس گاہیں محض ابتدائی درجہ کی تھیں، جن میں بچوں کو قرآن

مجید نوشت و خواند اور ساتھ ہی ساتھ اکثر حساب کی مبادیات کی تعلیم دی جاتی تھی، اعلیٰ تعلیم کا محور اس زمانہ میں درس گاہیں نہیں بلکہ ذی علم شخصیتیں تھیں، طالب علم ایک مشہور و معروف شیخ سے کسب فیض کر کے دوسرے شیخ کے آگے زانوئے تلمذتہ کرتے تھے اور ان سے سندیں حاصل کرتے تھے، سارے کے سارے درسی مضامین روایتی نوعیت کے ہوتے تھے، تنظیم کے فقدان کی وجہ سے ابتدائی مدارج سے اعلیٰ مدارج تک طالب علموں کے پہنچنے کا کوئی انتظام نہ تھا، یہ دونوں مدارج بالکل جداگانہ تھے، بلکہ انہیں مدارج کہنا بھی درست نہیں کیونکہ درجہ بندی کا اس وقت کوئی تصور نہ تھا۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۲)

۱۳۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے ”مدارس“

”مدرسہ ہی وہ جگہ تھی جہاں عالم اسلام کے مفکر تیار کئے جاسکتے تھے، لیکن یہاں تو یہ مضمون تھا کہ :

مری تعمیر میں مضمحل ہے صورت اک خرابی کی
چنانچہ عالم اسلام میں مدرسوں کی باقاعدہ تشکیل کے ساتھ
ہی فکر خالص کا اخراج عمل میں آیا۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۱۹)

۱۴۔۔۔۔۔ علمائے اسلام کی مثال

”سارا زور علوم یا ان کے موضوعات کی تحصیل پر

نہیں، بلکہ کتابوں کی تدریس پر صرف کیا جاتا تھا، مثلاً طالب علم فقہ کی تعلیم حاصل نہیں کرتا تھا وہ تو کنز الدقائق یا ہدایہ کا درس لیتا تھا، وہ تفسیر کا علم حاصل نہیں کرتا تھا بلکہ جلالین یا بیضاوی پڑھتا تھا، بلکہ ان کا ”دورہ“ کرتا تھا، اس تعلیمی نظام کے پیدا کردہ ماحول کی ذہنی سطح کے لئے یہ طریقہ تعلیم حسب حال ضرور تھا، لیکن اس سے علوم کے سمجھنے، ان کی تنقید اور تجزیہ کرنے کی صلاحیتیں نہیں ابھر سکتیں ہیں، بلکہ اس سے تو محض چند کتابوں کے رٹ لینے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جس کی مذمت کرتے ہوئے قرآن نے ”یحمل اسفاراً“ (چند موٹی کتابوں کے ڈھوئے پھرنے) کا بلغ طنز استعمال کیا ہے۔ (جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۰)

۱۵۔۔۔۔۔ علمائے امت کی انسانیت سے روگردانی

”اگر فارابی اور ابن سینا نے بعض مسائل میں کلامی عقاید سے انحراف کیا۔۔۔۔۔ تو دوسری طرف غزالی اور ان کے بعد آنے والے تمام علمبرداران راسخ العقیدگی نے سارے فلسفہ اور فلسفہ کے آلہ لازمی یعنی عقل انسانی کی مذمت کر کے تمام انسانیت سے روگردانی کی۔“ (ملخصاً)

(ج ۲ ش ۱ ص ۱۸)

۱۶۔۔۔۔۔ امام غزالی، شاطبی، ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی

اور تمام مشاہیر اسلام کی خود کشی

”امام غزالی، شاطبی، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، اور

تمام مشاہیر اسلام جن جن کی مہریں فلسفہ کے خلاف فتویٰ پر لگی ہوئی ہیں، ان کی فلسفہ پر تنقید برحق، لیکن جب مسئلہ عقائد کے حامیوں نے پشت در پشت اور پے در پے انسانی عقل کو ہی ساقط الاعتبار قرار دیا تو یہ انتہا پسندانہ اور چو طرفہ حملہ نہ صرف غیر صحت مندانہ بلکہ خود کشی کے مترادف تھا۔

(ملخصاً "فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۵۵)

۱۷۔ امام شافعیؒ کا اسلام پر ظلم

”امام شافعیؒ کی روشن دماغی اور تیز طبعی نے ایک ایسا مشینی نظام پیدا کر دیا جس سے اسلام زندہ طاقت اور اپنی تقدیر کا خود مالک کی حیثیت میں نہیں رہا، بلکہ ایک اثر پذیر وجود کی حیثیت سے زندگی کے تھپیڑوں کی نذر ہو گیا۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۱ ص ۳۰)

۱۸۔ امام ابو یوسفؒ

”امام ابو یوسفؒ کا ائمہ فقہاء کی نسبت تصور یہ تھا کہ وہ سنت نبویؐ کی توسیع اور زندہ سنت کی تحقیق کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔“ (سبحانک ہذا بہتان عظیم۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۳ ص ۱۶)

۱۹۔ امام مالکؒ

”امام مالکؒ تعامل اہل مدینہ کی تائید میں حدیث ضرور

پیش کرتے ہیں، جو ضروری نہیں کہ مرفوع ہو، لیکن (یعنی محض رسوم و رواج) کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔“ (یہ وہی امام مالک ہیں جو مزار نبوی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے :

”کل مناراد ومردود الا صاحب هذا القبر صلی اللہ علیہ وسلم۔“ ہم میں سے ہر ایک کی بات رد کی جاسکتی ہے مگر یہ صاحب قبر صلی اللہ علیہ وسلم اس اصول سے مستثنیٰ ہیں، آپ کے کسی ارشاد کو رد نہیں کیا جاسکتا، اندریں صورت امام مالک پر اس سنگین افترا کے بارے میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ان یقولون الا کذاب۔ یہ لوگ محض جھوٹ کہتے ہیں۔“

(ج ۱ ش ۳، ص ۱۶)

۲۰۔ محدثین کا تعصب اور ان کی غلط بیانی

”محدثین کے واضح تعصب کی مثال محمد بن اسحاق کی تضعیف ہے، اور ان کے جھوٹ کی دلیل امام مالک سے محمد بن اسحاق کی عدم ثقاہت کی فرضی نقل ہے۔“

(ملخصاً) (جلد ۱ ش ۷ ص ۲۲)

۲۱۔ سنہ ۱۴۰ھ سے پہلے

”فقہا کی رائے یا سوچی سمجھی رائے کے انتشار اور ناقابل اختتام تضاد آرا کی بنیاد پر ابن المقفع (متوفی سنہ ۱۴۰ھ) نے یہ اعلان کر دیا کہ آنحضرتؐ کی کوئی متفق علیہ سنت (امت کے پاس) نہیں ہے، اور خلیفہ کو اپنے اجتہاد کو عمل میں لانے کا

مشورہ دیا، (ابن المقفع کون تھا؟ جس کے ایک ہی حوالہ کو ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹر نے وحی الہی سمجھ کر بار بار اسے ذکر کیا ہے؟ نیز جب بخاری جیسی متواتر کتاب ادارہ تحقیقات کی تحقیقاتی عدالت میں کتر پیونت، رد و بدل اور تحریف و تبدیل سے پاک ثابت نہیں ہوتی تو ابن المقفع کا مجہول رسالہ ”فی الصحابہ“ کی قطعیت کی شان کیونکر پیدا ہو گئی؟ -

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۲۱)

۲۲ — علماء امت پر تحقیقاتی ادارہ کے سب و شتم کا ایک ”نکسالی نمونہ“؛

”۔ (حافظ ابن حجرؒ کی ایک عبارت نقل کرنے کے بعد، ناقل) ”چور کی گواہی گرہ کٹ کی طرف سے“ اسی کو کہتے ہیں۔“

(فکر و نظر جلد ۱ ص ۱۲ ص ۶۸)

(الحق شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ ۱۳۸۶ھ)

۸۔ عقاید اسلامیہ اور مسائل اجماعیہ

۱۔ فقہ و عقاید کے اعتبار سے شریعت اسلامیہ کا المیہ:
اب ان اسلامی عقاید اور اجماعی مسائل پر غور فرمایا جائے جن کو ادارہ تحقیقات
نے بگاڑا ہے۔۔۔۔۔

”ہم نے اب تک جتنی مثالوں کا انتخاب کیا ہے وہ قانونی و اجتماعی
معاملات کی ہیں۔ لیکن عقاید کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم نہیں۔“ (گویا
مسلمانوں کا نہ صرف یہ کہ نظام قانون، نظام اجتماع، اور نظام معاملات غلط
ہے بلکہ نظام عقاید بھی ناقل)۔

(فکر و نظر جلد ۴ ص ۲۰)

۲۔ اسلامی عقاید اور دور جدید:

”دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے، باوجود ان تمام
اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں وہ قرون وسطیٰ کے نقطہ
نظر اور روایتی طرز فکر سے مختلف ہے، سند کو مان لینا اور خوش
اعتقادی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں اور یہ سکے جدید دنیا میں اب
چالو نہیں رہا۔“ (مطلب یہ کہ دین اسلام کا مدار نقل اور سند پر

ہے، اور دور جدید کی مسخ شدہ عقلیت کو سند کے مان لینے سے خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے، اس لئے اسلام دور جدید کے لائق شان نہیں رہا، یہ ہے اصل تحقیق اسلامی۔ ناقل۔

(حوالہ بالا ص ۲۱)

۳۔۔۔۔۔ معراج نبوی:

”معراج نبوی جو متواترات دین سے ہے، کے بارے میں فرمایا جاتا ہے یہ ایسی توہمت پرستی کی جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا ایک مثال ہے۔“

(حوالہ بالا)

۴۔۔۔۔۔ معجزات نبوی:

”سب دنیا جانتی ہے کہ معجزہ صداقت نبوت کی برہان ہوتا ہے، خود قرآن مجید میں بیسیوں معجزات اور آیات بینات کا ذکر موجود ہے، جو انبیاء علیہم السلام کو دئے گئے۔ لیکن تحقیقاتی ادارہ کے ڈاکٹر صاحبان کا فتویٰ یہ ہے کہ ”غرض قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد معجزات منسوب کر کے آپ میں ایک حد تک شان ایزدی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔“

(حوالہ بالا)

۵۔۔۔۔۔ مسئلہ شفاعت:

”اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدہ نے جو شکل اختیار کی وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا۔“

(گویا مسلمانوں کے عقاید کافروں سے اخذ کردہ ہیں)۔ ناقل۔

(حوالہ بالا)

۶۔ مسئلہ کرامت:

”جب آپ سند کو مانتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً خوش اعتقادی ہوتا ہے اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے ہر قسم کے جادو، ٹوٹکے پر یقین کرنے، کرامات پر زور دینے اور بھونڈی شکل میں روحانی شعبہ بازی کی۔“

(حوالہ بالا)

۷۔ اسلام کا نبیؐ اساطیری رنگ میں :

”نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ایک اساطیری رنگ میں پیش کرنے کا یہ عمل، جس کا مصدر و منبع ایک سے زیادہ عناصر تھے، راسخ العقیدہ گروہ بھی برابر اس میں شریک رہا اور اسے اس نے قبول کیا۔“

(حوالہ بالا)

۸۔ عقیدہ نزول عیسیٰ علیہ السلام :

”یہ عقیدہ عیسائیت سے مستعار لیا گیا تھا اور کچھ عرصہ بعد اہل سنت والجماعت کے عقاید کا جزو بن گیا۔“

(فکر و نظر ج ۱ ش ۱۲ ص ۱۱)

۹۔ آمد مہدی علیہ السلام :

”اس کی دوسری شکل وہ تھی جس نے شیعی حلقوں میں جنم لیا، اور شروع کے صوفیاء کی کوششوں سے اہل سنت والجماعت کے

عقاید میں جگہ پائی، یہ تھا مہدویت کا عقیدہ۔“

(حوالہ بالا)

۱۰۔ ایمان و عمل کا عقیدہ :

(اہل سنت کا یہ عقیدہ کہ آدمی جب تک ضروریات دین کا قائل ہو صرف گناہ کے ارتکاب سے کافر نہیں ہوتا)۔ ”یہ ایک انتہاء پسندانہ اقدام تھا بالآخر یہ اخلاقی لحاظ سے یہ خودکشی کا سا فعل ثابت ہوا یہ عقیدہ مسیحی عقیدہ استحقاق نجات بہ ایمان کا عین مین چربہ بن گیا۔“
(جلد ۱ ص ۱۰ ص ۹)

۱۱۔ نماز، روزہ دیگر احکام قدامت پرستی کے اطوار :

”جب شریعت کے پاسانوں نے معاشرتی اور اقتصادی پہلو کو نظر انداز کر دیا تو نماز روزہ اور دیگر احکامات جو روحانی اور اخلاقی اقدار پیدا کرنے کے لئے تھے محض قدامت پرستی کے رسمی اطوار میں بدل گئے۔“
(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۱)

۱۲۔ ارکان اسلام کا استہزاء :

”اسلام کے پانچ ستون گنائے گئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے لئے فرش کون سا ہے، دیوار کونسی ہوگی، اور چھت کونسی ہوگی یہ سوالات نہ تو پوچھے جاتے ہیں، نہ ان کا کوئی جواب دیتا ہے، دیوار، فرش اور چھت کا ذکر سننے ہی میں نہیں آتا، جب سنتے ہیں

۱۴۷
صرف ”ستون“ ہی کا نام سنتے ہیں۔“ ملخصاً

(حوالہ بالا)

۱۳۔۔۔۔۔ زکوٰۃ ٹیکس ہے :

”اس کا نام بدلنا ضروری ہے، ورنہ سیکولزم کا خطرہ ہے۔“

(فکرو نظر جلد ۲ ش ۴ ص ۱۳۵ و جلد ۳ ش ۱ ص ۱۷)

۱۴۔۔۔۔۔ سود حلال ہے :

”قرآن کے زمانہ نزول میں صرف وہی جاہلی سود رائج تھا کہ جس سے رأس المال کی مقدار دوچند سہ چند بڑھ جاتی تھی، اس چند درچند سود کے عمل کی وجہ سے ربوا کو حرام کر دیا، ورنہ ”مفروضہ سود“ کو حرام نہیں کیا۔ گویا ۱۰۰ روپے پر اگر ننانوے روپے ننانوے پیسے سود لے لیا جائے تو مضائقہ نہیں کیونکہ ”دوچند“ نہیں، البتہ اگر اس پر ایک نئے پیسے کا اضافہ کر لیا گیا تو چونکہ یہ دوچند ہو گیا اس لئے ایسا کرنے والے کو خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔“

(فکرو نظر جلد ۱ ش ۵ ص ۵۷)

۱۵۔۔۔۔۔ شراب حلال ہے :

ادارہ کے سربراہ کا مشاورتی کونسل سے اختلافی نوٹ ملاحظہ

کیجئے۔

۱۶۔۔۔۔۔ شراب کے بارے میں صحابہ کی غلطی :

”خر کے بارے میں تو قرآن کا واضح حکم نازل ہو گیا، لیکن

دوسرے مشروبات کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں ہوا، چنانچہ بعض صحابہ (ؓ) نے خود ہی قیاس کرتے ہوئے دوسرے مشروبات بھی لٹھا دیئے، ان میں ”لففصیح“ قابل ذکر ہے۔“ (صحابہؓ کی ”قیاس آرائی“ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیر نہ فرمانا قابل غور ہے)۔ ناقل۔

(جلد ۴ ش ۱ ص ۷۲)

۱۷۔ اگر حکومت سودی کاروبار کی متولی ہو تو وہ ہر طرح جائز ہو جائے گا :

”اگر حکومت تجارتی سود کا تمام نظام اپنے ہاتھوں میں لے لے تو میرے خیال میں اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے، کیونکہ فقہ کا اصول ہے ”لاربوا بین المولیٰ وعبده“ آقا اور غلام کے درمیان سود جائز ہے۔ حکومت اور رعیت کے تعلق کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ (لیجئے دوچند سہ چند کا فلسفہ بھی دھرا رہ گیا، حکومت اس مقدس کاروبار کو خود کرنے لگے تو بلا کسی شرط اور قید کے جواز کی گنجائش نکل آئی، پھر فقہی عبارت کے ترجمہ اور اس پر ”قیاسی عمارت“ کا جو تحقیقی شاہکار پیش فرمایا ہے کون کافر ہو گا جو اس کی داد دیئے بغیر رہے۔ ایں چنینیں ”ارکان دولت“ ملک را ویراں کنند ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۵۷)

۱۸۔ صغرسنی کی شادیاں ناجائز :

”قرآن کی نص صریح نکاح کے لئے بلوغ کو شرط قرار دیتی

ہے، اس لئے اس کے جواز پر اتفاق کنندگان کو تحریف قرآن بلکہ تحریف سے بھی کچھ زیادہ سخت جرم کے مجرم قرار دینا چاہئے۔“ ملخصاً (یہ مجرم صحابہ کرام سے لے کر اب تک کے تمام علمائے امت ہیں باستثنائے بعض اقوال شاذہ، بعید نہیں کہ فرد جرم عائد کرنے والے کے بعض آباواجداد نے بھی کسی وقت اس ناجائز فعل کی غلطی جائز سمجھ کر کر لی ہو، اس صورت میں کیا کچھ نسبی الجھن پیدا ہو سکتی ہے؟ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۷-۸ ص ۴۲)

۱۹۔ صغرسنی کے نکاح کا جواز :

”چونکہ تدوین فقہ کے دور میں بیشتر علمی سندوں پر عجمی علماء اور ائمہ قابض ہو چکے تھے، اور چونکہ ان کے اذہان اس عجیبیت کی وجہ سے وراثتی طور پر صغرسنی کی شادیوں سے مانوس تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی جرح و تنقید کئے بغیر اس حماقت کے جواز کا فتویٰ صادر فرمادیا، ورنہ اگر وہ جرح و تنقید فرماتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس تک ان کی رسائی نہ ہو سکتی۔“ ملخصاً (یہ بھونڈی منطق ائمہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں فرضاً جاری کر لیجئے لیکن امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں کیا منطق ہوگی؟ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۱ ش ۷-۸ ص ۴۹-۵۲)

۲۰۔ مسئلہ تعدد ازواج :

”قرآن حکیم نے چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت دے دی

ہے۔ اور (ساتھ ہی) یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عام حالات میں الف۔ ایک مرد کے لئے ایک ہی بیوی کا ہونا ہی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر چونکہ عرب معاشرے میں تعدد ازواج کی جڑیں گہری تھیں، اس لئے اس وقت کے معاشرے کے ساتھ مصالحت کرنے کے لئے قرآن نے قانونی سطح پر تعداد ازواج کو ممکن حد تک تحدید اور پابندیوں کے ساتھ قبول کر لیا اور یہ صراحت بھی کر دی کہ مثالی اخلاقی معاشرہ وہ ہے جس میں ایک مرد کی ایک ہی بیوی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس معاشرے کو تدریجاً اپنائیں گے، بہر حال تاریخی لحاظ سے ہوا اس کے برعکس (کیونکہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئیں، جن کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں آئیں، اور یہ چیز اس معاملے میں قرآن مجید کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی۔“

(حاصل یہ کہ اسلام کی پوری تاریخ میں بشمول دور نبوی نہ ادارہ تحقیقات کا فرضی مثالی اخلاقی معاشرہ کبھی قائم ہوا، نہ تمنائے نبوی برآئی، نہ قرآن کا اصل مقصد کبھی پورا ہوا، بلکہ اسلامی فتوحات اس کے لئے رکاوٹ بنتی چلی گئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ناقل۔ ۷)

(فکر و نظر جلد ۴ ص ۲۰)

ب۔ ”سوباتوں کی ایک بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک کے تمام اکابر و اسلاف نے چودہ سو سال

(فکرو نظر جلد ۱ ش ۱۱ ص ۱۴)

(حوالہ بالا ص ۱۶)

ز۔۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ تعدد ازواج کا مفہوم آیت منثی و ثلث و رباع سے جن حضرات نے اخذ کیا، (اور وہ پوری امت ہے) اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، قصور اس اصول شکنی کا ہے، جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔ (پس بیچارے مفسرین اور تمام علماء امت جو نہ تو اس اصول کو سمجھ پائے جس کا لحاظ یہاں ضروری تھا، نہ انہیں اتنی عقل آئی کہ یہاں کوئی اصول ٹوٹ تو نہیں رہا۔ وہ تو بلاشبہ بے قصور ہیں۔ البتہ اصول شکنی کو تختہ دار پر کھینچنا چاہیے، کہ

وہ آپ سے آپ اس آیت میں کیوں کھس آئی۔ ناقل۔)

(نکرو نظر جلد ۱ ش ۱۲ ص ۳۴)

۲۱۔ مسئلہ طلاق :

”قرآن کریم کی رو سے طلاقیں صرف تین مرتبہ الگ الگ وقفہ کے ساتھ ہو سکتی ہیں۔ اور ایک عدت کے شروع میں ایک طلاق ہو سکتی ہے۔“
(نکرو نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۲۲۳)

ب۔ ”قرآن کریم کی رو سے کئی کئی طلاقیں (دو یا تین) ایک وقت میں نہیں دی جاسکتیں، اور نہ مختصر وقفوں کے ساتھ ہی (ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق کر کے) دی جاسکتی ہے، یہ صورت (جس کے اکثر ائمہ دین، صحابہ و تابعین قائل ہیں ادارہ تحقیقات کے بقول) قرآنی حکم کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف اور استہزا پر مشتمل ہے۔“
(نکرو نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۲۲۴)

ج۔ ”تمام صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہانے بالاتفاق (سوائے امام شافعیؒ) بیک وقت دو تین طلاقیں دینے کو حرام، ممنوع اور ناجائز کہا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت قائل ہے کہ باوجود حرام، ممنوع، اور ناجائز ہونے کے اگر کوئی شخص ایسی حماقت کر بیٹھے تو تین طلاقیں نافذ ہو جاتی ہیں اور بیوی مغلولہ طور پر اس کے لئے حرام ہو جاتی ہے۔“
(جلد ۲ ش ۲ ص ۲۲۵)

د۔ ”اکثریت کا یہ فیصلہ کیوں ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے ایسا کوئی فیصلہ ثابت نہیں، اس سلسلہ کی تمام روایات ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ البتہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ سے یہ فیصلہ ثابت ہے لیکن ان کا یہ فیصلہ (جو ادارہ تحقیقات کی نظر میں قرآنی روح کو پامال کرنے اور اس کے استحقاف و استہزاء پر مشتمل ہے) وقتی ضرورت اور ہنگامی مصلحت کے ماتحت تھا، اور صحابہ تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کا فیصلہ دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کے ماتحت تھا، چونکہ وہ ضرورت اور مصلحت اب باقی نہیں رہی۔ اس لئے ہمیں شریعت اسلامی کے اصل حکم کی طرف لوٹنا چاہیے۔ (اور حضرت عمر، صحابہ تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کے فیصلہ پر عمل کر کے قرآنی روح کو پامال کرنے اور اس کے استحقاف و استہزاء کی مزید غلطی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس بارے میں اقوال شاذہ کو لے کر مسلم فیملی لاز کی روح کو خوش کرنا چاہیے، اور تین طلاق سے مغلظہ عورتوں کو جو صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کے نزدیک قطعی حرام ہو جاتی ہیں، بدستور ان کے طلاق دینے والوں کے پاس قانوناً ٹھہرا کر حرام کاری کا شرعی جواز ڈھونڈنا چاہیے۔ اور منصوبہ بندی کے طفیل بن باپ کے بچوں کی تعداد میں جو کسر رہ جانے کا اندیشہ ہو اسے یوں پورا کرنا چاہیے۔) ناقل۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۲۲۶)

۲۲۔ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی میراث :

”بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا اگرچہ اس کے خلاف پوری امت میں سے کسی کا معتد بہ قول منقول نہیں، مگر

چونکہ یہ بھی علم نہیں کہ اس اجماع کا اعلان۔

الف — کب اور کس جگہ کیا گیا تھا، اور بعض لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن و حدیث کی کس ”نص“ سے مستنبط ہے۔ اس لئے یہ اجماع حجت نہیں بلکہ اسے اسباب تحریف میں شمار کیا جائے گا۔ (اور فرض کیا جائے گا کہ اس مسئلہ کو اپنا کرامت ”دینی تحریف“ کا فریضہ انجام دیتی رہی، خیر امت اور امت وسط کا یہی مفہوم ہوگا۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۰۹-۳۱۰)

ب — ”واقعہ یہ ہے کہ ہمارا علم و تفقہ اپنی پوری بے مائیگی کے ساتھ اس علم و تفقہ کا پاسنگ بھی نہیں۔ جو ہمارے فقہاء کرام کا حصہ تھا، لیکن وہ حضرات بہر حال انسان تھے، فرشتے اور معصوم نہیں تھے۔“ (پوری امت اور امت کے علماء و فقہا اگر فرشتے اور معصوم نہ تھے بلکہ انسان ہی تھے تو ان کے اجماعی مسائل کے ٹھکرانے والوں کو وحی ملکیت اور عصمت کا پروانہ کب سے مل گیا، چودہ سو سالہ کروڑوں سلف صالحین کو غلط کار، نافم، فثائے قرآن و نبوت تک رسائی سے محروم اور تحریف کے مجرم قرار دینے کی نسبت ہمارے لئے مجتہدان عصر حاضر کو نادان فرض کر لینا کیا مشکل ہے۔ ورنہ

ومن يتبع غير سبيل المؤمنين“ کا مصداق کیا ہوگا؟ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۴ ص ۳۱۱)

ج — ”فقہ کے جب حرمان کا اصول ”الاقرب فالاقرب“ غلط

(ملخصاً جلد ۳ ش ۴ ص ۳۱۲)

ہے۔“

(جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۸)

ہ۔۔۔۔۔ ”لہذا ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یتیم پوتے کی اپنے دادا سے محرومی کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں۔“ (ہمیں کسی کی نہایت دیانتداری پر بحث کا حق نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کی نہایت دیانتداری تو صرف پوتے کی میراث سے محرومی کو نہیں بلکہ پورے اسلام ہی کو کسی صحیح بنیاد پر مبنی تسلیم نہیں کرتی، بلکہ اسلام کے تمام مجموعہ کو قرون وسطیٰ کی پیداوار تصور کرتی ہے، بعض کی نہایت دیانتداری پورے اسلام کو عجبی سازش کہتی ہے جن میں خود مقالہ نگار بھی شامل ہیں، اب کس کس کی نہایت دیانتداری پر اعتماد کر لیا جائے، کیا پولیس کی نہایت دیانتداری کی منطق ہی نے ہمیں سب سے پہلے دھوکا نہیں دیا تھا؟ وقاسمہما انی لکما لمن الناصحین؛ فدلہما

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۱۷)

۲۳۔ مسئلہ غلامی :

”اور (جو کچھ تعدد ازواج کے اقتباس الف میں بیان ہوا) یہی غلامی کے مسئلہ میں بھی ہوا جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسا اخلاقی محرک بھی عمل میں لایا گیا کہ اس کی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی، اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجہ تھے۔“ (یہ وجہ کچھ بھی ہوں لیکن ادارہ تحقیقات کے ڈاکٹروں نے تاریخ اسلام کے خلاف قرآنی مقصد کو ناکام کر دینے کی فرضی فرد جرم تو مرتب کر ہی لی۔ ناقل۔)

(فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ص ۲۰)

۲۴۔ غنا اور سماع (گانا بجانا) :

”الف۔ غنا اور سماع راگ گانے اور سننے کی شرعی حیثیت میں دو مسلک ہیں، ایک فقہاء کا جو عموماً اس کی حرمت کے قائل ہیں اور دوسرا محدثین کا جو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اور اس باب کی تمام روایات کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۹ ص ۵۶۶)

ب۔۔۔۔۔ سماع و غنا کے معاملہ میں فقہاء کی شدت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں یہ چیزیں اس حد کو پہنچ گئیں

کہ ان سے معاشرہ کی اخلاقی حالت دگرگوں ہو گئی، فقہاء کو قانون ساز کی حیثیت سے اس لہو و لعب کے افراط کا تدارک کرنا پڑا، ان کے یہ فتاویٰ اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(کیا فقہاء کے اس فیصلہ کی کوئی بنیاد قرآن و سنت میں موجود نہ تھی؟ یوں ہی قانون سازی کے شوق میں انہوں نے فتاویٰ صادر فرمادیئے تھے، کیا قینات و معازف نے گھر گھر ”ڈوم خانہ“ بنا کر نہیں رکھ دیا؟ کیا پھر یہ فتاویٰ اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کی الٹی منطق اپنے اندر کوئی جان رکھتی ہے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۹ ص ۵۷۵)

۲۵۔۔۔۔۔ حدود اللہ :

”حدود کی تفصیلات کا حکم اسلامی حکومت پر چھوڑ دیا گیا، مثلاً شراب کی کون سی قسم حرام ہوگی، کتنی مقدار پینے پر کوئی انسان مجرم ہوگا، اور اس میں کوئی استثناء بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یا مثلاً چوری پر ہاتھ کلٹنے کی سزا کتنی مالیت پر جاری ہوگی، اور کس قسم کی چوری جرم قرار پائے گی، یہ سب حکومت کی ذمہ داری قرار دے دیا گیا، حدیث میں کچھ نعیین کی گئی ہے، لیکن تفصیل ہمارے فقہاء نے کی۔“ ملخصاً۔ (گویا اسلامی حدود فقہاء کی پیداوار ہیں، اور موجودہ دور کے نام نہاد فقہاء ان میں آزادانہ تبدیلیاں کر سکتے ہیں۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۹ ص ۶۷۳)

۲۶۔۔۔۔۔ تصویر اور فوٹو :

الف۔۔۔۔۔ ”یہ غلط تصور کہ ”اسلام کا مزاج تصویر اور مصوری

کے خلاف ہے۔ ”ائمہ مجتہدین کے نقطہ نظر کو نظر انداز کر دینے سے پیدا ہوا اس لئے ہمارے یہاں فوٹو کو حرام سمجھا جاتا ہے۔“ ملخصاً۔
(فکر و نظر جلد ۱۰ ص ۵۰)

ب۔۔۔۔۔ ”حدیث شریف مذاہب اربعہ“ اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال سے صرف ایسی تصویر کی حرمت پر اجماع ثابت ہوتا ہے جس کا سایہ ہو، اگر سایہ نہ ہو تو جائز ہے، اور چونکہ فوٹو کا سایہ نہیں ہوتا، اس لئے وہ بھی اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔“ (پدر نہ کرد پر تمام خواہد کرد) ادارہ تحقیقات کی یہ تحقیقاتی مہم جاری رہی تو فقہاء کے اقوال سے کیا قرآن مجید سے بھی ہر مورتی کا جواز ثابت کر لیا جائے گا، تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے کی بحث بھی یقین کرنا چاہئے کہ عبوری قسم کی ہے۔ جہاں فقہاء کے اقوال سے ہر قسم کا سود جائز کر لیا جائے۔ وہاں تصویر اور فوٹو کا جواز تو یقیناً آسان چیز ہے۔ ناقل)

(فکر و نظر جلد ۱۰ ص ۵۸)

۲۷۔ نسلی منصوبہ بندی :

”امام غزالی سے لے کر ابن عربین تک تمام فقہاء اور صوفیا اس کے جواز کے قائل ہیں ہم نے اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر ائمہ مجتہدین کے اقوال پیش کر دیئے ہیں۔ جس سے شریعت حقہ کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے ملخصاً (واقعی بڑا احسان فرمایا کہ عزل کے بارے میں کچھ اسقاط کے بارے میں آپ نے اقوال نقل کر ڈالے اور

بعض بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کا ذکر بھی فرما ڈالا، لیکن سوال یہ ہے کہ ۲۹ کروڑ روپیہ صرف کرنے اور مردوں کو ٹیکے لگا کر انہیں ناقابل اولاد کر دینے پر ڈاکٹر اور نامرد ہونے والے دونوں کو بیس بیس روپیہ انعام دینے، اور مستورات کے مختلف قسم کے غیر فطری عمل سے رحم کا مونہہ بند کر دینے اور برسرعام اسے ایک مہم کی حیثیت سے پھیلانے اور قومی ذرائع کافی نہ ہوں تو اس کے لئے غیر ملکی امداد طلب کرنے کی تصریح بھی کتابوں کے کسی گوشے سے ڈھونڈ نکالی جوتی، یا ہم توقع رکھیں کہ یہ کام، اسلام کے آئندہ ایڈیشن، میں سرانجام پائے گا؟ اور کہیں سے یہ عبارت بھی نکال لی جوتی کہ منصوبہ بندی کی اس مقدس تحریک سے پیدا ہونے والے بن باپ کے معصوم بچوں کے لئے تربیت گاہیں کھولنے کا منصوبہ بھی عین اسلامی مزاج ہے۔ ناقل)

(نکرو نظر جلد ۲ ش ۵-۶ ص ۳۳۳)

۹۔۔۔ پھر بھی دعویٰ ہے کہ مسلمان ہیں ہم :

ادارہ تحقیقات اسلامیہ کے ملحدانہ نظریات اور بعض صریح کفریات کی کچھ مثالیں جو اوپر ذکر کی گئی ہیں، ہمیں ان پر قطعاً حیرت نہیں، اس لئے کہ ادارہ کے ”رجال کار“ جس ذہنی فضا آغوش تربیت اور فیضان نظر سے پروان چڑھے ہیں فطر تا ان چیزوں کے علاوہ کی توقع ان سے کہاں سے کی جاسکتی تھی لیکن بایں ہمہ ان کا دعوائے اسلام ہمارے لئے سامان صد حیرت ہے، ہم یہ سمجھنے سے معذور ہیں کہ جس دین کا ماضی ان کے بقول اس قدر تاریک اور عبرت ناک ہے،

اس کے نام کے استعمال کا تکلف کیوں فرمایا جاتا ہے؟ گویا ادارہ تحقیقات اور اس کے ارباب ”فکر و نظر“ کا اسلام بھی فی تمیزہ کا موضوع ہے کہ عقل الہی کو عام انسانی بصیرت کی سطح پر لاؤ لیکن اسلام میں فرق نہیں آئے گا، آنحضرت ﷺ کو تشریح اور قانون سازی کے مقام سے معزول کر وہ تب بھی باقی رہے گا، قرآن و سنت کے فیصلوں پر ”وقتی اور ہنگامی“ منطق کے رندے چلاؤ، نصوص کا مذاق اڑاؤ، جس حکم کو چاہو منسوخ کر ڈالو، اور شوق سے مسلمان کہلاؤ، مغربی مفکرین کے کہنے پر اسلام کی تفسیر بدل ڈالو، کتاب خداوندی کو الٹ معنی پہناؤ، اسلام کے ہر مسئلہ کو استشراتی دور بین سے دیکھو، لیکن اسلام پھر اسلام رہے گا۔ روایتی، اساطیری، قدامت پسندی، روایت پسندی، قسم کی مذہب صلواتیں اسلام کو سناؤ، تمام اسلامی عقائد کو خوش اعتقادی، توہم پرستی اور عیسائیت سے درآمد قرار دو لیکن یہ یقین بھی رکھو کہ اسلام محفوظ رہے گا..... امت مسلمہ کی پوری تاریخ پر طعنہ زنی کرو، امت کے اعمال، امت کے عقائد اور امت کے اجتماعی فیصلوں کو ایک ایک کر کے جھٹلاتے رہو اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قانون مرتب کرنے کا اعلان بھی کرتے جاؤ، امت مسلمہ کے محدثین پر معاصرانہ واقعات کو ذات نبویؐ سے خواہ مخواہ منسوب کر ڈالنے کی تہمت تراشی کرو، اور ان پر تاریخ سازی کا الزام لگاؤ، فقہائے امت پر ذاتی آراء، یہودی روایات، بازنطینی نظام، اور ایرانی معاملات کو شریعت بنادینے کا بہتان باندھو، امام شافعیؒ سے لے کر مجدد الف ثانیؒ تک تمام مشاہیر اسلام پر انسانیت سے روگردانی اور اسلام پر ظلم کا الزام لگاؤ، لیکن فرض کرو کہ اسلام کا بال بیکانہ ہوگا، دین اسلام کے ایک ایک شعبہ کو قرون وسطیٰ کی پیداوار اور عہد وسطیٰ کے فقہاء کی رنگ آمیزی ثابت کرو، لیکن مجال نہیں کہ

اسلام ٹوٹ جائے، حدود اللہ کا انکار کرو، زکوٰۃ کو ٹیکس بتلاؤ، سود اور شراب کی حلت کے فتوے صادر کرو، اور ارشادات نبوت کو انمئل، بے جوڑ اور مصنوعی بتلاؤ، لیکن فرغ کرو کہ اسلام بدستور رہے گا، گویا:

ع رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت نہ گئی

ادارہ تحقیقات کی ”تحقیقی منطق“ کو اگر ایک لمحہ کے لئے تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اسلام ہر اعتبار سے صفر ہے۔ معاذ اللہ، موجودہ دور کے لئے خدا اور رسول کا کوئی قطعی حکم نہیں، جسے من و عن سر آنکھوں پر رکھا جائے، اسلامی ذخیرہ میں کوئی عقیدہ اور عمل ایسا نہیں جسے قطعی اور یقینی کہا جاسکے، بلکہ کل اسلامی سرمایہ ظنون و اوہام کا ڈھیر ہے، جسے موجودہ دور کے مجددین چھان پھٹک کر اس میں سے اپنے حسب حال کچھ اجزا کا انتخاب کر لیں گے اور ان پر نئے ہزلیات کی عمارت استوار کی جائے گی، یہ ٹھیک وہی نظریہ ہے جس پر لسان الحکمت شاہ ولی اللہ نے مندرجہ ذیل تنقید فرمائی ہے:

”با بملہ دردست مایچ چیز از شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

از نوع اول نباشد، وامت: ظنون خود با عمل کند، و ثبوت عمل بہ ظنون

در جزئیات شریعت ثابت نیست الا باجماع طبقہ اولیٰ، پس آن نیز مستحق

نباشد، پس ہجرت الیوم کلف بحکم شرعی نیست۔

لعنة الله والملائكة والناس اجمعين على هذه العقيدة الباطلة

(ازالۃ الخفاج ۳ ص ۴۱۷ طبع جدید)

ترجمہ: ”حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں ہمارے ہاتھ میں شریعت

محمدیہ کی نوع اول (یعنی علوم - یقینیہ) کی کوئی چیز نہیں رہتی، اور

امت اپنے ظنون پر عمل پیرا رہے گی اور جزئیات شرعیہ میں ظن پر عمل کرنا بھی طبقہ اولیٰ کے اجماع سے ہی ثابت ہے جب اجماع ثابت نہ ہوا تو یہ بھی ثابت نہ ہوا، نتیجہ یہ ہوگا کہ آج کوئی شخص بھی کسی شرعی حکم کا مکلف نہیں ہے۔ اس عقیدہ باطلہ پر اللہ کی لعنت، فرشتوں کی لعنت اور تمام انسانوں کی لعنت۔

۱۰۔ حرف آخر

آخر میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار ضروری ہے، وہ یہ کہ ادارہ تحقیقات کے مفکرین نے کئی جگہ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر قرآن و سنت اور دین و شریعت میں تغیر و تبدل کی اجازت نہ دی گئی تو اسلامی حکومتیں ترکی کی طرح مذہب کو قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گی اور ہم اسلام کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

(ملاحظہ ہو فکر و نظر ج ۲ ش ۳ ص ۲۳۵) و دیگر مقامات

ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر آپ نے شریعت مطہرہ کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے اور قرآن و سنت کے نصوص قطعیہ کو تبدیل کر دینے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو اطمینان رکھئے آپ کو لامذہبیت کے باقاعدہ اعلان کے تکلف کی کچھ حاجت نہیں، اس نظریہ کو اپنا لینے کے بعد بغیر کسی قسم کا اعلان کئے آپ کو وہ نعمت مل جاتی ہے جس کے آپ دل و زبان سے خواستگار ہیں، پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ اسلام کو ایسے خود غرض، مفاد پسند اور مطلب پرستوں کی ضرورت بھی کہاں ہے، جو محض اس بنیاد پر ترک مذہب کے لئے بے چین ہو جاتے ہوں، کہ مذہب ان کی خودرونی اور خودرانی پر قدغن کیوں لگاتا ہے، البتہ ہم اتنا ضرور عرض کریں گے، اگر تم اسلام کا نام باقی رکھ کر اسلام کے مفہوم اور

اس کی صحیح تعلیمات کو بدل ڈالو گے تو اپنی ذات اور اسلام دونوں پر ظلم کرو گے، اور اگر ترک مذہب کا راستہ اختیار کرو گے تو اس ظلم کا تعلق تنہا تمہاری ذات سے ہوگا، ہمارے خیال میں آپ کے لئے دوہرے ظلم کی نسبت اکہرے ظلم کا برداشت کر لینا آسان ہوگا۔

حاصل یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی موجودہ روش ان الفاظ کی مصداق ہے جو لسان الحکمت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے زنادقہ جاہلیت کے بارے میں لکھے ہیں۔

”والزنادقة يجبلون على الفهم الابتزلا يستطيعون التحقيق التام الذى قصده صاحب الملة ولا يقلدونه ولا يسلمونه فيما اخبر، فهم فى ربهم يتردون على خوف من ملئهم، والناس ينكرون عليهم ويرونهم خارجين من الدين، خالعين ربة الملة عن اعناقهم، واذا كان الامر على ما ذكرنا من الانكار وقبح الحال فخروجهم لا يضر۔“

(حجة الله البالغة جلد ۱ ص ۱۲۵ منیریہ)

ترجمہ :- ”اور زندیق لوگ فطرۃ ”فہم ناقص“ رکھتے ہیں اور اس امر کی پوری تحقیق نہیں کر پاتے جو صاحب ملت کا مقصود ہوتا ہے، نہ وہ صاحب ملت کی تقلید کرتے ہیں، نہ ان امور کو تسلیم کرتے ہیں جن کی خبر صاحب ملت نے دی ہے، چنانچہ وہ اپنے شکوک و شبہات میں سرگرداں رہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ماحول کے لوگوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ (اس لئے کھل کر انکار دین کی جرأت نہیں کرتے) اور لوگ ان کو برا جانتے ہیں۔ اور دین سے خارج سمجھتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ ان لوگوں نے مذہب کا جو اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے، اور جب ان کے انکار اور بد حالی کا معاملہ اس

نقطہ پر پہنچا ہوا ہے، جو ہم نے بیان کیا، تو ان لوگوں کا دین سے خارج ہو جانا قطعاً مضر نہیں۔“

یہ عبارت ہر دور کے ملحدین اور زندیقوں کے طرز عمل، طرز تحقیق، طرز فکر اور انداز اصلاح پر بہترین تبصرہ ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ آئینہ میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے ارباب ”فکر و نظر“ کی اصلی شکل و صورت پوری طرح عکس پذیر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ ادارہ اپنی اور اپنے ادارتی احباب کی بدترین شکل اس آئینہ میں دیکھ کر اصلاح کی کوئی فکر کرے گا۔ یا سیاہ قام حبشی کی طرح اس آئینے ہی کو پھینک ڈالنے پر قناعت کرے گا۔ حق تعالیٰ اسلام کو تمام فتنوں سے محفوظ رکھے۔۔۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(الحق ذو القعدہ ۱۳۸۶ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمن کے عائلی قوانین اور علما

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد،

مدیر بینات کو بعض احباب نے عائلی قوانین کے بارے میں باخلاص مشورہ دیا

کہ :

”عائلی قوانین کے بارے میں عرض ہے کہ اکابر علما سے اس

کا بائیکاٹ کرایا جائے، جب تک علما اس کا بائیکاٹ نہیں کریں گے

اس وقت تک کام نہیں بنے گا، نہ حکومت توجہ کرے گی، نہ علما کے

مشورہ کے مطابق اس میں ترمیم کرے گی، بلکہ یہ قانون اسی طرح

ہمارے سروں پر مسلط رہے گا۔“

اس پر مدیر بینات نے ان کے باخلاص مشورہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا :

سب سے پہلے یہ اصولی بات ذہن میں رکھئے کہ علمائے امت کا اصل مشن

اصلاح ہے، تخریب نہیں، وہ نازک سے نازک مرحلہ پر بھی حق کا اظہار ضروری سمجھتے

ہیں، خواہ اس کی وجہ سے انہیں مشکلات ہی میں مبتلا ہونا پڑے، لیکن کسی مرحلہ پر بھی

وہ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے حق میں نہیں، عائلی قوانین کے سلسلہ

میں جہاں تک علما کی ذمہ داری کا تعلق ہے آپ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ

علمائے کرام نے ادائے فرض میں کسی ادنیٰ تساہل سے بھی کام نہیں لیا، قرآن و سنت

کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی انہیں برداشت کرنا

پڑی ہیں، حد یہ ہے کہ علما کرام کی مساعی جمیلہ سے صوبائی اسمبلی متفقہ طور پر اس

قانون کو رد کر چکی ہے، اور قومی اسمبلی شرعی نقطہ نظر کے موافق اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس کر چکی ہے، اس کے باوجود بھی یہ قانون اگر ہمارے سروں پر مسلط رہتا ہے تو اسے ہماری بد قسمتی قرار دیا جائے، یا اس کا حساب و کتاب ان لوگوں کے کھاتے میں درج کیا جائے جو اسے تبدیل کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔

جہاں تک اس قانون پر عمل نہ کرنے کا تعلق ہے، اس کا اظہار نہ صرف علمائے امت بلکہ عامۃ المسلمین بھی قولاً و عملاً کر چکے ہیں، ذرا اس قانون کی دفعات اور ان پر عمل درآمد کا ہلکا جائزہ لیجئے، تو واضح ہو گا کہ بجز اندراج نکاح و رجسٹر اس کی کسی شق پر پاکستان میں عمل نہیں ہو رہا، بلکہ عملی زندگی میں یہ قانون قطعی بیکار ہے، مثلاً:

”عائلی قوانین کی دفعہ ۴ کی رو سے صلیبی بیٹے کی موجودگی میں پوتے پوتی، اور نواسے نواسی کو وارث قرار دیا گیا ہے، جو قرآن کریم، حدیث نبوی اور اجماع امت کی صریح ضد ہے، علمائے امت اس قانون کے نفاذ سے لے کر اب تک یہ اعلان کرتے ہیں، کہ جن لوگوں کو اس قانون کے تحت ان کے دادا کی جائیداد مل جاتی ہے، وہ شرعاً غاصب ہیں، یہ جائیداد ان کے لئے قطعاً حرام ہے، اور مسلمان قرآن و سنت کے فرمودہ پر عمل کرنے ہی میں اپنی اخروی نجات تصور کرتے ہیں، اس صورت میں ظاہر ہے کہ قانون کی اس شق پر نہ علماء کا عمل ہے نہ کسی اور مسلمان کا ہو سکتا ہے۔

دفعہ ۶ کی رو سے تعدد ازواج پر پابندی عائد کی گئی ہے، یہ بھی قرآن کریم، سنت نبوی، اور تعامل امت کے قطعی خلاف ہے، لیکن آپ جانتے ہیں، کہ بلا ضرورت شہادیوں کا ہمارے یہاں نہ رواج ہے، نہ متوسط طبقہ میں اس کی سکت ہے، اور بوقت ضرورت خود اس قانون میں بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس لئے یہ قانون نظری طور پر قرآن و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہونے

کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بے جان بھی ہے، اور پھر چونکہ بلا نکاح ”داشتہ“ رکھنے پر قانون کوئی مداخلت نہیں کرتا اس لئے جو لوگ نکاح ثانی کا ”جرم“ کر گزرتے ہیں، وہ قانون کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر منکوحہ کے لئے بیوی کی جگہ ”داشتہ“ کی اصطلاح کا سہارا آسانی سے لے لیتے ہیں یہ اس قانون کی دوسری لغویت ہے، اسی نکتہ کے پیش نظر علمائے امت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس قانون کے واضعین کے سامنے نہ تو معاشرہ کی کسی نیچیدگی کی اصلاح ہے نہ قرآن و سنت کی صحیح ترجمانی ان کا مقصد ہے بلکہ صرف صاحب بہادر کی تقلید ہے، مغربی ممالک میں نکاح ثانی جرم ہے، مگر آشنائی جرم نہیں، ٹھیک اسی نظریہ کی ترجمانی ان واضعین نے کر ڈالی ہے، بہر حال پاکستانی مسلمان قانون کی اس شق پر بھی عامل نہیں ہیں۔

دفعہ ۷ کی رو سے طلاق کو چیئرمین کی منظوری کے بغیر غیر موثر قرار دیا گیا ہے، تین طلاق کو (خواہ وہ ایک لفظ سے ہوں، یا ایک مجلس میں، یا ایک عدت میں) ایک رجعی طلاق فرض کرتے ہوئے چیئرمین کی رضامندی کو اس کے موثر ہونے میں ضروری قرار دیا گیا ہے، اور عدت عام حالات میں ۹۰ دن اور حمل کی حالت میں وضع حمل اور ۹۰ دن میں سے جو مدت زائد ہو بتلائی گئی ہے، یہ تمام امور بھی قرآن و سنت اور اجماع امت کے خلاف ہیں، لیکن علمائے امت اور عامۃ المسلمین کا عمل اب بھی اسلامی شریعت پر ہے، نہ کہ عائلی قوانین پر، چنانچہ کسی دارالافتا میں جا کر دیکھ لیجئے، کہ مسلمان ان مسائل کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرتے ہیں، اور اسی پر عمل کرتے ہیں، کیونکہ طلاق اور عدت پر بیوی کے حلال و حرام ہونے کے علاوہ نسب کے صحیح یا غلط ہو جانے کے نتائج بھی مرتب ہوتے ہیں۔

دفعہ ۱۲ میں لڑکے کے لئے ۱۸ سال اور لڑکی کے لئے ۱۶ سال ”بلوغ کی عمر“ سے پہلے نکاح کو جرم قرار دیا گیا ہے اول تو حسی طور پر لڑکے لڑکی کا اس عمر سے پہلے بالغ

ہو جانا ہی اس قانون کی لغویت کے لئے کافی ہے پھر عمر کے معاملے میں غلط اندراج کا عام رواج اس قانون کی بے بسی کے لئے کوئی معمولی مسئلہ نہیں، مزید برآں یہ کہ قانون کے علی الرغم صغریٰ کی شادیاں بدستور جاری ہیں، اس لئے یہ قانون غلط بیانی کو رواج دینے اور نکاح جیسے خالص شرعی معاملہ میں بھی ”چور بازاری“ کا دروازہ کھولنے کے علاوہ کسی مفید نتیجہ کا حامل نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس قانون میں بظاہر کتنی شدت کیوں نہ ہو، لیکن وہ اندر سے اتنا کھوکھلا ہے، کہ اپنی افادیت کے منوانے سے قاصر ہے، کسی قانون کی اصل روح اس کی بے جان دفعات نہیں، نہ اس کی اصل قوت ”بزور اقتدار“ نافذ ہو جانا ہے، بلکہ قانون کی اصل جان اس کی محبت و عظمت، متانت و رزانت، اور جامعیت اور ہمہ گیری ہے، یہ اوصاف ”خدائی قانون“ ہی میں پائے جاسکتے ہیں، لیکن جو قانون محض ہوا پرستی کے طور پر بنایا گیا ہو، اور چند بیگمات کی بے جا ہٹ سے اسے نافذ کر دیا گیا ہو، اس کا انجام وہی ہے، جو پاکستان میں عائلی قوانین کا ہوا۔

ان امور کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ عملی طور پر اس قانون کا مفلوج ہونا خود اس کی لغویت کے لئے کافی ہے، علمائے کرام افہام و تفہیم کے راستے سے اس قانون کو منسوخ کرانے کے لئے آئینی ذرائع استعمال کر رہے ہیں، اور وہ اپنا فرض جاری رکھیں گے، اب یہ ملت اسلامیہ کا اپنا فرض ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد یکسر بند کر دیں یا جن نمائندوں کے ہاتھ میں انہوں نے اقتدار کی کنجیاں دی ہیں انہیں اس کے منسوخ کرنے پر مجبور کریں۔

ڈاکٹر فضل الرحمن اور انکار قرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد

ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب جب سے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ کی حیثیت سے پاکستان میں متعارف ہوئے ہیں وقتاً فوقتاً ان کا قلم اسلامی حقائق پر مشق تحریف کرتا رہتا ہے، ملت اسلامیہ بلبلا اٹھتی ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، گویا کسی رقیب نے ان کو اطمینان دلا رکھا ہے کہ :

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ادارہ تحقیقات کے آرگن ”ماہنامہ فکر و نظر“ نے جولائی ۱۹۶۷ء سے ڈاکٹر صاحب کی انگریزی کتاب ”اسلام“ کا ترجمہ قسط وار شائع کرنا شروع کیا ہے، موصوف نے اس کتاب کے باب اول میں ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی الہی“ اور باب دوم میں ”قرآن مجید“ کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات کا اظہار کیا ہے۔ موصوف نے پہلے تو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، وحی الہی اور قرآن مجید کے بارے میں چودہ سو سالہ امت کے تمام عقائد محض افسانہ غلط اور داستان خود تراشیدہ ہیں اور یہ مسلمانوں کی ”خام عقلی“ کا کرشمہ ہے، موصوف لکھتے ہیں :

”نبوت اور الہام (۱) نبوی کا یہ تصور کہ نبی کے شعور کی سطح معمول کے مطابق ہوتی ہے۔ (۲) ہمارے راسخ العقیدہ علمائے واضح طور پر بہت بعد میں قائم کیا، پھر جب زمانہ مابعد میں نبوت کا یہ تصور قائم کر لیا گیا تو اس کے بعد اس تصور کی قصداً اشاعت کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ وحی الہی کی معروضیت (خارجی چیز ہونا) اور فرشتہ وحی کی خارجیت کا اثبات کیا جائے، یعنی اس تصور کا کہ یہ وحی الہی کوئی داخلی الہام نہ تھا، بلکہ خارج سے ایک آواز آرہی تھی، یا فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لاتا تھا۔ ممکن ہے آج ہمیں یہ کوشش عقلی (۳) ناہنجی پر مبنی معلوم ہو، لیکن ایک ایسے دور میں جب کہ عقائد اسلام زیر تشکیل تھے، بعض حالات کی بنا پر ایسی کوشش عمل میں آنی ضروری تھی، بالخصوص عقلیت (۴) پسندوں سے جو مباحث ہو رہے تھے ان کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری تھا، اسی زمانہ میں بہت سی احادیث (احادیث پر دیکھئے باب سوم) کی اشاعت عمل میں آئی،

(۱) الہام نبوی، تو خالص مستشرقانہ تعبیر ہے، وحی الہی، کہئے، مدیر۔

(۲) مبہم سا فقرہ ہے، یاد نہیں پڑتا کہ کس نے ایسا کہا ہو۔ ممکن ہے یہ تسامح ڈاکٹر صاحب کی تعبیر یا ان کی کتاب کے اردو ترجمہ میں ہوا ہو۔ (مدیر)

(۳) جی، نہیں، جس ماحول کی ترجمانی آپ ہمیں کے لفظ سے کرتے ہیں، اس میں صرف یہی حقائق نہیں بلکہ ”پیٹ اور جیب“ اور کرسی کے علاوہ بھی کچھ عقلی، ناہنجی، نظر آتا ہے، خدا، نبی، نبوت، وحی، فرشتہ جیسی چیزوں کو مان کر اس فضا میں ناہنجتہ عقلی، کا طعنہ کون سنے؟ (۴) خالص فرضی افسانہ! مغرب کے فلسفہ ارتقاء کا نیا ماڈل (مدیر)

جنہیں بعد میں سند قبولیت حاصل ہو گئی، ان احادیث میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ جبرئیل سے سب لوگوں کے سامنے ہم کلام ہوتے تھے، نیز ان میں جبرئیل کی ظاہری کیفیت کی مرقع آرائی بھی کی گئی تھی، یہ احادیث قرآن سے بالکل متناقض ہیں کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین اس کو ایک امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے قلب پر تاکہ آپ بھی منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں (سورہ الشعراء ۱۹۲) (اس سلسلے میں مزید دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۹۷) اس کے باوجود مسلمانوں کے ذہن میں یہ عقیدہ اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ جبرئیل کا وجود خارج میں ہے اور وحی الہی خارج سے رسول اللہ پر نازل ہوئی کہ اب وہ حقیقت سے آشنا ہونے پر آمادہ نہیں“

(فکر و نظر اگست ۶۷ ص ۹۳، ۹۴)

خلاصہ یہ کہ امت مسلمہ کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید ایک خارجی وجود رکھتا ہے ”بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ“ (وحی نبی کے شعور و تخیل کی آواز نہیں، بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے) اور فرشتہ وحی اسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور یہ وحی حق تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ جبرئیل آسمان سے آپ کے پاس بھیجی جاتی تھی“ یہ سب غلط اور ناپختہ عقل لوگوں کی بنائی ہوئی کہانی ہے، اسی طرح امت اسلامیہ نے حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ تمام احادیث متواترہ بھی وضع کر لیں جن میں وحی، فرشتہ وحی اور نزول وحی کی کیفیت بیان ہوئی ہے، ڈاکٹر صاحب اس کی مزید وضاحت اس طرح فرماتے ہیں :

”جب دوسری اور تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں میں وحی کی نوعیت کے متعلق سخت قسم کے اختلافات آراء اور بحثیں، جو ایک حد تک مسیحی عقائد سے متاثر تھیں شروع ہوئیں تو نئی نئی ظہور پذیر راسخ العقیدگی (۱) نے، جو اس وقت اپنے معین معقدات کی تشکیل کی نازک و فیصلہ کن منزل میں تھی، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کی خارجیت (یعنی اس کا نزول خارج سے ہوتا تھا) پر بہت زور دیا تھا، تاکہ اس طرح وحی کی ماورائیت، معروضیت اور لفظا نازل ہونے کی حیثیت کو محفوظ و مستحکم کر سکے۔

یقیناً قرآن نے خود وحی کی ماورائیت، معروضیت اور اس کے لفظاً نازل ہونے کا اثبات کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی طرح اس نے یقیناً وحی کی خارجیت کو یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کے مقابلے میں مسترد کیا ہے، وہ کہتا ہے :

وانہ لتنزیل رب العالمین نزل بہ الروح
الامین، علی قلبک لتکون من المنذرين۔ (۸۳-۸۶)

(۱) زمانے کی بوالعجبی کی بھی داود بنی چاہئے۔ قرآن کریم نے والراسخون فی العلم کہہ کر راسخ العلم، راسخ الایمان اور راسخ العقیدہ (علم، ایمان اور عقیدہ کے لحاظ سے پختہ) حضرات کی تعریف کی تھی، مگر مغربی فرزانوں نے ان ہی الفاظ کو مہذب ”دشنام طرازی“ بنا ڈالا۔ دنیا بھر کے عیوب کی فرد جرم جس شخص پر عائد کرنی ہو اس کے لئے بس ایک لفظ کہہ دیجئے ”راسخ العقیدہ مسلمان“ سبحان اللہ (مدیر)

(یہ رب العالمین (۱) کی طرف سے نازل کی گئی ہے، الروح الامین اسے لے کر تیرے دل پر اترا ہے تاکہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو)۔
نیز قرآن کا ارشاد ہے :

قل من كان عدوا لجبریل فانه نزلہ علی قلبک
(۱۷۷) کہہ دو کہ جو جبرئیل (۲) کا دشمن ہے (سو ہوا کرے) بس
وہی ہے جس نے (کلام کو تمہارے دل پر نازل کیا)۔

(۱) جی ہاں! جو وحی رب العالمین کی طرف سے اتار گئی، ایک امانت دار فرشتہ اسے لے کر آیا، اس فرشتے کا نام قرآن نے جبرئیل بتلایا، اس کے دشمن کو خدا کا دشمن کہا، اس فرشتے کو معلم وحی کہا، اس شان کی وحی اس شان کے فرشتہ وحی کا واقعی خارجی وجود ماننا تو ”خام عقلی“ ہے، ہاں ان کو وہی فرضی اور تخیلاتی چیز ماننا البتہ پختہ عقلی ہے۔ عجب نہیں کہ کل کو ”رب العالمین“ کا واقعی وجود راسخ العقیدگی کی ”خام عقلی قرار پائے“ اور عقلاً مغرب میں تو بہت سے اس کے قائل بھی ہیں۔ (مدیر)

(۲) ڈاکٹر صاحب کی جبرئیل دشمنی کے لئے کیا یہی آیت کافی نہیں؟ ضرورت اگر زیادہ کی ہو تو آگے کی آیت بھی پڑھ لیجئے ”من كان عدواً لله وملائکته ورسله و جبریل ومیکال فان الله عدو للکفرین“ (جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا اس کے رسولوں کا بالخصوص جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اور ذہن میں یہ بھی رکھئے کہ یہ دونوں آیتیں ان یہود کے رد میں نازل ہوئیں جنہوں نے کہا تھا کہ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر جبرئیل آتا ہے اور وہ ہے ہمارا دشمن۔ اس لئے ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان نہیں لاتے، گویا یہود کی، جبرئیل دشمنی، اس سلسلہ عداوت کا مبداء تھا، اور ڈاکٹر صاحب کی جبرئیل دشمنی، اس کا منتہا ہے، تشابہت قلوبہم کی کتنی اچھی مثال خود موصوف کے ترجمہ سے نکل آئی۔ (مدیر)

لیکن راسخ العقیدگی۔۔۔۔ اور یقیناً قرون وسطیٰ کا تمام فکری سرمایہ۔۔۔۔ ایسے ضروری عقلی ذرائع سے محروم تھی جن سے ایک طرف وہ اپنے نظام معتقدات کی تشکیل میں وحی کی ماورائیت اور لفظاً "نازل ہونے کی حیثیت اور دوسری طرف پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عمل اور آپ کی مذہبی شخصیت کو ملا سکتی، یعنی یہ راسخ العقیدگی اتنی عقلی استعداد نہ رکھتی تھی کہ یہ دونوں باتیں کہہ سکتی کہ قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے اور عام معنوں میں یہ اسی طرح پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی ہے۔ یہ واضح ہے کہ قرآن ان دونوں باتوں کو مانتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ قرآن کا نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ہوا ہے تو وہ آپ سے ایک خارجی چیز کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔ لیکن راسخ العقیدگی نے حدیث یا رسول اللہ سے مروی روایات کے ذریعہ جو کسی قدر مناسب و موزوں تعبیرات تھیں اور کسی قدر گھڑی گئی (۱) تھیں اور علم دینیات کی مدد سے جو زیادہ تر حدیث پر مبنی تھا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کو تمام تر کانوں سے سنی جانے والی اور آپ کی ذات سے خارج چیز بنا دیا اور اس فرشتے اور "الروح الامین" کو جو آپ کے دل پر وحی لے کر نازل ہوتا تھا۔ تمام تر ایک

(۱) یہ تو بڑا مبہم سا بیان ہے دعویٰ کتنا سنگین اور دلیل سرے سے غائب؟ صاف بتلانا چاہئے تھا کہ فلاں فلاں "راسخ العقیدہ صاحبان" نے، فلاں تاریخ کو، فلاں حجرے میں بیٹھ کر، فلاں فلاں افسانے گھڑے، اور فلاں فلاں کتاب میں اس کا ریکارڈ موجود ہے، دلیل کے بغیر دعویٰ تو کسی بھی محقق کے لئے روا نہیں، خواہ وہ راسخ عقیدہ کا ہو یا خام عقیدہ کا (مدیر)

خارجی عامل قرار دے دیا، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کی آج مغرب (۲) نے جو تصویر کھینچ رکھی، اس کا زیادہ تر انحصار قرآن کے بجائے راسخ العقیدگی کے اس مشکل عقیدے پر ہے جیسے کہ ایک عام مسلمان بھی مانتا ہے۔“ (فکرو نظر اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲۵-۲۵۱)

ڈاکٹر صاحب کے اس طویل اقتباس میں جن توہینات کو سامنے لایا گیا آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ اسلام کا تصور نبوت، تصور وحی، فرشتہ وحی کا وجود خارجی، آسمان سے آپؐ پر وحی کا نزول اور تمام اسلامی عقائد دوسری اور تیسری صدی کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔

۲۔ اسلام کی چودہ صدیوں کے کروڑوں علما، عقلا، مجدد، فقیہ، متکلم، محدث، مفسر، فلسفی، سب کے سب اتنی عقلی استعداد سے بھی محروم رہے کہ وہ وحی الہی کا صحیح مفہوم تک سمجھ سکیں۔ یہ ”عقل کل“ خوش قسمتی سے صرف ڈاکٹر صاحب موصوف یا ان کے مستشرق اساتذہ کو نصیب ہوئی ہے، ورنہ قرون وسطیٰ سے آج تک پوری کی پوری امت کو علم و عقل سے کیا مس تھی۔ (لعنت آخر هذه الامة اولها) یعنی پچھلوں کے پہلوں پر لعنت کرنے کی یہ کتنی عجیب صورت ہے؟

۳۔ قرآن مجید صرف کلام اللہ ہی نہیں (جیسا کہ مسلمانوں کا ایمان ہے) بلکہ وہ واقعتاً پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے (ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کلام اللہ ہونے کا مفہوم آگے آتا ہے)۔

(۲) لیکن بنیادی فرق ”مغرب کی کھینچی ہوئی تصویر“ اور تحقیقاتی ادارے کی ”مشرقی تصویر“ میں بھی تو نمایاں نہیں۔ بلکہ یہ مشرقی تصویر اسی کا ”عکسِ چربہ“ نظر آتا ہے۔ (مدیر)

۴۔۔۔۔۔ چونکہ قرآن نے یہ تصریح کرتے ہوئے کہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے، اور جبرئیل امین اسے لے کر آئے ہیں، دو جگہ یہ کہا ہے کہ قرآن کا محل نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اطہر ہے، اس لئے فرض کر لینا چاہئے کہ قرآن آپ کی ذات سے خارج چیز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ آپ کے ذہن و شعور ہی سے ابھری ہوئی آواز ہے۔ جیسا کہ آگے تصریح آتی ہے۔

۵۔۔۔۔۔ وحی و رسالت، قرآن اور فرشتہ وحی سے متعلق تمام ذخیرہ حدیث اور اس پر مبنی علم و بینات (علم عقائد) محض مسلمانوں کی من گھڑت ہے۔

۶:۔۔۔۔۔ مغربی مستشرقین نے اسلام، نبی اسلام اور قرآن کے بارے میں جو اعتراضات کئے ہیں ان کا انحصار چونکہ اسلام کے غلط عقائد پر ہے اس لئے یہ اعتراضات صحیح ہیں، ان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ یہ تمام عقائد جن کو ایک عام مسلمان بھی مانتا ہے، ان سب کا انکار کر دیا جائے (۱)

اسلام، قرآن، نبوت، وحی، فرشتہ وحی کے بارے میں تو ڈاکٹر صاحب کے نظریات واضح ہو گئے جن کا مختصر خلاصہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے تمام بنیادی عقائد غلط اور خام عقلی کا نتیجہ ہیں جن سے ان کو فوراً دستبردار ہو جانا چاہئے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے فہم سلیم نے قرآن کے کلام اللہ ہونے کا کیا مفہوم تجویز کیا ہے؟ اس کی وضاحت ابھی باقی ہے، جس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے تمہیداً تین مقدمات ذکر کیے ہیں پہلے مقدمہ میں قرآن کے ”بنیادی محرک“ کو پیش کرتے ہوئے امر اللہ، اسلام اور عبادت کی تفسیر وہ اس طرح فرماتے ہیں :

۱) اس پر افسوس جتنا چاہے کر لیجئے لیکن حیرت ذرا بھی نہیں، آخر مغربی شاطروں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ (مدیر)

”قرآن کا ”بنیادی روحانی محرک“ اخلاقی ہے، اور اسی سے اس کا توحید اور ساتھ ساتھ اجتماعی عدل پر زور دینے کا سوتا پھوٹتا ہے، اخلاقی قانون غیر متغیر ہے، یہ ”امر اللہ“ ہے انسان نہ تو اخلاقی قانون بنا سکتا ہے اور نہ اسے ختم کر سکتا ہے، انسان کو اسے تسلیم کرنا چاہئے اس کا اس طرح تسلیم کرنا ”اسلام“ کہلاتا ہے، اور اس کو زندگی میں عملی شکل دینا ”عبادت“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔“

(فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲۵۲)

دوسرے مقدمے میں وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اخلاقی قانون کی دریافت میں لوگوں کی استعداد نیز ایک ہی فرد کی باطنی زندگی مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے تیسرے مقدمہ میں وہ یہ بتلاتے ہیں کہ پیغمبر کی شخصیت کا عام معیاری اور مجموعی کردار کہیں زیادہ اعلیٰ و برتر ہوتا ہے عام انسانیت کے کرداروں سے وہ ایک ایسی شخصیت ہوتی ہے جو روز اول سے لوگوں بلکہ ان کے اکثر نصب العینوں کے بارے میں بڑی بیتاب ہوتی ہے اور تاریخ کی نئی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔

مذکورہ بالا ان تینوں مقدمات کو ایک دفعہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب سنئے کہ قرآن واقعتاً کلام پیغمبر ہونے کے باوجود محض رسمی طور پر کیوں کلام اللہ کہلاتا ہے۔ فرماتے ہیں :

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شخصیت تھے، درحقیقت ایسی شخصیت صرف وہی تھے جس سے کہ صحیح معنوں میں تاریخ واقف ہے اسی لئے آپؐ کا مجموعہ اسوہ مسلمانوں کے نزدیک سنت یا ایک مثالی نمونہ مانا جاتا ہے، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایسے

لمحات بھی آتے تھے، جب کہ آپؐ جیسا (۱) کہ ہوتا تھا اپنے آپ سے پرے گزر جاتے تھے، اور آپؐ کا اخلاقی عارفانہ اور اک اتنا تیز اور اتنا شدید ہو جاتا تھا کہ آپؐ کا شعور اور خود اخلاقی قانون ایک ہو جاتے تھے۔“

(ص ۲۵۳)

خلاصہ یہ کہ اخلاقی قدریں ”امر اللہ“ ہیں اور نبیؐ اپنے لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان قدروں کا سراغ لیتا ہے، اس ”اپنے آپ سے پرے گزر جانے“ کی وجہ سے اخلاقی قدریں۔۔۔۔۔ خود بخود الفاظ میں ڈھل کر نبیؐ کے قلب میں وارد ہو جاتی ہیں، اس طرح اخلاقی قدروں کا قلب اطہر پر وارد ہونا ”نزل وحی“ ہے اور یہ تمام الفاظ اگرچہ نبیؐ کے ذہن و شعور سے پیدا ہوئے، مگر چونکہ ان الفاظ میں اخلاقی قدروں کا نبیؐ کو شعور حاصل ہوا، صرف ”اس لحاظ“ سے اسے کلام اللہ کہنا چاہئے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں :

” اخلاقی قانون اور مذہبی قدریں اللہ کا امر ہیں اور گو وہ پوری طرح اللہ کی عین نہیں لیکن اس کا حصہ ضرور ہیں“ اس لحاظ سے قرآن خالصاً ”کلام اللہ ہے۔“

(ص ۲۵۳)

جس طرح کہ ایک شاعر اپنے وجدان کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے، اپنے احساسات و تصورات میں کھو جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے تخیلات خود بخود اشعار کی شکل میں ڈھل کر زبان پر جاری ہو جاتے ہیں جسے مجازاً ”شاعرانہ الہام“ کہا جاتا ہے، اسی طرح نبیؐ کا اخلاقی شعور جب قدروں کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے تو اس کے احساسات و

① اس لئے زور تحقیق میں قلم کی کلفت بھی تو ملاحظہ کیجئے۔ ”جب کہ آپؐ جیسا کہ ہوتا تھا اپنے آپ سے پرے گزر جاتے تھے“ کیا بات ہوئی؟ (مدیر)

تصورات مخصوص الفاظ میں خود بخود ڈھل جاتے ہیں، اسی کو عام زبان میں پیغمبرانہ الہام لفظاً و معنی وحی کہا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”احساسات، تصورات اور الفاظ کے درمیان یقیناً ایک نامیاتی و فطری رشتہ پایا جاتا ہے، الہام حتیٰ کہ ”شاعرانہ الہام“ میں بھی یہ رشتہ اتنا مکمل ہوتا ہے کہ احساس، تصور، لفظ سب مل کر ایک پیچ در پیچ کل بن جاتے ہیں، جس کی کہ خود اپنی زندگی ہوتی ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی وجدانی ادراک ترقی کر کے بلند ترین درجے پر پہنچا اور وہ ادراک خود اخلاقی قانون کا عین بن گیا، تو الہام کے ساتھ الفاظ کا بھی نزول ہوا، چنانچہ قرآن خالصاً کلام الہی ہے لیکن بیشک اس کے ساتھ وہ اتنا ہی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عمیق ترین شخصیت سے بہت زیادہ مربوط ہے، اور قرآن اور آپ کی شخصیت کے اس ربط کا تصور میکا کی طور پر اس طرح نہیں کیا جاسکتا جیسے کہ فوٹو گرافر، اور ریکارڈ کا ربط ہے کلام الہی کا سوتا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب سے پھوٹ کر نکلا ہے۔“

(ص ۲۵۳)

الغرض نبیؐ کے ذاتی احساسات و تصورات جب اخلاقی قدروں سے ہمکنار ہوئے اور انہوں نے الفاظ سے نامیاتی اور فطری ربط کی بنا پر ”پیچ در پیچ کل“ کی حیثیت اختیار کر لی، تو آپؐ کے یہی ذاتی احساسات و تصورات الفاظ قرآن کی شکل میں آپ کے قلب سے پھوٹ پڑے، اس لئے آپؐ کے احساسات و تصورات کے اخلاقی قدروں سے متحد ہو جانے کی وجہ سے انہیں کلام الہی کہا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ احساسات، یہ تصورات، یہ ادراک، یہ شعور، یہ اخلاقی قدریں اور یہ الفاظ سب کے

سب اول سے آخر تک آپ ہی کی عمیق ترین شخصیت سے ابھرے اور آپ ہی سے ان تمام چیزوں کا تعلق ہے اس لئے درحقیقت یہ پیغمبر ہی کا کلام ہے۔

لفظی گورکھ دھندوں سے قطع نظر ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ جہاں اسلام کے تصورات نبوت اور عقیدہ وحی پر کاری ضرب لگاتا ہے وہاں مشرکین مکہ سے مستشرقین یورپ تک کے اس دعویٰ کی خوبصورت توجیہ بھی پیش کرتا ہے کہ ”قرآن نبیؐ کے اپنے شعور سے ابھری ہوئی آواز ہے“ آسمانی وحی اور خدائی پیغام سے اس کا کوئی تعلق نہیں“ یہ نظریہ بتلاتا ہے کہ قرآن میں ذکر کردہ تمام حقائق خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیز ترین شعور کی دریافت ہیں، کسی خارجی ذات (خدائے علام الغیوب) کی اطلاع نہیں اس نظریہ پر سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ تھا کہ قرآن حکیم میں سینکڑوں حقائق ایسے بیان ہوئے جن تک انسانی ادراک و شعور کی رسائی قطعاً غیر معقول ہے مثلاً انبیائے سابقین کے قبل از تاریخ حالات جو قرآن حکیم میں شرح و سطر سے بیان کئے گئے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احساس و شعور کو کتنا ہی تیز اور شدید فرض کر لیجئے لیکن عقل کسی طرح نہیں مانتی کہ ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی خارجی ذات کی اطلاع کے بغیر محض تیزی شعور کی وجہ سے دریافت کر لیں، ڈاکٹر صاحب نے اس معما کا حل یہ نکالا ہے کہ یہ واقعات اسلام سے پہلے زبان زد عام تھے جن کی تاریخی صحت بھی ضروری نہیں کہ صحیح اور واقعی ہو، اور کسی ذریعہ سے آپ کو ان کا علم پہلے ہی سے تھا، چونکہ آپ کے پیغام کی اہمیت و معنویت سے ان کا گہرا ربط تھا اس لئے وحی الہی کی حیثیت سے وہ آپ کے قلب پر موجزن ہو گئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

”ان تفصیلات کی تاریخی صحت کس درجہ کی ہے؟ یعنی انبیا

سابقہ کے واقعات و حالات سے جو زمانہ ماقبل اسلام زبان زد عام تھے

یہ تفصیلات کہاں تک مطابقت رکھتی ہیں؟ یہ سوال دلچسپ تو ضرور ہے، لیکن مشکلات سے لبریز بھی ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی اہمیت و معنویت کے لئے یہ سوال کچھ زیادہ (۱) اہمیت نہیں رکھتا کہ قرآن نے انبیاء سابقہ کے جن حالات و واقعات کا ذکر کیا ہے ان کا مواد کہاں سے اخذ کیا گیا تھا؟ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی معنویت اس مقصد میں پنہاں ہے جس کے لئے یہ مواد استعمال کیا گیا، اس لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ اس مواد سے کیا کام لینا مقصود تھا قرآن نے ان حالات و واقعات کے بارے میں یہ ضرور کہا ہے کہ یہ وحی الہی (۲) کے منکشف کردہ حقائق ہیں، لیکن جس چیز کا وحی الہی سے خاص طور پر تعلق ہے، وہ ان واقعات کی معنویت یا بالفاظ دیگر وہ مقصد ہے جس کی خاطر یہ واقعات بیان کئے گئے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے (۳) ہی سے ان واقعات کا علم نہ ہوتا اور انہیں صرف وحی کے منکشف کردہ واقعات کی خبر ہوتی تو آپ کے لئے یہ

(۱) جی نہیں! زیادہ اہمیت تو کجا یہ سوال ہی سرے سے لغو ہے، کیا خدا کے بارے میں یہ پوچھا جائے کہ اس نے فلاں واقعہ کہاں سے معلوم کیا؟

(۲) جزاک اللہ! بات ادھوری نہ رہتی اگر ساتھ کے ساتھ قرآن کی یہ تصریح بھی ذکر کر دی جاتی: ”ما کنْتَ تعلمُہا انت ولا قومک من قبل ہذا“ - (اس غیبی اطلاع سے پہلے ان واقعات کو نہ آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم) (ہود: ۴۹)

(۳) وحی الہی کا انکشاف اور پہلے سے علم یہ دونوں باتیں جمع کیسے ہو گئیں؟ تعجب ہے کہ اچھے خاصے سنجیدہ، پڑھے لکھے اور اونچے درجہ کے دانا بھی ایسے صریح تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں؟

سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ آپؐ کو کیا سمجھانا

چاہتا ہے۔“ (۱)

(فکر و نظر اگست ۱۹۶۷ء ص ۹۷)

ڈاکٹر صاحب اگر قرآن مجید کو وحی مان کر اتنی سی سیدھی بات کہہ دیتے کہ ”یہ واقعات آپؐ کو اللہ علام الغیوب نے بتلائے تھے“ تو چونکہ اس سے مستشرقین کا سارا ذہنی طلسم ہی ٹوٹ جاتا، اور خود موصوف کا نظریاتی نگار خانہ، اور عقلی گھروندا دھڑام سے زمین پر آ رہتا تھا، اس لئے وہ پہلے تو وحی کے منکشف کردہ واقعات کا سرا ”قبل از اسلام زبان زد عام“ ہونے سے جوڑتے ہیں، پھر ان کی ”تاریخی صحت“ سے آنکھیں بند کر لینے کی لوگوں سے اپیل کرتے ہیں، پھر ان کی عقلیت کا سارا زور یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے، کہ اگر یہ واقعات خدا ہی نے بتلائے ہوتے تو آپؐ خدا کی مراد کو کیسے سمجھ پاتے؟

ع کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

ہم نے اس مقالہ میں صرف ڈاکٹر صاحب کے نظریہ کی تشریح تک اپنی بحث کو محدود رکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کے نظریہ وحی کا حدود اربعہ، پس منظر اور تہ منظر کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے تو مستقل بحث کی ضرورت ہوگی، لیکن اتنا جاننے کے لئے تو غیر معمولی علم و عقل کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے ان نظریات کا دین اسلام سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ انکار وحی و قرآن کے ذریعہ اسلام کی بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہیں؟

موصوف نے ازراہ کرم قرآن، وحی، نبوت، جبرئیل کے بارے میں امت

(۱) اتنی سطحی بات؟ اتنے بڑے محقق کے قلم سے؟ غلطی ہائے مضامین مت پوچھ۔ غریب مستشرقین کو بھی یہ نئی منطق کب سوچھی ہوگی جو ان کے شاگردوں نے ایجاد کر ڈالی؟

اسلامیہ کو جن تحقیقات سے روشناس کرایا ہے ذرا سوچئے ان کا حاصل کیا نکلا؟ اشتراقی نظریات کا ”شیش محل“ اسلام اور مغربیت کا ملغوبہ، ایمان و یقین سے گریز و فرار، اقرار و انکار کا پرتیج معما، تضاد بیانی کا مرقع، الفاظ و تعبیرات کا طلسم سامری، اسلامی اصطلاحات کی بیخ کنی، تغلیط اسلام کے لئے منصوبہ سازی، اسلام کش ذہنیت کی پردہ داری نئی نئی اصطلاحات کی نقاب پوشی، پوری امت کی مہذب تہمتیں، بے معنی لفاظی، مہمل طرز استدلال، بے ربط افسانہ طرازی، عقل و دانش کا المیہ، فکر و نظر کا ماتم۔

یہ ہے وہ سرمایہ فکر و نظر جس سے اسلام، اسلامی اصطلاحات، اور قرآنی حقائق کے تیج و خم سیدھے کیے جاتے ہیں! یہ ہے وہ تحقیقاتی مہم، جس کے ذریعے صریح کفریات کو ”جدید باطنیت“ کے حسین پردوں میں لپیٹ کر اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے ہر دور میں ملاحدہ کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ اسلامی اصطلاحات کی نئی نئی تعبیرات سے لوگوں کے دین و ایمان کو برباد کیا جائے، اور قدیم الفاظ کو جدید معنی پہنائے جائیں ڈاکٹر صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں، اگر ان کے لئے بھی اسلام میں گنجائش نکل سکتی ہے اور یہ صریح کفریات بھی اگر قابل تاویل ہیں، تو کفر و ایمان کی تفریق کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے، اس وقت نہ صرف ہمیں قرامطہ، باطنیہ، اسمعیلیہ، بابیہ، بہائیہ، مرزائیہ جیسے گمراہ فرقوں کے کفریات میں تاویل کرنا پڑے گی، بلکہ شاید ابو جہل و ابولہب کے کفر میں تاویل کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا۔ آخر جب ایمان و کفر کوئی مسئلہ ہی نہ ہو تو مومن کافر کا سوال ہی کب پیدا ہوگا؟

بہر حال کسی حقیقت کو الفاظ و تعبیرات کے غلیظ پردوں میں چھپانا ممکن نہیں، ڈاکٹر صاحب کی یہ نئی تحقیق انکار قرآن کی وہی فرسودہ کوشش ہے جو مشرکین سے مستشرقین تک اپنے تسلسل کے ساتھ جاری ہے، اگرچہ اس کی شکلیں بدلتی رہا کرتی

ڈاکٹر فضل الرحمن کی کج بیانی

حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی سے قبل کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”جب آپ شباب کو پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قوائے ظاہر و باطن کی تکمیل ہو چکی تو آپ کو چونکہ ملائکہ کے ساتھ مشابہت تھی اس لئے ملائکہ آپ کے سامنے متمثل ہوئے اور جب وہ آپ کو مخاطب کرتے تو آپ ان کی آواز سنتے۔“

آگے آغاز وحی کا بیان ہے :

”آپ ابھی غار حرا ہی میں تھے کہ آپ پر وحی نازل ہوئی شروع ہوئی، آپ کے دل میں اس سے طبعاً ”تشویش پیدا ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ملکیت کے شدت کے ساتھ ظہور پذیر ہونے اور آپ کے قویٰ پر یکسر ملکیت چھا جانے سے بہیمیت پر گھبراہٹ طاری ہوئی، چنانچہ (ام المؤمنین) حضرت خدیجہ خاتون (رضی اللہ عنہا) آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو کتب سابقہ کا ماہر عالم تھا۔ اس نے کیفیت حال سن کر کہا :

”یہ فرشتہ جو تم نے دیکھا (وہی) ناموس اکبر ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کا پیغام پہنچایا تھا اس کے

بعد وحی کے نزول میں وقفہ پڑ گیا اور کچھ دنوں تک آپ پر وحی نازل نہ ہوئی۔“

اور اس انقطاع وحی کے وقفہ میں شاہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ :
 ”آپؐ کو یہ فرشتہ (ناموس اکبر یا جبرئیل علیہ السلام) کبھی تو زمین و آسمان کے درمیان نہایت شان کے ساتھ کرسی پر بیٹھا نظر آتا، اور کبھی وہ آپؐ کو مسجد حرام میں کھڑا دکھائی دیتا، جس کی کمر کعبہ شریف کی بلندی تک پہنچی ہوئی دکھائی دیتی۔“
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی ”شاہ صاحبؒ“ لکھتے ہیں کہ :

”آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! آپؐ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا کبھی مجھ کو گھنٹی بجنے کی سی آواز سنائی دیتی ہے، یہ میرے لئے وحی کی سخت ترین قسم ہے جب یہ حالت مجھ سے زائل ہو جاتی ہے تو جو کچھ فرشتہ نے کہا ہوتا ہے وہ میرے ذہن میں محفوظ ہو چکا ہوتا ہے بعض اوقات فرشتہ میرے سامنے آدمی کی شکل میں متمثل ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ میں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہوں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فرشتہ کے آدمی کی شکل میں متمثل ہونے کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں :

”تمثل اس وقت وقوع میں آتا ہے جب کہ عالم مثال اور عالم شہادت (بالفاظ دیگر عالم روحانی اور عالم مادی) کے احکام ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے ہوں، یہی وجہ ہے آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعض صحابہ کرام کو تو فرشتہ وحی نظر آتا تھا لیکن بعض دوسرے صحابہ اس کے دیکھنے سے محروم تھے۔“ (۱)

واضح رہے شاہ صاحبؒ کا یہ بیان ان متواتر احادیث کا خلاصہ ہے، جو نزول وحی سے متعلق تمام کتب احادیث میں موجود ہیں۔

تفہیمات الہیہ کی ۶۵ ویں تفہیم میں مختصراً ”اسلامی عقائد ذکر کئے گئے ہیں جسے شاہ صاحب نے ”اشہد اللہ ومن حضر من الملائکة والجن والانس انی اعتقد بضمیم قلبی“ کے الفاظ سے شروع کیا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں :

”اور قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی وحی ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف فرمائی، اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ ہے ”وحی کی حقیقت“ اور اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات میں کجروی جائز نہیں، اس لئے (وحی کا) اطلاق شرع پر موقوف ہے۔ اور اس سے پہلے فرشتوں کا بیان ہے :

” اور اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے ہیں، بعض آسمان پر مقربان بارگاہ ہیں، بعض انسانوں کے اعمال نامے لکھنے پر مقرر ہیں،

(۱) اردو ترجمہ مجتہد اللہ البالغہ ج ۲ ص ۸۰۲ تا ۸۰۴۔ از مولانا عبد الرحیم مرحوم۔ شائع کردہ

بعض بندوں کی حفاظت پر، بعض خیر کی دعوت پر، بعض اس کام پر مقرر ہیں کہ بندوں کے دل میں خیر کی بات ڈالیں۔ ہر ایک کے لئے ایک معین مرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جو حکم دیں اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جائے۔“

(تفہیمات الیہ ج ۱ ص ۱۴۶)

اس سے آگے تفہیم میں شاہ صاحب نے بتلایا کہ اولہ شریعہ کے اعتبار سے ظاہر شریعت کے علی الترتیب یہ چار درجے ہیں :

۱۔ وہ مسائل جو قرآن حکیم میں منصوص ہیں بایں طور کہ اس کی مراد اہل لسان کے یہاں واضح ہے۔

۲۔ وہ مسائل جو احادیث مستفیضہ سے ثابت ہیں، یعنی وہ صحیح احادیث جو صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا مالک میں کم از کم تین صحابہ سے اختلاف فاحش کے بغیر مروی ہیں، اور اپنے مفہوم میں واضح ہیں۔

۳۔ وہ مسائل جو اخبار احاد سے ثابت ہیں اور صحابہ و تابعین کے جم غفیر کے آثار سے موید ہیں۔

۴۔ وہ مسائل جو استنباط صحیح اور قیاس جلی سے ثابت ہیں اور فقہاء کی جماعت اس کی صحت پر متفق ہے، اس تفصیل کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں :

” یہ تمام مسائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح شریعت اور آپؐ کی سنت کا جداہ مستقیم ہے، جس کا رشد واضح اور اس کی قدر غالب ہے، جو شخص اس کے خلاف کہے گا اس کی بات اسی کے منہ پر رد کر دی جائے گی۔ قرآن کریم، حدیث مشہور، اجماع امت یا قیاس جلی کے خلاف کہنے والا قطعاً معذور نہیں بلکہ مردود ہے) البتہ اس کے ماسوا میں معذور قرار دیا جاسکتا ہے تاوقتیکہ حدیث اس کے سامنے نہ آجائے اور حجاب مرتفع نہ ہو جائے، پھر معاملہ واضح ہو جانے کے بعد اس کے مقلد کا عذر بھی مسموع نہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کرتا بلکہ اپنے امام کے قول پر عمل کرتا ہوں خواہ صحیح دلیل اس کے خلاف ہو۔ سو تم پر لازم ہے، کہ شریعت کے جو مسائل اس مرتبہ میں ثابت ہیں انہیں خوب غور و فکر سے غیر منصوص مسائل سے ممتاز کرو، انہیں ہر دم پیش نظر رکھو، انہیں اپنے دل میں خوب بٹھا لو، پھر انہیں دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور ہاتھوں کی پوری قوت سے ان کا دامن تھام لو اور جو اس کے خلاف کہے کبھی اس کی طرف کان بھی نہ دھرو۔“

(تفہیمات البیہ ج ۱ ص ۱۵۵)

ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کی انگریزی کتاب ”اسلام“ اپنی زبان، انداز نگارش اور طرز استدلال ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ مندرجات اور مرکزی کردار کے اعتبار سے بھی استشرافی افکار کا خلاصہ ہے۔ گولڈ تسیر سے پروفیسر شاخت تک مستشرق ملاحدہ نے اسلام اور رجال اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ رد و قبول اور تنقیح و تہذیب کے بعد مصنف نے اسے

اسلامی تعبیر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اسے آپ استشراف کا اسلامی ایڈیشن کہہ لیجئے یا اس کا نام ”اسلام کا استشراف ایڈیشن“ رکھ لیجئے، ہو سکتا ہے کہ اس تصنیف سے مستشرق برادری میں مصنف کا نام بلند ہو گیا ہو اور جو حضرات ”وحدت ادیان“ کے فلسفہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس تصنیف کے ذریعے مشرق و مغرب کا ذہنی فاصلہ سمٹتا ہوا دیکھ کر ان میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ہو، مگر یہ بھی احتمال ہے کہ اہل نظر مستشرقین بھی اس ملعوبے کو پسندیدہ نظر سے نہ دیکھیں، جس طرح شیخ ابو علی سینا نے ”فلسفہ ارسطو“ کو مسلمان بنانے کے لئے اسلام اور فلسفہ سے ملا جلا معجون مرکب تیار کر ڈالا تھا، اس سے اسلامی حلقے تو نالاں تھے ہی، خود فلاسفہ نے بھی اسے فلسفہ ارسطو پر ظلم قرار دیا اور ابن رشد وغیرہ نے اس پر گرفت کی۔

لیکن اس کتاب میں اسلام اور اسلامی عقائد بالخصوص وحی و نبوت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے انہیں تسلیم کر لینے کے معنی اسلام پر خط تنسیخ کھینچ دینے کے ہیں اس لئے اسلامی حلقوں میں اس کی پذیرائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پاکستان میں اس کے متعارف ہوتے ہی اس کے خلاف رد عمل شروع ہوا اور یہاں کے تمام مسلمان حلقوں کی جانب سے اس پر اظہار نفرت کیا گیا۔ مصنف نے جو خوش فہمی کی بنا پر اسلامی حلقوں میں بھی اس کی مقبولیت کے متمنی ہیں، اس سلسلہ میں اخبارات کو ایک معذرتی بیان دیا ہے کہ وحی کے بارے میں انہوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں، کچھ اسی قسم کے خیالات ان سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی اور بعض دیگر مسلم مفکرین بھی پیش کر چکے ہیں اور انہوں نے یہ سب کچھ گویا ان بزرگوں کی تقلید و تتبع میں کہا ہے۔“

جس طرح بعض حقائق اپنی فطری صداقت میں کسی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ وہ بذات خود اتنے ٹھوس اور مبنی بر صداقت ہوتے ہیں کہ سلیم طبائع

انہیں بلا دلیل بغیر کسی ہچکچاہٹ کے قبول کر لیتی ہیں، اسی طرح بعض مفروضے بدیہی طور پر اس قدر غلط ہوتے ہیں اور انہیں سنتے ہی آدمی پکار اٹھتا ہے ”سبحانک ہذا بہتان عظیم“ ڈاکٹر صاحب اپنی اس ”معذرت“ سے ممکن ہے بعض ایسے بزرگوں کو اطمینان دلانے میں کامیاب ہو سکے ہوں جنہیں معلوم نہیں کہ شاہ ولی اللہ کون تھے، اور کیا تھے؟ لیکن جن لوگوں کو شاہ صاحب ”صحیح مطالعہ کا تھوڑا بہت موقع ملا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو ”عذر گناہ“ کی مجبوری تو تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ شاہ صاحب کو بھی ڈاکٹر صاحب کی ان تحقیقات کا موید مان لیں۔۔۔ کیا اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طرح شاہ صاحب بھی:

- ۱۔ قرآن کو پورے کا پورا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام کہتے ہوں؟
- ۲۔ قرآن مجید کو نبی کے احساسات و خیالات اور شعور سے ابھری ہوئی آواز قرار دیتے ہوں۔
- ۳۔ فرشتہ وحی (جبرئیل) کے وجود خارجی کے منکر ہوں اور ملا اعلیٰ سے نزول وحی کا مذاق اڑاتے ہوں؟
- ۴۔ تمام ذخیرہ احادیث کو جن میں وحی اور فرشتہ وحی کا ذکر آتا ہے، معاذ اللہ من گھڑت افسانہ قرار دیتے ہوں؟
- ۵۔ اسلام کے بنیادی عقائد کو ناپختہ عقل نادانوں کی خود تراشیدہ داستان تصور کرتے ہوں؟
- ۶۔ اسلام کے کروڑوں علماء صلی اور فقہاء و محدثین کو ”ناپختہ عقل“ یقین کرتے ہوں؟
- ۷۔ عقیدہ تقدیر، معراج، شفاعت، نماز پنج گانہ، نزول عیسیٰ علیہ السلام جیسے قطعیات کی نفی کرتے ہوں؟
- ۸۔ قرآن کے ذکر کردہ واقعات کی تاریخی صحت کو مشکوک اور مشکلات سے لبریز مانتے ہوں؟ وغیرہ ذالک من الہفوات والطامات۔

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو ڈاکٹر صاحب کے اس معذرتی بیان کو ان کے سوا اور کیا کہا جائے لقد جثم شیئا ادا۔

.....

دراصل ”کج ذہن“ سے غلط نظریات اگلنا اور ان پر قابل احترام بزرگوں کے نام لپیٹ کر مسلمانوں کے حلق میں اتارنا اہل زلیغ کی قدیم عادت ہے، ہوتا یہ ہے کہ لوگ ادھر ادھر سے غلیظ نظریات کی پوٹ جمع کر لیتے ہیں اسے تاویل و تحریف کی غلط منطق سے حسین و جمیل پردوں میں لپیٹ کر امت اسلامیہ کے سر دھرنا چاہتے ہیں اور جب یہ طلسمی پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے تو مسلمہ شخصیتوں کا نام لے کر باطل کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا جاتا ہے۔ یاد ہو گا کہ یہود و نصاریٰ تحریف شدہ یہودیت و نصرانیت کی ترویج کے لئے اس پر ابراہیمی چھاپ لگا دینا ضروری سمجھتے تھے، قرآن حکیم نے ان کی اس غلط منطق پر گرفت کرتے ہوئے فرمایا :

”یا اهل الكتاب لم تحاجون فی ابراهیم وما
انزلت التوراة والا انجیل الا من بعده افلا تعقلون۔“
(آل عمران - ۶۵)

ترجمہ: ”اے کتاب والو! ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں ناحق
حجت بازی کیوں کرتے ہو حالانکہ تورات و انجیل تو ان کے بعد نازل
ہوئیں۔ تمہیں اتنی بھی عقل نہیں۔“

اس امت میں جن باطل فرقوں نے جنم لیا (جنہیں ملت اسلامیہ کے گندے
غدود کہنا صحیح ہوگا) وہ بھی اپنے ملحدانہ معتقدات کی ترویج کے لئے یہی حربہ استعمال
کرتے تھے، کہیں تاویل و تحریف کی سان پر چڑھا کر کتاب و سنت کے کس بل نکالے
جا رہے ہیں اور انہیں توڑ مروڑ کر عقائد باطلہ پر منطبق کیا جا رہا ہے، کہیں ائمہ ہدٰی

کا تمسخر کیا جا رہا ہے، کہیں قابل احترام اکابر کی طرف ان مزخرفات کی جعلی نسبت کی جا رہی ہے، اور ان کی سیدھی سادی عبارتوں کو ایسے معنی پہنائے جا رہے ہیں، جن کی ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔ ”صوفی نما“ ملحدین کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ نے صحیح لکھا ہے :

وهذا بناء على اصول هولاء الفلاسفة الكفار
الذين هم اكفر من اليهود والنصارى الذين سلک
هولاء سبيلهم ولكن غيروا عبارتهم فاخذ عبارات
المسلمين الموجودة في كلام الله ورسوله وسلف
الامة وعلمائها وعبادته ومن دخل في هولاء من
الصوفية المتبعين للكتاب والسنة كالفضيل بن
عياض وابي سليمان الداراني والسري السقطي
والجنيد وسهل بن عبد الله وغيرهم اخنوا معاني
اولئك الملاحدة فعبروا عنها بالعبارات الموجودة
في كلام من هو معظم عند المسلمين فيظن من
سمع ذلك ان اولئك المعظمين انما عنوا بهذه
العبارات الموجودة في كلامهم ما اراد هولاء
الملحدون كما فعلت ملاحدة الشيعة الاسماعيلية
ونحوهم۔

(الرد على المنطقيين ص ۳۸۸)

ترجمہ: ”یہ تمام نظریات ان بے ایمان فلسفیوں کے اصول پر مبنی ہیں، جو یہود و نصاریٰ سے بڑھ کر کافر ہیں، اور جن کے راستے پر یہ

لمحدین چل رہے ہیں، لیکن انہوں نے نلبیس کی غرض سے فلسفہ کی تعبیرات کو بدل کر ان کی جگہ اسلامی تعبیرات کو اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعینؓ، علما و عباد اور حضرات صوفیا جو کتاب و سنت کے متبع تھے جیسے فضیل بن عیاض، ابوسلیمان دارانی، سری سقطی، جنید بخاری، سہل تری وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی تھیں۔

چنانچہ ان لوگوں نے ملاحدہ کے نظریات کو لے کر انہیں ایسی تعبیرات سے ادا کیا جو مسلمانوں کے قابل احترام اکابر کے کلام میں موجود تھیں، تاکہ سننے والوں کو یہ مغالطہ دیا جاسکے کہ ان بزرگوں کے کلام کی مراد بھی وہی ہے جو ان لمحدین کا مقصود ہے یہی طرز عمل اسما علی ملاحدہ اور دوسرے باطنیہ کا تھا۔“
اور یہی شکایت مولانا رومیؒ کو بھی کرنا پڑی۔

حرف درویشاں بدزدو مرد دول
تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں

فکر و نظر کے مدیر محترم پروفیسر محمد سرور صاحب نے بھی جن کے علم و فضل کا مجھے احترام ہے وکیل صفائی کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں فکر و نظر کے صفحات کو اپنی نگارشات سے مزین فرمایا ہے، ان سے تفصیلی گفتگو کسی دوسری صحبت میں ہوگی۔ سر دست اتنی گزارش کافی ہوگی کہ خلط بحث ان جیسے فاضلوں کو زیبا نہیں، اوپر ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا جو ملخص پیش کیا گیا ہے اگر سطعات و ہمعات کے کسی گوشے میں یہی خیالات شاہ صاحبؒ کے بھی ان کی نظر سے گزرے ہوں تو

نشاندہی فرمائیں، اضافہ معلومات پر ہم ان کے ممنون ہوں گے، ورنہ ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں شاہ صاحبؒ کے اسرار عالیہ کی بے موقع نقل پر :
 ع آنچہ مروح میکند یوزینہ ہم میکند
 کی مثل صادق آتی ہے۔

(ماہنامہ بینات کراچی رجب ۱۳۸۸ھ)

ڈاکٹر فضل الرحمن کا الحاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد :

مسٹر پرویز کے خلاف حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے جو اقدام کیا اس کا پس منظر یہ تھا کہ صدر ایوب خان ”فیلڈ مارشل“ بن جانے کے بعد ”مسند اجتہاد“ پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ اور رفتہ رفتہ اسی راستے پر گامزن تھے جس پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم چل نکلا تھا چونکہ مسٹر پرویز نے انہیں ”مرکز ملت“ کی حیثیت سے نہ صرف دین میں تغیر و تبدل کے اختیارات سونپ دیئے، بلکہ دور جدید کے ”خدا اور رسول“ کا منصب بھی عطا کر دیا تھا۔ اس لئے صدر ایوب ان دنوں ایک ”سرکاری دارالافتاء“ قائم کرنے کی فکر میں تھے، جس کا ”مفتی اعظم“ مسٹر پرویز کو بنایا جانا تجویز ہو چکا تھا۔ مولانا شبیر علی تھانوی مرحوم نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے صورت حال کا سارا نقشہ رکھا۔ اور اس شر کے سدباب کے لئے کسی مؤثر اقدام کی اپیل کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے علمائے اسلام کا متفقہ فتویٰ ”پرویز کافر ہے“ مرتب کر کے اس عظیم ترین سازش کو خاک میں ملا دیا۔ عام پبلک پر مسٹر پرویز کی حقیقت واضح ہو گئی، اور ارباب اقتدار اندر ہی اندر تلملا کر رہ گئے۔ اب انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ کراچی میں ایک ”مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی“ قائم کیا۔ اس میں اسلام پر تحقیقات کرنے کے لئے چن چن کر ایسے افراد بھرتی کئے گئے جن میں اکثریت کجرو اور کج فہم ملاحدہ کی تھی اور پھر اس ادارہ کی سربراہی کے لئے میکگل یونیورسٹی کے ایک مستشرق کو امریکہ سے

درآمد کیا گیا۔ یہ شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمن کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کے ذریعہ کیا کام تفویض کیا گیا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے میں جناب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے ایک مکتوب کا جو انہوں نے ۲۰ ذوالحجہ ۱۳۶۳ھ کو حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ارسال کیا تھا، اقتباس نقل کرتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں۔

”کئی سال ہوئے ایک بہت بڑے مسلمان سرکاری عہدے

دار نے جو غالباً ”سر“ کا خطاب بھی رکھتے ہیں۔ مجھ سے دوران

گفتگو کہا تھا کہ آپ لوگ اور آپ کے یہ مذہبی گھروندے

(مدرسے اور خانقاہیں) صرف ہندوستان (متحدہ ہندوستان) میں باقی

ہیں کہ انگریزی حکومت کی پالیسی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

جس دن یہ پالیسی ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔ ہم آپ لوگوں اور

آپ کے ان اڈوں کو ختم کر دیں گے اور ”مداخلت فی الدین“

کے نعروں سے آپ عوام میں جو ہیجان، انگریز یا ہندو کے خلاف

پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمارے خلاف پیدا نہیں کر سکیں گے۔ ہم جو

کچھ کریں گے مسلمان قوم کو ساتھ لے کر کریں گے اور رائے

عامہ کو اتنا زیادہ تیار کریں گے کہ وہ آپ لوگوں کو اپنے مفاد کا

دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں گے۔ جیسا کہ ترکی میں ہو چکا

ہے۔“ (انوار عثمانی ص ۱۵۲)

یہ تھی دراصل ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام اور ڈاکٹر فضل الرحمن

صاحب کے پاکستان میں تشریف لانے کی اصل غرض و غایت یعنی اسلام اور حاملان

اسلام کے خلاف مسلمانوں کے ذہن تیار کرنا، عوام کی ذہنیت کو اس سطح پر لے آنا

کہ وہ اسلام اور علمائے اسلام کو اپنے مفاد کا دشمن اور قابل قتل سمجھنے لگیں۔
 ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے سب سے پہلے
 تو یہ کوشش کی کہ علمائے کرام کو مطمئن کیا جائے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں یا جو
 کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس میں بد نیتی یا کجروی کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ
 وہ سرکاری وسائل سے اسلام کی خدمت کرنا اور اسلامی معاشرے کی جڑوں میں
 اسلام کو پیوست کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت
 میں بھی حاضر ہوئے اور آپ سے تعاون کی درخواست کی۔ آپ نے اس کار خیر
 میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ ایک بار ادارہ تحقیقات اسلامی میں ڈاکٹر صاحب
 کی درخواست پر تشریف لے گئے اور وہاں ان خطوط کی نشاندہی فرمائی جن پر اس
 ادارہ کو کام کرنا چاہئے (یہ تقریر ”ماہنامہ بینات“ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ میں چھپ گئی
 تھی)۔

ادھر ڈاکٹر صاحب علمائے اطمینان کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دوسری
 جانب انہوں نے اور ان کے ادارہ کے دیگر اہل قلم نے اسلام کی تحریف کے طومار
 کرنے شروع کر دیئے۔ مسلمانوں کے اسلام کے لئے ”روایتی اسلام“ فرسودہ اسلام
 ”جامد اسلام“ جیسی اصطلاحات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ ذخیرہ احادیث کو قرون
 وسطیٰ کی پیداوار بتایا گیا۔ اسلامی شریعت کا ماخذ رومن قانون کو بتایا گیا۔ قرآن کریم
 کو پیغمبر کے اندرونی احساسات کی آواز ٹھہرایا گیا۔ سود اور شراب کی حلت کے
 فتوے صادر کئے گئے۔ وغیرہ ذالک من الکفریات۔

خلاصہ یہ کہ ”فیلڈ مارشل“ صاحب جو کام مسٹر پرویز سے لینا چاہتے تھے۔
 اس کے لئے ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کی خدمات
 حاصل کی گئیں۔ نشہ اقتدار کی بدستی، سرکاری ذرائع کی فراوانی اور دین اور اہل

دین سے عناد نے جب ڈاکٹر فضل الرحمن کے الحاد و کج روی سے عقد کیا تو دین اور اہل دین پر قیامت ٹوٹ گئی، اور صاف نظر آنے لگا کہ یہاں بھی دین کا وہی حشر ہونے والا ہے جو مصطفیٰ کمال کے دور میں ترکی میں ہو چکا تھا۔ صورت حال اتنی بھیانک اور ایسی حوصلہ شکن تھی کہ مجھے خوب یاد ہے کہ نماز کے بعد اسلام کی زبوں حالی کو دیکھ کر ہم لوگ رو پڑتے تھے۔ ”وبلغت القلوب الحناجر و تظنون بالله الظنون“ میں قرآن کریم نے جس حالت کا نقشہ کھینچا ہے بلا مبالغہ ٹھیک وہی کیفیت ہم پر طاری تھی۔

حق تعالیٰ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر رحمت کی بارشیں برسائے، انہوں نے بے خوف و خطر اس آتش نمرود میں کود جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنی ساری توانائیاں اس فتنہ کا سرکچلنے پر صرف کر دیں۔ انہوں نے جس جذب و سرمستی، جس عزم و عزیمت اور جس دلیری و شجاعت کے ساتھ اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھائی، وہ خاصان حق ہی کا خاصہ تھا۔ انہوں نے اس شدت سے حق و صداقت کا صور پھونکا کہ اس کی آواز سے پورا ملک لرز اٹھا۔ ادھر ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کے آرگن ”فکر و نظر“ میں الحاد و زندقہ کی نئی نئی صورتیں ڈھل کر سامنے آئیں، اور ادھر ”بینات“ میں ان پر ”ضرب حیدری“ لگائی جاتی:

نوارا تلخ تری زن چوں ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز ترے خواں چوں محل راکراں بنی

”فیلڈ مارشل“ صاحب کے مطلق العنان اجتہاد اور ڈاکٹر فضل الرحمن کی

ملحدانہ تحریفات کے خلاف حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ کی یہ جنگ ۱۹۶۳ء سے

۱۹۶۸ء تک مسلسل چھ سال تک جاری رہی۔ اس میں کیا کیا مسائل زیر بحث آئے

اور حضرت کے شعلہ فشاں قلم نے الحاد و زندقہ کے ایوانوں کو کس کس طرح

خاکستر کیا۔ (یہ ساری روئیداد ماہنامہ بینات کے فائلوں میں محفوظ ہے) اس کا صرف ایک نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

”ڈاکٹر فضل الرحمن کی لہجہ چہرہ دستیوں نے بڑھتے بڑھتے صحیفہ مقدس اور وحی الہی پر جا ہاتھ ڈالا تھا اور اساتذہ مغرب کی تقلید میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن کا کوئی خارجی وجود نہیں تھا نہ کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا تھا، یہ سب نعوذ باللہ افسانے ہیں، آنحضرت کے وجدان اور ضمیر سے جو آواز اٹھتی تھی وہی وحی تھی اور وہی قرآن کہلاتا تھا۔“

حضرت بنوری قدس اللہ سرہ العزیز نے جب یہ تحریر پڑھی تو بے چین ہو گئے، بینات رجب ۱۳۸۸ھ کے ”بصائر و عبر“ میں وحی الہی کی حقیقت پر قلم اٹھایا اس کی تمہید یہ اٹھائی:

”انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں تمام اسلامی حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ اور باطنیت و الحاد کا جو فتنہ ہزار برس پہلے ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ آج تمام عالم اسلام میں پھیل گیا ہے۔..... ملاحظہ نے آج میدان کو خالی دیکھ کر اور فضاء کو سازگار سمجھ کر وہ شگوفے کھلانے شروع کر دیئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے ”تحریف دین“ کا نام ”تحقیق اسلام“ ہے ”الحاد فی الدین“ کا نام ”اظہار حقیقت“ ہے۔ حقائق دین کو اس طرح پامال ہوتا دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کیا کیا جائے۔

”ازماست کہ برماست“ اسلام کی غربت و بے چارگی کا یہ دور انتہائی

حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون“

اس تمہید کے بعد قرآن کریم کی آیات سے ”وحی“ کی تشریح فرماتے ہیں، وحی کے اوصاف و خصوصیات تفصیل سے ذکر کرتے ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں:

”سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ سب کچھ ایمانی بصیرت اور ایمانی نور سے محرومی کا نتیجہ ہے، یا پھر ان حقائق الہیہ سے جہل عظیم کا ثمرہ ہے۔ خدا را انصاف کیجئے! کہ تمام قرآن اور تمام وحی کو پیغمبر ﷺ کا اخلاقی تجربہ اور توسیع ذات بتلایا جائے کیا یہ صریح گمراہی نہیں؟..... حقائق بین نگاہیں محسوس کرتی ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے دین اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ارشادات کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ اور اپنے سلف مستشرقین کی دلی آرزوؤں کو پورا کر کے وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ان سے نہ ہو سکا۔“

یہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا آخری ادارہ تھا۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ چھ سال تک مسلسل حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس فتنہ کے قلع قمع کے لئے سرگرم رہے۔ اور اس تندہی، تلخی، اور تیزی سے اس پر پے در پے ضربیں لگاتے رہے کہ پورے ملک میں اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور ”فیلڈ مارشل“ کا مطلق العنان اقتدار اور ڈاکٹر فضل الرحمن کا ”جدت پسند اسلام“ اس طوفان کے تھپیڑوں میں ہچکولے کھانے لگے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب ”اسلامی تحقیقات“ کے منصب سے معزول ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس آخری ادارے میں، جس کا اقتباس اوپر نقل کر چکا ہوں۔ لکھتے ہیں:

”یہ سطرین زیر قلم تھیں کہ یہ معلوم ہوا کہ ”ادارہ تحقیقات

اسلامی“ کے ڈائریکٹر جو ان لغویات کے علمبردار تھے، عوام کے احتجاج پر اپنے منصب سے برطرف کر دیئے گئے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی رہنمائی میں ”ماہنامہ فکر و نظر“ اور ”اسلام“ وغیرہ کتابوں کے ذریعے جو بیج ڈالا گیا ہے اس کا کیا کیا جائے گا؟

اب تک جتنا لٹریچر ظہور میں آیا ہے وہ ”غرق مے ناب اولیٰ“ کا مصداق ہے، جب تک اس کو دریا برد نہ کیا جائے اس وقت تک کیا اطمینان ہے کہ آئندہ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ اور ان تحریفات و الحاد پر اس وقت تک پاکستان کے خزانے کا جو لاکھوں روپیہ خرچ کیا گیا، اس کا کیا تدارک کیا جائے گا؟ اور جو ہم خیال اسٹاف اپنے ارد گرد جمع کیا تھا اس کا کیا حشر ہوگا؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ ادارہ ”امین“ ہاتھوں میں دیا جائے اور ان کی علمی و دینی معاونت کے لئے علمائے امت میں سے معتمد ترین افراد کا انتخاب کیا جائے۔ جن کے علم و تقویٰ پر امت کو اعتماد ہو اور وہ شرعی مسائل معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہوں۔

اور یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ ان تحقیقات کے لئے دائرہ عمل متعین کیا جائے اور دین کے مسلمات کو زیر بحث لانے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب تک یہ روک تھام نہ ہوگی اس وقت تک قابل اطمینان صورت ملک میں پیدا نہ ہوگی۔“

لیکن افسوس ہے کہ اقتدار نے اس مخلصانہ نصیحت کو گوشِ ہوش سے سننا

گوارا نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے ”مرہی و محافظ“ فیلڈ مارشل کی
بساط اقتدار بھی الٹ گئی:

حذر اے چہرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
(از بینات اشاعت خاص حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نمبر)

وزیر قانون اور ادارہ تحقیقات اسلامی

یکم ستمبر کے اردو، انگریزی اخبارات میں وزیر قانون جناب ایس ایم ظفر کی پریس کانفرنس شائع ہوئی ہے جس میں آپ نے پریس کو بیان دیتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ نے اسلامی قانون کی جامع کتاب کے مدون کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ کہ منصوبہ چار سال میں مکمل ہوگا۔

جناب وزیر قانون نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی صلاحیت، قانونی مہارت اور منہجی وجاہت کے اعتبار سے احترام کے مستحق ہیں بلکہ خاندان نبوت کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے بھی ملت اسلامیہ کے جذبات عقیدت ان سے وابستہ ہو سکتے ہیں لیکن ان کے اس بیان سے بعض خلجان پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے، اس لئے ان کا بیان کر دینا بے محل نہ ہو گا تاکہ ان پر غور کر لیا جائے۔

۱:۔۔۔۔۔ سب سے اول تو یہی ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا پورا عملہ اسلام کے فلسفہ حیات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ امت کے چودہ سو سالہ اسلام کو راسخ العقیدہ گروہ کا اسلام اور ”شکلی دور کے بعد کا اسلام“ قرار دیتا ہے۔ ادارہ کے آرگن ”فکرو نظر“ کے مطالعہ سے ہر شخص بخوبی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس ادارہ کا مجموعی مزاج اسلامی ورثہ کو ”دفتر بارینہ“ قرار دے کر بحث و نظر کا موضوع بنانا ہے۔ اگر اس ادارہ کی یہ روایات آئندہ بھی قائم رہیں تو ان کے مرتب کردہ مجموعہ قانون کی اسلامی نقطہ نظر سے کیا حیثیت ہوگی، اور امت مسلمہ کو اس پر کیسے اعتماد ہوگا؟

۲: — وزیر موصوف نے اپنے بیان میں اس امر کی وضاحت بھی فرمائی ہے کہ اس مجموعہ قانون میں مغربی مستشرقین کی آرا اور تحقیقات سے استفادہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ اسلام کے حق میں متعصب واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ ارشاد نہایت حکیمانہ اور دانشمندانہ تصور کیا جائے گا، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈاکٹر صاحبان خود بھی مستشرقین ہی کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض یافتہ ہیں اور اگر گہری نظر سے مستشرقین کی آرا و افکار اور ان مستشرقین کے نظریات کا مقابلہ کیا جائے تو یہ امر کھل کر سامنے آئے گا کہ مستشرقین کے ان شاگردان عزیز کا رویہ اپنے اساتذہ سے کسی قدر سخت تو ہو سکتا ہے لیکن نرم کسی درجہ نہیں۔ اس کی شہادت کے لئے صرف ادارہ کے سربراہ جناب ڈاکٹر فضل الرحمن کے اس مقالہ کا مطالعہ کافی ہے جو انہوں نے ”اسلام پر تجدید پسندی کے اثرات“ کے عنوان سے پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ میں پڑھا اور ادارہ کے ترجمان ”فکرو نظر“ نے اپنی تازہ اشاعت (جولائی و اگست ۱۹۶۶ء) میں اسے شائع کیا ہے اس مقالہ میں انہوں نے اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف جو زہر افشانی کی ہے اس کے پڑھنے سے ہی رو نگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی ذہنیت ادارہ کے باقی عملہ میں بھی کار فرما ہے۔ اندریں صورت ان ڈاکٹروں کی آرا سے استفادہ کرنا اور مستشرقین پر تعصب اسلام کی فرد جرم عائد کرنا کہاں تک صحیح ہو گا۔ ہمارے وزیر محترم کو شیخ سعدیؒ کا یہ حکیمانہ فقرہ سامنے رکھنا چاہئے تھا:

افعی کشتن و بچہ اش نگاہ داشتن کار خرد منداں نیست

ترجمہ ”سانپ قتل کرنا اور سانپ کے بچہ کی پرورش کرنا عقل مندی نہیں۔“

۳: — وزیر محترم نے اپنی پریس کانفرنس میں اسلامی زندگی کو اپنانے کے سوال پر

زور دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ اسلام ہی کی وحدت مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد کر سکتی ہے۔ ان کا یہ ارشاد بھی سو فیصد صحیح اور قابل تعریف ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سا اسلام ہے جو اتحاد پاکستان کی ضمانت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔؟ راسخ العقیدہ گروہ کا روایتی اسلام“ یا ”ادارہ تحقیقات اسلامی کا پیش کردہ جدید اسلام“ اگر ثانی الذکر کے متعلق یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہی پاکستان کے دونوں بازوؤں کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا تو ممکن ہے کہ یہ مفروضہ واقعات سے کوئی مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک اسے نری خوش فہمی سے زیادہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ملت اسلامیہ کا رشتہ اتحاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا حقیقی اسلام جو چودہ صدیوں سے متواتر چلا آتا ہے تو ہو سکتا ہے، مگر دور حاضر کے مفکرین کی آراؤں کا خود تراشیدہ اسلام کبھی اتنا وزنی نہیں ہو سکتا کہ اسے اتحاد کا ضامن قرار دیا جاسکے۔

۴:----- وزیر موصوف نے اپنے بیان میں ان موضوعات کی نشاندہی بھی فرمائی ہے جن پر خامہ فرسائی کی جائے گی۔ اس سلسلے میں جو فہرست پیش کی گئی ہے، ہمارے خیال میں وہ قطعی نامکمل ہے۔ اسلامی قانون کی تدوین سے پہلے اس کے اصول موضوعہ کا طے کر لینا ایک فطری اصول ہے، اس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ تحریف و الحاد پر قلم اٹھایا جائے۔ نیز اس امر کی وضاحت کی جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ کو من و عن قبول کیا جائے گا، یا اس کے لئے نئی جرح و تعدیل کا راستہ کھولا جائے گا (جیسا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی اس کی وضاحت کر چکا ہے)۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی کی جائے کہ امت مسلمہ اور ائمہ دین کے اجماعی فیصلوں کو کیا مقام دیا جائے گا؟ کیا ان کو بدستور رکھا جائے گا، یا ان کو تبدیل کرنے کی

جرات کی جائے گی (جیسا کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا موقف ہے)۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ائمہ اربعہ کے فیصلوں کے مقابلہ میں اقوال شاذہ کو ترجیح دینے کا طریق اختیار کیا جائے گا یا ائمہ اربعہ کی تشریح کو حجت قرار دیا جائے گا۔

نیز اس امر کی وضاحت بھی ہونی چاہئے کہ قرآن و سنت کے مسائل کے اخذ کرنے کے لئے کیا اصول ہوں گے۔ سلف کا مرتب کردہ اصول فقہ قابل قبول ہوگا یا اس کے لئے نیا اصول فقہ وضع کیا جائے گا، اور یہ کہ قرآن و حدیث کے نصوص کو علیٰ حالہ قائم رکھا جائے گا یا معاشرتی تغیرات کی آڑ میں ان پر نسخ و مسخ کا عمل جاری کیا جائے گا؟ قرآن و سنت کے فیصلوں کو قانون کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے گا یا انہیں ادارہ تحقیقات اسلامی کے بقول صرف ایک گونہ نظیر قرار دیا جائے گا؟

۵:۔۔۔۔۔ ادارہ تحقیقات اسلامیہ کی جانب سے زکوٰۃ، سود، حدود، شراب، تصاویر اور عائلی قوانین وغیرہ کے بارے میں اس وقت تک جو تحریفات کی جا چکی ہیں۔ کیا انہیں اس ”جامع کتاب“ میں مسلمہ حیثیت سے لے لیا جائے گا یا انہیں بالکل رد کر دیا جائے گا؟۔

۶:۔۔۔۔۔ وزیر موصوف نے اس امر کی تصریح بھی فرمائی ہے کہ اس مجلس تدوین میں قدیم و جدید دونوں قسم کے علما سے استفادہ کیا جائے گا یہ نکتہ بھی اپنی جگہ بڑی گہری حقیقت رکھتا ہے بلاشبہ جدید زندگی کے پیدا کردہ مسائل کا حل ڈھونڈنے کی بجائے قدیم و جدید علما کا سر جوڑ کر غور و فکر کرنا بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں چند امور کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہو گا :

الف:۔۔۔۔۔ جدید مسائل کے حل تلاش کرنے کے لئے جن علمائے قدیم و جدید کا

انتخاب عمل میں لایا جائے گا۔ ان کے لئے کن معیاری صفات کا لحاظ رکھا جائے؟۔
 اس امر کا لحاظ رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اسلامی مسائل پر غور کرنے کے لئے
 صرف معلومات اسلامیہ پر عبور کو کافی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ عبور تو کسی غیر
 مسلم کو بھی حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے لئے شریعت اسلامیہ میں جن شرائط کا لحاظ
 رکھا گیا ہے انہیں سامنے رکھنا بھی ضروری ہوگا۔ ورنہ بہ فحوائے حدیث نبوی ”اذا
 وسد الامر الی غیر اہلہ فانظر الساعة“ (جب امور نااہلوں کے سپرد کر دیئے
 جائیں تو قیامت کا انتظار کرو) اس امانت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہوگا۔

ب: — علمائے قدیم و جدید کے غور و فکر میں اختلافات کا پیدا ہو جانا ایک فطری امر
 ہے کیونکہ نقطہ نظر کا اختلاف، اختلاف فکر پر منتج ہوتا ہے۔ اس صورت میں رفع
 اختلاف کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ کیا قدیم علما کی رائے کو قدامت پرستی کہہ
 کر تو نہیں ٹال دیا جائے گا؟

ج: — اب تک علمائے قدیم و جدید کے نقطہ نظر میں اختلاف کی وجہ سے جو
 مسائل زیر بحث آچکے ہیں، مثلاً عائلی قوانین ان میں اب تک حکومت کا رویہ علمائے
 قدیم کے نقطہ نظر کی ضد رہا ہے، کیا آئندہ بھی یہی روش باقی رکھی جائے گی یا اس میں
 کسی معتد بہ تبدیلی کا امکان ہے؟

یہ چند امور قابل غور ہیں جنہیں ٹھنڈے دل سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔
 تاہم اگر تحقیقات اسلامی کے ادارہ نے کسی ایسے قانون کی سفارش کی جو روایتی اسلام
 کی ضد ہو تو ہم ابھی سے واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ اسے کبھی دل سے
 قبول نہیں کرے گی بلکہ شدید اندیشہ اس امر کا ہے کہ اس سے امت مسلمہ کی
 وحدت اور پاکستان کے استحکام کو صدمہ پہنچے گا۔ حق تعالیٰ ہمیں اور ہمارے ملک کو ہر

طرح کے فتنہ سے محفوظ رکھے۔ آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ
محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔

(ترجمان اسلام لاہور ۲۲ دسمبر ۱۹۶۶ء)

عمر احمد عثمانی کی تحریفات

صغیر سنی کی شادیاں اور اسلام

حامداً و مصلیاً و مسلماً مثل مشہور ہے کہ بچھو سے کسی نے دریافت کیا کہ جناب کے معزز گھرانے میں ”نیش زنی“ کے فن میں سب سے بڑا ماہر کون ہے؟ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ جس کی پشت پر ہاتھ رکھ دیکھو، وہی سب سے بڑھ کر ماہر فن ثابت ہو گا۔

اسلام کا نام لے کر اسلام کو ڈسنا، اسے تحریفی نشر لگانا، اس پر جرح و تنقید کی مشق کرنا، اور محض مفروضات سے اس کے قطعی مسائل کو پامال کرنا ہر دور کے ملاحظہ اور زنادقہ کا طرہ امتیاز رہا ہے، پہلی صدی کے خوارج ہوں یا مابعد کے بائینہ، تیسری صدی کے اصحاب العدل والتوحید ہوں، یا دور حاضر کے ”ارباب فکر و نظر“ دوسری صدی کا ابن المقفع ہو، یا چودھویں صدی کا اسلم جیراچپوری، اکبری دور کے ابوالفضل اور فیضی ہوں، یا ہمارے دور کے ڈاکٹر فضل الرحمان اور پرویز، سب کا مشترک مقصد، مشترک نقطہ نظر، اور مشترک سرمایہ اسلام کی مقدس چہار دیواری میں رخنہ اندازی کرنا رہا ہے۔

”ادارہ تحقیقات اسلامیہ راولپنڈی“ نے شریعت محمدیہ اور دین اسلام میں شگاف ڈالنے کے لئے جو ”مجلس ادارت“ اور ”بزم فکر و نظر“ ترتیب دی ہے۔ اس

کے لئے چن چن کر زیادہ تر جغادری قسم کے متجددین کی بھیڑ جمع کی گئی ہے، اب یہ ادارہ ان ہی لوگوں کی تحقیقات کو تعمیر اسلام قرار دیتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے ادارہ کے رجال کار اور ان کے تحقیقاتی شاہکار کے کچھ نمونے امت مسلمہ کے سامنے رکھ دیئے جائیں، تاکہ انہیں اس ادارتی گلستان سے اس کی ”تعمیری بہار“ کا اندازہ کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ادارہ تحقیقات کی ”بزم فکر و نظر“ کے ایک رفیق عمر احمد عثمانی صاحب ہیں۔ ادارہ تحقیقات میں ان کی شخصیت کس قدر مقبول ہے، اس کا اندازہ مدیر فکر و نظر کے مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جاسکتا ہے:-

”ہمارے“ فاضل و فقیہ مقالہ نگار نے عنوان بالا پر اپنے پُر مغز مقالے کی پہلی دو قسطوں میں آیات قرآنی اور ان کی ائمہ سلف کی تفاسیر کی روشنی میں یہ واضح کیا تھا۔ الخ

”ہمارے“ فاضل دوست کے طرز تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ مسئلے کے ہر گوشے پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی ذاتی تنقید کو ائمہ سلف کی تنقیدات کا ہمیشہ تابع رکھتے ہیں۔“

(فکر و نظر ج ۲ ش ۵-۶ ص ۳۱۵)

(مدیر فکر و نظر کا یہ دعویٰ اپنے اندر کتنی صداقت رکھتا ہے۔ آئندہ سطور میں آپ کے سامنے جو حقائق آئیں گے، ان پر غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ آپ خود کر سکیں گے، واللہ الموفق۔)

اسی کے ساتھ ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کا یہ ”امتیازی وصف“ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ وہ مسٹر پرویز کی سلطنت کفر و الحاد میں برسوں تک وزارت عظمیٰ کے منصب

پرفائزر ہے ہیں، اور ان کی تحریک مرکز ملت، و نظام ربوبیت ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ ہی کے دم قدم سے پروان چڑھی ہے، ملت اسلامیہ سے مسٹر پرویز کا رشتہ کٹ جانے کے بعد ان کی قلمی خدمات ادارہ تحقیقات کے لئے وقف ہو گئیں۔

فاضل مقالہ نگار کے چار ضخیم مقالے ادارہ تحقیقات راولپنڈی کے آرگن ”فکر و نظر“ نے تقریباً (۲۳۵) صفحات میں شائع کئے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے، کہ ان تمام مقالوں کے ابھرتے ہوئے نقوش، اصلی الفاظ یا خلاصہ کی صورت میں پیش کر دیں۔

اس مقالہ کی پہلی قسط فکر و نظر جلد اول شمارہ ۷-۸ (جنوری فروری ۱۹۶۳ء) میں اور دوسری قسط شمارہ نمبر ۹ (مارچ ۱۹۶۳ء) میں شائع ہوئی ہے۔ آئندہ اقتباسات میں قسط اول، قسط دوم لکھ کر محمولہ بالا شماروں کے صفات درج کر دیئے جائیں گے۔

۱۔ قرآنی مفہوم میں تحریف

”وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ
فَإِنْ أَنْسَمْتُمْ مِنْهُمْ رِشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ۔“
(۶-۴)

ترجمہ: ”اور تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر پہنچ جائیں، پھر اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو، تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دیا کرو۔“
(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)

”مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ پر فوائد میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ یعنی ”بالغ ہو جائیں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت

بلوغ سے ہوتی ہے۔ ”اس آیت کریمہ کے اسی قسم کے تراجم دیگر تمام مترجمین نے بھی کئے ہیں، اس آیت کریمہ میں آپ نے دیکھ لیا، کہ یتیموں کو ان کے اموال حوالے کرنے کیلئے جو حد مقرر فرمائی گئی ہے وہ آزمائش کے بعد ان میں ایک گو نہ تمیز اور صلاحیت کا پیدا ہو جانا ہے۔ مگر یہ آزمائش اسی وقت کی جانی چاہئے جب وہ بالغ ہو جائیں۔

(بہ لشد (قسط اول ص ۴۰)

قرآن کریم آزمائش کی حد انتہا، بلوغ بتلاتا ہے، اور فکر و نظر کے ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ اس میں آزمائش کی ”حد ابتدا“ کا مضمون ٹھونکتے ہیں، یہ کھلی تحریف ائمہ سلف میں سے کس کی تنقید کے تابع ہو کر کی گئی ہے۔؟ کیا ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ یہ بھی نہیں جانتے کہ ”حتی“ ابتدائے غایت کے لئے نہیں بلکہ انتہائے غایت کے لئے موضوع ہے۔؟ پھر اگر بلوغ کے بعد سے آزمائش کا وقت شروع ہوتا ہے تو مال کے حوالہ کرنے کا وقت کب سے شروع ہوگا؟

۲۔ فقہائے امت کی قرآن کریم کی نظر سے محرومی

”اس آیت سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ یتیموں کو ان کے مال کب حوالے کرنے چاہئیں وہیں اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ”قرآن کریم کی نظر“ میں نکاح کی بھی ایک عمر مقرر ہے، اور وہ ہے بلوغ کی عمر۔ (ذرا آگے چل کر) لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بات اتنی صاف تھی، تو سلف سے لے کر خلف تک تمام فقہائے امت اور علمائے امت

بالاجماع صغریٰ کی شادیوں کے قائل کیسے چلے آتے ہیں، کیا قرآن کریم کی یہ صراحت اور عرب معاشرہ میں صغریٰ کی شادیوں کا کوئی رواج نہ پایا جانا ان کے سامنے نہیں تھا؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسے یونہی سرسری طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

(بہ لغتہ (قسط اول ص ۳۰-۳۱)

سلف سے لے کر خلف تک تمام علماء امت کو ”قرآن کریم کی نظر“ اور اس کی صراحت سے بے بصیرت ثابت کرنا، یہ ہے فاضل فقیہ مقالہ نگار کی فقاہت، اور ائمہ سلف کی اتباع۔ قرآن کریم کی اس نظر کا چودہ سو سال بعد انکشاف ہوا ورنہ اس سے پہلے تمام امت ”ناجائز فعل“ ہی کی غلطی میں مبتلا رہی۔

۳۔ صغریٰ کے نکاح کو ”جائز“ قرار دینے والے ائمہ دین تحریف سے بھی بدتر جرم کے مرتکب ہیں

”اگر ایسا اجماع جس کی سند قرآن و حدیث سے نہ مل سکے بقول حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ناجائز اور اسباب تحریف میں شامل ہے، تو ایسے اجماع کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ جو قرآن کریم کی ”نص صریح“ کے بھی خلاف ہو، پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے نکاح کی عمر، بلوغ کو قرار دیا ہے، اور یہ ”نص صریح“ ہے۔ تو اگر نص صریح کے خلاف اجماع کا ثبوت بھی ہو جائے تو اسے کسی طرح بھی جائز نہیں کہا جاسکتا اور ایسا اجماع یقیناً اسباب تحریف سے بھی کچھ زیادہ ہی سخت شمار کیا جائے گا۔“

(بہ لغتہ قسط اول ص ۳۲)

واضح رہے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کے بقول ”تحریف سے بھی سخت ترجم“ کا ارتکاب کرنے والوں میں خود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں، چنانچہ ”والبکر یستأذنہا ابوہا“ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس سے مراد بکربالغہ ہے۔ نابالغہ نہیں، وہ کیسے مراد ہو سکتی ہے، جب کہ اس کی کوئی رائے ہی نہیں ہوتی۔ اور حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کر دیا تھا جب کہ وہ چھ سال کی تھیں۔“

(ج۲ اللہ البالغہ، ص ۱۳۷ ج ۲ طبع منیریہ)

ایک طرف ان کو ”تحریف کے مجرم“ اور ”بلا سوچے سمجھے نص صریح کے خلاف فتویٰ دینے والے“ قرار دینا اور دوسری طرف ان کے کلام سے استدلال کرنا جس برتن میں کھانا اسی میں پیشاب کرنے کے مصداق ہے، معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کی عبارت سے اخذ کردہ نتیجہ اور قرآن کی نص صریح کا افسانہ ”خانہ ساز“ ہے۔ ورنہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر ”نص صریح“ کو جاننے والا ادارہ تحقیقات کی جمع کردہ بھیڑ میں کون ہے۔؟

اجماع کا دعویٰ غلط ہے

”چونکہ (تمام امت اور) فقہا امت کے جم غفیر کے خلاف ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ، ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ اور خوش قسمتی سے امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال (شاذہ) موجود ہیں۔ اس لئے اجماع امت کا دعویٰ غلط ہے۔“

(تلخیص قسط اول ص ۳۲-۳۸)

اجماع امت کے مقابلے میں شاذ قسم کے اقوال و آراء پیش کرنے پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ تشخیص فرمائیں ہیں، طلباء و علماء کو ”ازالۃ الخفاء“ کی طرف مراجعت کا مشورہ دیتے ہوئے یہاں شاہ صاحب کا صرف ایک فقرہ نقل کرتا ہوں :

”در اشکال یک جانب اصابت بود، و یک جانب خطاء المعذور“
وچوں پردہ از روئے کار برداشتد، و حق مثل فلق الصبح پدیدار گشت
مجال خلاف نمائد، ہر کہ الحال مینا و شمالا اقتد زندیق است، اور اے
باید بہ قتل رسانید“

(ازالۃ الخفاء ص ۹۹ ج الطبع جدید نور محمد کراچی)

”جب تک مسئلہ میں اشکال تھا، اس وقت تک ایک جانب صواب تھا، اور ایک جانب خطائے معذور، لیکن جب مسئلہ کے چہرے سے نقاب اٹھ گیا، اور حق ”سفیدہ صبح“ کی طرح روشن ہو گیا، اس وقت اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہی اس کے بعد بھی جو شخص دائیں بائیں جھانکے وہ زندیق ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے۔“

۵۔ علمائے امت کا یہ فتویٰ عجبی اثرات (یا پرویزی اصطلاح میں عجبی سازش) کا نتیجہ ہے

”اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کہ جب تدوین فقہ کا دور آیا تو بیشتر علمی مسندوں پر وہ علماء اور ائمہ قابض ہو چکے تھے جن کا تعلق ملک عرب سے نہیں تھا، بلکہ عجبی ممالک سے تھا، بلکہ تدوین فقہ کے دور سے بہت پہلے ہی علمی

مسندیں عربوں کے قبضہ سے نکل چکی تھیں، عبدالمالک اور زہری کا وہ مکالمہ جو اکثر مورخین نے نقل کیا ہے۔ اس صورت حال پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ (اس کے بعد وہ مکالمہ مذکورہ ہے۔ ناقل)۔

(بلفظہ قسط اول ص ۴۹)

۶۔ علمائے امت اور جواز حماقت کا فتویٰ

”ان حضرات کا جم غفیر جسے ”اجماع کے غلط لقب“ سے یاد کیا گیا ہے یہ نہیں کہہ رہا کہ صغریٰ کی شادیاں ضرور کی جانی چاہئیں، وہ زیادہ سے زیادہ یہی بتا رہا ہے کہ اگر ”ایسی حماقت“ کر لی جائے، تو اس کا شرعی حکم کیا ہوگا۔“ (وہ شرعی حکم یہی ہے کہ جائز ہے۔ ناقل)

(بلفظہ قسط اول ص ۵۲)

اجماع کا لقب غلط نہیں بلکہ بقول شاہ صاحب کے اسے غلط قرار دینا صریح زندقہ ہے :

سخن شناس نہی دلبر اخطا میں جا است

”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کے بقول ”ایسی حماقت“ کے ”شرعی جواز“ کا فتویٰ جن ”حضرات کے جم غفیر“ نے صادر فرمایا، اگر ان کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود تھی تو اسے ”حماقت“ کا لقب دینا خود اچھی خاصی سوچی سمجھی حماقت ہے، اور اگر ان حضرات کا یہ ”فتوائے حماقت“ یونہی بلا دلیل تھا، تو ”ان حضرات کا جم غفیر“ مفتری علی اللہ ہوا، نہ کہ ائمہ دین، معاذواستغفر اللہ۔ یہ ہے فکر و نظر کے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی ”اتباع سلف“۔!

۷۔ علمائے امت کا بلا سوچے سمجھے وراثتی فتویٰ

”چونکہ ان کے اذہان وراثتی طور پر صغریٰ کی شادیوں سے مانوس تھے، اور ان کے دلوں میں نہ اس کی طرف سے کوئی استعجاب پایا جاتا تھا، اور نہ اس (ناجائز فعل) سے کوئی نفرت تھی، اس لئے جو نبی ان کے سامنے کوئی ایسا بیان آیا جس سے اس کا جواز نکلتا تھا، انہوں نے فوراً اسے قبول کر لیا، اور اس کی جرح و تنقید کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔“

(بلفہ قسط اول ص ۵۲)

ائمہ دین پر اپنے غیر شرعی موروثی امور سے انس رکھنے، ان سے استعجاب نہ کرنے، نفرت نہ کرنے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا جرح و تنقید ان کے جواز کا فتویٰ صادر فرمانے کا بہتان کیا بھونڈی اور مکروہ قسم کے افسانہ نگاری نہیں ہے۔؟ پھر ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ یہ بھول گئے، کہ امام مالک اصبحی رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل شیبانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم تو عجمی نہ تھے، انہوں نے اس ”حماقت“ کے جواز کا فتوے کیسے دے ڈالا ان کو اس عجمیت سے کیوں انس رہا۔ اور استعجاب اور نفرت کیوں نہ ہوئی۔ کیا اسے تحقیق کہا جائے، یا ائمہ دین کی تحقیق (ان کو الوبنانا)۔؟

۸۔ نہیں بلکہ ضرورت اور مجبوری

”فقہائے کرام نے یہ کہیں نہیں کہا کہ بلا ضرورت بھی صغریٰ کی شادیاں کرنی چاہئیں وہ تو صرف یہ بتا رہے ہیں، کہ اگر کوئی شخص کسی ضرورت اور مجبوری کے تحت ایسا نکاح کر دے

تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ضرورت شدیدہ میں، جیسی صورت ہم نے اوپر فرض کی ہے، اگر کوئی شخص ایسا کر دے تو عدل عمرانی، ضرورت وقت، تقاضائے مصلحت اور منشاء قانون بھی یہی ہے کہ اس کے جواز کا فتویٰ دیا جائے۔“

(بلفظ قسط اول ص ۵۳)

اوپر کی عبارت میں ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ نے اسے ”فتوائے حماقت“ قرار دیا تھا، یہاں آکر اسے فتویٰ ضرورت“ بنا ڈالا۔ کیا اسلامی تحقیقات کے ادارے کی زبان میں ضرورت اور حماقت کے ایک ہی معنی ہیں۔؟ پھر یہ ضرورت حماقت کا الہام کہاں سے ہوا، فقہاء کے جم غفیر نے اس کی کہیں تصریح فرمائی ہے یا یہ محض ایجاد بندہ ہے۔

لیکن آپ کا مسلم فیملی لاز تو جس کی نمک حلائی کے لئے نامہ عمل کی یہ تمام سیاہی آپ نے مہیا کی ہے عدل عمرانی، ضرورت وقت، تقاضائے مصلحت اور منشاء قانون کو بلائے طاق رکھ کر بلا استثناء اسے قابل سزا جرم قرار دیتا ہے، اسلام کا معجزہ دیکھئے، کہ جس قانون کی خاطر اسلام میں تحریف اور ائمہ اسلام کی تمحیق کا بار عظیم اٹھایا گیا تھا، خود اسی قانون کو عدل عمرانی، ضرورت وقت، تقاضائے مصلحت اور منشاء قانون کی ضد قرار دینا پڑا۔

نہیں نہیں بلکہ اشتباہ

”واقعہ یہ ہے کہ ہمارے فقہاء کے سامنے ایک ایسی روایت تھی، جو انہیں اشتباہ میں ڈالنے کا باعث بنی، اس روایت پر ہم شرح و بسط کے ساتھ آئندہ اشاعت میں بحث کریں گے۔“

(قسط اول ص ۵۴)

اگر یہی واقعہ ہے تو مذکورہ بالا ”ضرورت حماقت“ کے افسانے کس خطاب کے مستحق ہیں۔

تمام معتبر کتابوں کی صحیح ترین حدیث

”یہ روایت حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں صحیح ترین سند (بلکہ اسانید متعددہ متواترہ۔ ناقل) کے ساتھ بیان ہوئی ہے، جس کی بنا پر ہمارے فقہا کو صغر سنی کی شادیوں کے جواز کا فتویٰ دینا پڑا ہے، یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منسوب کی گئی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ:

”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے نکاح کیا جب کہ میں چھ سال کی تھی، اس کے بعد ہم مدینہ میں آئے۔ پھر (رخستی کے وقت) مجھے کسی بات نے نہیں گھبرایا، مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور (انصاری عورتوں نے) مجھے آپ کے حوالے کر دیا، ان دنوں میں نو سال کی تھی۔ عروہ ابن زبیر نے بتایا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انتقال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے سے تین سال پہلے ہو گیا تھا، دو سال یا قریباً دو سال تک آپ نے کوئی شادی نہیں کی (واضح رہے کہ یہ عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے، جسے ایک دروغ مصلحت آمیز کے لئے فکر و نظر کے ”فاضل فقیہ مقالہ نگار“ نے حضرت عائشہ کی روایت میں شمار کر لیا۔ اس

لئے از راہ احتیاط انہوں نے جمع الفوائد کا حوالہ دیا۔ یہ بحث الگ مقالے میں پیش کی جائے گی۔ واللہ الموفق (ناقل) پھر حضرت عائشہ سے نکاح کیا جب کہ وہ چھ سال کی تھیں اور حضرت عائشہ کی رخصتی اس وقت ہوئی جب کہ وہ نو سال کی تھیں۔ ایک اور روایت میں یہی بات دوسرے لفظوں میں کی گئی ہے (یہ خط کشیدہ عبارت وفی آخری: ومکثت عنده تسعا کا قیہانہ ترجمہ ہے۔ ناقل) اور ایک چوتھی روایت میں ہے کہ (حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ) حضور نے مجھ سے نکاح فرمایا جب کہ میں سات سال کی تھی۔“

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد، نسائی، بحوالہ جمع الفوائد ص ۲۱۴ ج ۱۔)

(بلفظ قسط دوم۔ ص ۳۱-۳۲)

مخالفین اسلام کی اوٹ میں :

”اور اس حدیث کو سامنے رکھ کر مخالفین اسلام کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے متعلق کیا کچھ کہا جاتا رہا ہے اس کا اندازہ مستشرقین یورپ کی تحریرات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔“

(بلفظ قسط دوم ص ۳۳)

یہ فکر و نظر کے ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ نے مخالفین اسلام کی آڑ میں اپنے استاذ محترم پرویز صاحب اور ادارہ تحقیقات کے شاگردان یورپ کے دل کی بات بتادی ہے، کیا مخالفین اسلام کی طرف سے ذات قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ”کیا کچھ“ کہا جانا۔ جس کا اندازہ ان کے بقول مستشرقین یورپ کی تحریرات سے با

آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ صرف اسی ایک حدیث تک محدود ہے۔؟ ستیا رتھ پر کاش اٹھا کر دیکھ لیجئے، بسم اللہ سے والناس تک قرآن کریم کو سامنے رکھ کر آپ کے متعلق ”کیا کچھ“ نہیں کہا گیا۔ اگر ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ مخالفین اسلام کے ”کیا کچھ“ کہنے، اور مستشرقین کی تحریرات سے اتنے ہی مرعوب ہیں اور انہیں حق بجانب تصور کرتے ہیں تو سارا نزلہ ”تمام معتبر کتابوں کی صحیح ترین حدیث“ ہی پر کیوں گرتا ہے۔ قرآن کریم اور اسلام کو بھی جواب دے دیجئے کیونکہ ان ہی دونوں کی عداوت میں تو آپ کے متعلق ”یہ سب کچھ“ کہا جاتا ہے، ورنہ اس حدیث نے نہ تو مخالفین اسلام کا کچھ بگاڑا ہے، اور نہ آپ جیسے ”نام نہاد موافقین اسلام“ کا کوئی نقصان کیا ہے۔

یہ حدیث بالاتفاق صحیح اور متواتر ہے

”یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، اور دوسری تمام معتبر کتب حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس حدیث کی سند پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اسی ایک حدیث کی بنا پر (یہ فاضل و فقیہ مقالہ نگار کا تجاہل یا جہالت ہے، ورنہ دوسری احادیث بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں، آئندہ سطور میں ان کا ذکر آئے گا۔ انشاء اللہ اور اگر بالفرض کوئی اور حدیث نہ بھی ہوتی، تو یہی ”سو کی ایک“ کیا کم تھی، بالخصوص جب کہ یہ مسئلہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہے، اس کا بیان بھی ابھی آتا ہے۔ انشاء اللہ۔ ناقل) فقہاء و علماء کا جم غفیر (بہ لفظ صحیح ایک دو غیر معتبر اور شاذ اقوال کو چھوڑ کر امت کے تمام علماء کا اجماع صحیح۔ ناقل) صغریٰ کی شادیوں کے جواز کا قائل چلا آ رہا ہے اور جو لوگ صغریٰ کی شادیوں کے

عدم جواز کے قائل ہیں، وہ بھی لڑکیوں کی حد تک یا تو جواز کے قائل ہیں، (صغریٰ کی شادیوں کی عدم جواز کے حق میں ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ نے کل تین نام پیش کئے تھے، اگرچہ اس فہرست کے ثبوت میں بھی کلام کیا جاسکتا ہے، لیکن خیر تین نام مان لیجئے) جب ان تینوں میں سے بھی بعض ”لڑکیوں کی حد تک تو جواز کے قائل“ ہیں تو مطلقاً عدم جواز کے قائل کتنے رہ گئے۔؟ (ناقل) یا پھر اس واقعہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات پر محمول کرتے ہیں، (اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ حدیث باجماع امت روایتاً و درایتاً صحیح ہے اور سلف و خلف میں سے کسی بھی قابل اعتبار شخصیت نے اسے روایتاً صحیح اور درایتاً غلط نہیں کہا، اب اسے درایتاً غلط کہنا کسی ملحد اور زندیق ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اگر فکر و نظر کے ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ میں ایمانی رفق کسی درجہ میں بھی باقی ہوتی تو تمام امت کی درایت کو (جن میں ان کے پیش کردہ تین نام بھی شامل ہیں) غلط ٹھہرا کر ملاحظہ مغرب کی کورانہ تقلید میں اسے رد نہ کرتے، زیادہ سے زیادہ اسے خصوصیت پر محمول کر لیتے، تو مسلمانوں کو ان سے متعلق کسی حد تک حسن ظن کی گنجائش تو رہ جاتی۔ ناقل) لیکن اس موقع پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے۔ کہ مذکورہ بالا حدیث کتنی ہی قوی اور سند کے اعتبار سے کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو لیکن بہر حال وہ ایک خبر واحد ہے جو قرآن کی نص صریح کے مقابلہ میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔“

(ملفوظ قسط دوم ص ۳۳)

سبحان اللہ۔ یہاں آ کر تو ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ نے اپنی فضیلت و نقاہت کا سارا بچہ ہی جھاڑ دیا، ذرا سوچئے کہ جو حدیث خود ان کے بقول، ”مشرق و مغرب، جنوب و شمال، عرب و عجم، ترک و تاجیک“ الغرض تمام خطہ زمین کی ”تمام معتبر کتب حدیث“ تفسیر، فقہ، سیر اور تاریخ میں صحیح ترین سندوں کے ساتھ موجود ہو اور امت کے اولین و آخرین، اور سلف و خلف کے تمام علماء، فقہاء، محدثین نے اسے قبول کیا ہو، اور اس کی اسانید صحیح اس کثرت سے ہوں کہ اگر ان سب کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب بن جائے، کسی ”فاضل و فقیہ“ سے نہیں ادنیٰ ہوش و حواس کے آدمی سے پوچھ دیکھئے کہ کیا وہ خبر واحد کہلائے گی، یا تمام امت کی مسلمہ اور متواتر۔؟ جب ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کو بھی تسلیم ہے کہ امت مرحومہ کا ہر طبقہ از اول تا آخر اس پر مہر تصدیق ثبت کرتا رہا ہے اور کبھی کسی نے بقائمی ہوش و حواس، اس کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اٹھائی تو اسے ”خبر واحد“ کہہ کر رد کرنے کو جنون کہا جائے یا زندہ یقینت اور رد کرنے والے کو دماغی ہسپتال کا مشورہ دیا جائے، یا کسی مغربی یونیورسٹی کا۔؟

ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق ادارہ
تحقیقات کی مہذب زبان

”عقل انسانی اسے کسی طرح باور نہیں کرتی کہ ایک نو
سال کی ”الہڈ لڑکی“ اپنے میکہ میں ان تمام علوم و فنون میں اس
قدر مہارت کی مالک ہو سکتی ہے کہ اس کا علم پوری امت کی
عورتوں سے بڑھ جائے۔“

(بلفہ قسط دوم ص ۴۸)

صغریٰ کی شادیوں کے جواز پر ایک اور حدیث :

”صغریٰ کی شادیوں کے جواز پر بعض فقہاء کرام نے ایک دوسری روایت سے بھی استدلال کیا ہے۔ (ابھی ابھی ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ فرماتے تھے کہ نابالغی کے نکاح کی بنیاد صرف ایک حدیث پر ہے۔ مقام شکر ہے کہ ان کو ایک دوسری روایت بھی نظر آگئی۔ ناقل) وہ روایت یہ ہے : محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ مجھے عبداللہ ابن ابی بکر بن حزم اور عبداللہ ابن حارث اور ایک ایسے آدمی نے بتایا جسے میں متسم نہیں سمجھتا کہ عبداللہ ابن شداد کا بیان ہے کہ جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کیا تھا وہ ان کے بیٹے سلمہ تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت حمزہ کی صاحبزادی سے فرما دیا تھا اور یہ دونوں ان دنوں چھوٹے بچے تھے۔ مگر دونوں کی موت واقع ہو جانے کی وجہ سے یہ دونوں یکجا نہیں ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ کیا میں نے سلمہ کی اس بات کا بدلہ کہ اس نے اپنی ماں کے ساتھ میرا نکاح کرا دیا تھا اتار دیا ہے۔“؟

یہ روایت سند کے اعتبار سے جیسی کچھ ہے، (یہ) ”جیسی کچھ ہے“ جرح مبہم ہے، جو قائل قبول نہیں، بظاہر سند بے غبار ہے، یوں بھی جب ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کے دربار میں کلبی مرحوم کی ”مجلسی خوش گپیاں“ یہاں تک درجہ استناد حاصل کر لیتی ہیں کہ ان کی بنیاد پر متواتر احادیث کو رد کر دیا جاتا ہے، تو یہ حدیث اس

سے بہرہاں بدرجہا فائق ہے، اس سے ایک فرعی مسئلہ کیوں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ناقل) اہل علم پر مخفی نہیں، لیکن برسبیل تنزل اسے قابل اعتماد تسلیم کر لیا جائے، تب بھی اس سے استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بنص قرآن مومنین پر ولایت عامہ حاصل تھی، اس لئے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف بلوغ کے بعد کر سکتے تھے، اسی طرح بلوغ سے پہلے بھی کر سکتے تھے، (بجہ اللہ ہمیں تو نہ آپ کی ولایت عامہ میں کوئی اشکال ہے، نہ آپ کے کسی کا نکاح قبل از بلوغ یا بعد از بلوغ کرا دینے میں کوئی دقت ہے، لیکن بے چارے ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کے لئے یہ سب چیزیں مشکل ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک نکاح کی عمر بلوغ ہے، اس لئے بلوغ سے پہلے ان کے نزدیک نکاح کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی ہے۔ پس جس طرح شکم مادر میں بچہ نکاح کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسی طرح بلوغ سے پہلے بھی، اس صورت میں ان کی یہ تاویل کیسے چل سکتی ہے کہ نابالغی میں نکاح کرا دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ کیونکہ جب محل، محل نکاح نہیں، نہ اس میں نکاح کی صلاحیت ہے تو وہاں نکاح کا تصور ہی غلط ہوگا۔ چہ جائیکہ اس کے لئے خصوصیت کا نکتہ تلاش کیا جائے، اور اگر وہ یہ تسلیم کر لیں، کہ نابالغ بچہ بھی محل نکاح ہو سکتا ہے، اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اس کا نکاح کر دیا جائے، تو ہم گزارش کریں گے کہ جب عاقد میں صلاحیت موجود ہے، اور محل بھی صالح للعقد ہے تو مانع جواز کیا ہے۔ یعنی

جب ولایت عامہ کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نابالغ کا نکاح کرا سکتے ہیں، تو ولایت خاصہ کی وجہ باپ یا ولی کیوں نہیں کرا سکتے۔؟ نیز اس صورت میں ”نص صریح“ کے ڈھونگ کا کیا بنے گا؟ دیکھئے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی خود رائی نے ان کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا کیا خوب سماں پیدا کر دیا۔ (ناقل) اس لئے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، دوسرا کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ یا لفظ تزویج کو وعدہ نکاح پر محمول کیا جائے،

(یہ جواب تو محض وزن بیت ہے، جس پر ان کا شکست خوردہ

ضمیر خود بھی ملامت کرتا ہو گا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں اس

”تاویل بیجا“ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ناقل)۔“

صغریٰ کے نکاح کا جواز قرآن مجید سے ثابت ہے

”ملک کے چودہ مقتدر علمائے کرام نے نص صریح کے

علی الرغم۔ اس مسئلہ پر خود قرآن کریم ہی سے استدلال کی سعی نا

مشکور فرمائی۔ (فاضل و فقیہ مقالہ نگار پہلے نص صریح ثابت

کریں۔ پھر اس کی موافقت یا مخالفت کا قصہ زیر بحث لائیں۔

ناقل) چنانچہ واللہ لایم یحضن سے انہوں نے یہ نکالا،

کہ ”نابالغ طلاق شدہ لڑکیوں کی عدت تین ماہ بیان فرمائی گئی اور

عدت طلاق نکاح کے بعد ہی ہو سکتی ہے، اس طرح صریح طور پر

قرآن مجید نابالغ لڑکیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دیتا ہے۔“

چودہ علماء کے اس استدلال سے گردن مارے ندامت کے جھک

جاتی ہے، کیونکہ یہ تو واضح ہے، کہ عدت طلاق کا سوال مقاربت کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اس آیت سے بالفاظ صریح یا صریح الفاظ میں نابالغ لڑکیوں سے نکاح کا جواز ثابت ہوتا ہے، تو الفاظ صریح اور صریح الفاظ میں ان سے مقاربت کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے، کیا قرآن کریم اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ یہ قرآن کریم پر انتہائی افسوسناک اتہام ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

تلخیص (قسط دوم ص ۵۰-۵۱)

اگر یہ ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کی فقہیت میں انتہائی افسوسناک اتہام ہے، تو انہیں اطمینان رکھنا چاہئے، کہ یہ بیچارے چودہ مقتدر علماء کرام کی طرف سے نہیں، بلکہ زبان روکو نبیؐ تک اور نبیؐ کے مہربان تک بات پہنچے گی، کیونکہ: ابن جریر، ابن اسحاق، اور مستدرک میں بہ سند صحیح مروی ہے:

”واخرج ابن جریر و اسحاق بن راہویہ
والحاکم و غیر ہم بسند صحیح عن ابی بن
کعب قال لما نزلت الاية في سورة البقرة في
عدة النساء قالوا قد بقي عدد من النساء لم
يذكرن الصغار والكبار واولات الاحمال
فنزلت واللائى يئسن من المحيض من نساءكم
الايم“

(تفسیر مظہری ص ۳۲۲ ج ۹)

ترجمہ: ”امام ابن جریر، اسحاق بن راہویہ اور حاکم وغیرہ نے ”بہ

سند صحیح“ حضرت ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ جب عورتوں کی عدت کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کی کہ عورتوں کی کچھ تعداد باقی رہ گئی ہے۔ جن کا ذکر (اس آیت میں) نہیں کیا گیا، یعنی نابالغ، عمر رسیدہ، اور حاملہ عورتیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی واللانی یحسن من المحیض من نساء کم الایقہ۔“

اس کے علاوہ کسی بھی بڑی چھوٹی تفسیر کی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ صحابہ کرام، تابعین، ائمہ فقہ، ائمہ حدیث اور ائمہ عربیت کی جانب سے واللانی لم یحضن کی یہ تفسیر ملے گی، کہ ”اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو صغرنی کی وجہ سے ایام آنا شروع نہ ہوئے ہوں۔“ اب فرمایا جائے کہ یہ تہمت چودہ مقتدر علماء کرام نے لگائی ہے، یا فکر و نظر کے فاضل اور فقیہ مقالہ نگار کے غلط تصور اور کج فہمی نے یہ طوفان برپا کیا ہے۔؟ اور نابالغ طلاق شدہ لڑکیوں کی عدت، خدا و رسول، صحابہ و تابعین نے بیان فرمائی ہے یا چودہ علماء نے۔؟ اور اسی سے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کے اس برخود غلط دعویٰ کی بھی قلعی کھل گئی کہ ”دور نبوی میں صغرنی کے نکاح کا رواج نہیں تھا“ حق تعالیٰ علم کے ساتھ ذہن کی سلامتی اور فکر میں اصابت بھی عطا فرمائیں، تب ہی کام چلتا ہے، ورنہ ”نام نہاد فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ کی طرح آدمی فاضلہ اللہ علی علم کا مصداق بن کر ادھر ادھر کی واہی تباہی ہانکنے لگتا ہے۔

ربنا لاترغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا، وہب لنا

من لدنک رحمة انک انت الوہاب

تعدد ازدواج اور اسلام

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”تمام مدافعين اسلام کی سادہ لوحی (اور حماقت)“

”یورپ کے مستشرقین نے اس بات کو سامنے رکھ کر کہ اسلام تعدد ازدواج کا حامی ہے، اسلام کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے اب تک ہزارہا صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کی طرف سے مدافعت کرنے والوں نے بھی اپنی سادہ لوحی سے اس ”غلط تہمت“ کو قبول کر کے ان کے جوابات کے سلسلہ میں کچھ کم صفحات سیاہ نہیں کئے۔ ان مدافعت فرمانے والوں کا انداز بالکل ایسا ہی ہے، جیسے اپنے دامن پر کچھ ناخوشگوار دھبے دیکھ کر دل ہی دل میں شرم رہے ہوں۔“

(فکر و نظر جلد ۱۱ ص ۱۳)

لیکن معاف کیجئے یہ غلط تہمت آپ کے ڈاکٹر فضل الرحمن کے بقول ”قرآن کی قانونی سطح“ اور اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ نے لگائی۔ ناقل۔

(ملاحظہ ہو فکر و نظر جلد ۴ ش ۱ ناقل)

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

”اسلام کی نظر میں تعدد ازدواج بہر حال ایک ناقابل حمایت برائی ہے“

”اسلام نے جن حالات میں تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے اس کی حیثیت قطعاً ایسی ہی ہے جیسا کہ ہم کسی بڑی برائی سے بچنے کے لئے بعض اوقات کسی چھوٹی برائی کو اختیار کر لیتے اور اس کی اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس اجازت سے قطعاً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ہم اس برائی کی حمایت کر رہے ہیں۔ برائی بہر حال برائی ہی رہتی ہے۔ اور ہر صورت میں ناقابل حمایت۔“

(ایضاً ص ۱۱۴)

لیکن اس بہر حال ناقابل حمایت برائی کے خلاف امت اور امت کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیوں آواز نہ اٹھائی؟ اور اس ”ناقابل حمایت برائی“ کا انکشاف اپوا کی بیگمات کی بیجا ضد کے بعد یکایک کیسے ہو گیا؟ قرآن کی وہ کونسی نئی آیت نازل ہو گئی جس کی روشنی میں انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کو محض فرضی ضرورت کی آڑ میں مسلسل عمل فحش پر عمل پیرا قرار دیا گیا۔ ناقل)

انبیا علیہم السلام اسی برائی پر عمل پیرا رہے :

”کہا جاتا ہے کہ تعدد ازدواج انبیا علیہم السلام اور اسلاف کی سنت رہی ہے۔ جہاں تک انبیا علیہم السلام کا تعلق ہے تو ضروری نہیں کہ انہوں نے جو کام کئے ہوں وہ سب کے سب ہمارے لئے بھی سنت کا درجہ رکھتے ہوں۔“ (ایضاً)

صدیقین، شہدا، اور صالحین کا یہ متواتر ”عمل بد“ کسی ضرورت سے ہوگا :

” رہ گئے ہمارے اسلاف و اکابر تو ان تمام حضرات کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں ان حالات کا جائزہ بھی لینا چاہئے، جن میں انہوں نے تعدد ازدواج پر عمل فرمایا تھا۔ اگر انہوں نے واقعتاً کسی بڑی برائی سے بچنے کے لئے یا کسی بلند تر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس کو اختیار فرمایا تھا، تو ضروری نہیں کہ ہم بھی ان کی پیروی کریں اَللّٰہ کہ ہم بھی انہیں جیسے حالات سے دو چار نہ ہو گئے ہوں۔“

(ایضاً)

انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کا عمل متواتر سنت نہیں

” پھر سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ کیا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین نے یا ہمارے اسلاف و اکابر نے کبھی بھی تعدد ازدواج کو سنت نبوی قرار دیا ہے؟ اور اس کی لوگوں کو ترغیب دی ہے؟ یا اس پر کسی ثواب کا وعدہ کیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو آج ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم ان حضرات کے علی الرغم اسے سنت قرار دے دیں۔“

(ایضاً)

(اگر انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کا بلا تکثیر عمل متواتر بھی

سنت نہیں ہوتا تو اسلام میں ”سنت نبوی“ کا وجود ہی کہنا چاہئے کہ
سرے سے نہیں ہے۔ ناقل)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر قانون فطرت کے خلاف
تھا :

”اگر وحدت ازدواج قانون فطرت نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ
قدرت کو کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی کہ آدم کے لئے ایک سے
زیادہ بیویاں پیدا کر دی جاتیں، اور اس طرح نسل انسانی کو جلد از
جلد بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع مہیا کر دیئے جاتے۔ لیکن
اس وقت بھی جب کہ ضرورت تھی، قدرت نے ایسا کوئی انتظام
نہیں فرمایا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قانون فطرت یہی ہے،
کہ مرد کے لئے ایک ہی بیوی ہونی چاہئے۔“

(حوالہ بالا ص ۲۱)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر قانون قدرت کے بھی
خلاف تھا :

”علاوہ ازیں قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ بات بھی نہایت
وضاحت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ کہ قانون قدرت بھی یہی ہے، کہ
ایک نر کے لئے ایک مادہ ہو۔ قدرت نے انسانوں کو اسی انداز سے
پیدا کیا ہے۔ (چند آیات نقل کرنے کے بعد) لہذا جب قانون
قدرت یہی ہے، کہ وہ ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کرتا ہے، ایک
نر اور ایک مادہ، نباتات، حیوانات اور انسانوں میں سب میں یہی

قانون کارفرما اور بقائے نسل کے لئے وہ اسی کو کافی سمجھتا ہے۔
چنانچہ طوفان نوح کے سلسلہ میں اس نے ہر چیز کا ایک ایک جوڑا
رکھنا ہی کافی سمجھا تھا۔ تو ایک مرد کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کا
ہونا قانون قدرت کے بھی خلاف ہے۔“

(ص ۲۳)

ان حضرات کا یہ عمل متواتر ”الطبیات للطیبین“
کے فطری اصول کی ضد تھا:

سورہ نور کی آیت الخبیثات للخبیثین
والخبیثون للخبیثات الا یف ذکر کرنے کے بعد ارشاد
ہوتا ہے:

”یہاں بھی جمع کے صنفے کو جمع کے لئے ثابت کیا گیا ہے،
جیسا کہ اضافت جمع بسوئے جمع کے سلسلہ میں ہم پہلے بتا چکے ہیں،
ایسی صورتوں میں جمع کے ہر فرد کے لئے دوسری جمع کا ایک ایک فرد
مراد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اسی اصول کے ماتحت ہر خبیث
عورت کے لئے ایک ایک مرد اور ہر خبیث مرد کے لئے ایک ایک
خبیث عورت مراد ہے۔ جیسا کہ ہر پاکیزہ مرد کے لئے ایک ایک
پاکیزہ عورت اور ہر پاکیزہ عورت کے لئے ایک ایک پاکیزہ مرد ہو سکتا
ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک پاکیزہ مرد کے لئے
چار چار پاکیزہ عورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا ایک خبیث مرد کے لئے چار
چار خبیث عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔“

(حوالہ بالا ص ۲۹)

مقالہ نگار ”پاکستان کی عائلی شریعت“ کا تقدس ثابت کرنے کے لئے، انبیاء صدیقین، شہداء، صالحین کے عمل متواتر پر قانون لغت، قانون فطرت اور قانون قدرت (اور نامعلوم کس کس قانون) کی مخالفت کا فتویٰ صادر فرمائیں، بہر حال ان کے ”حق نمک“ کا تقاضا ہے، اس ”حق ادائی“ میں وہ تکیویناً معذور ہیں، لیکن اتنے حواس باختہ تو انہیں نہیں ہونا چاہئے کہ جس ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حق میں الطبیات للطیین کی آیت نازل ہوئی تھی، انہیں کے بارے میں یہ دعویٰ کریں کہ یہ آیت ان پر صادق نہیں آسکتی، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نوامہات المؤمنینؓ بھی (جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی) اس آیت کا مصداق نہیں، تو فرمائیے کہ یہ اصول آخر کس پر منطبق ہوگا۔ ناقل۔

امت کے تمام مفسرین اور مجتہدین نے تعدد ازدواج کی آیت کے مفہوم میں ٹھوکر کھائی، جس سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں

”لیکن ہمارے مفسرین و مترجمین نے اس آیت کا وہ مطلب نہیں لیا جو ہم نے بیان کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، یہاں نمونے کے طور پر ہم مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ اور تفسیر نقل کرتے ہیں۔ باقی تمام مفسرین و مترجمین نے بھی اسی اندازہ کے ترجمہ اور تفسیریں فرمائی ہیں۔ مولانا آزاد اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں۔“

(ایضاً ص ۳۰)

جی ہاں تمام صحابہ، تابعین اور مفسرین کی تفسیر سے تو ”بڑی پیچیدگیاں“ پیدا ہو

گئیں، (ان میں سب سے بڑی پیچیدگی تو یہی ہے کہ اس سے عائلی قوانین کی دفعہ ۶ کا لغو، لچر اور مہمل ہونا لازمی آتا ہے) لیکن مقالہ نگار کی ”ایمر جنسی تفسیر“ سے تمام عقدے حل ہو گئے، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرامؓ تک کا عمل ”بہر حال ایک ناقابل حمایت برائی“ قرار پایا۔ ناقل۔)

ان حضرات نے قرآنی عبارت کو بالکل الٹ اور ”من مانے“ معنی پہنادیئے

” ہم ان تراجم و تفسیر کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مولانا آزاد نے جو فرمایا ہے اور بین القوسین جس قدر عبارتیں اپنی طرف سے بڑھائی ہیں، وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے عبارت قرآنی کو ایسے معنی پہنادیئے ہیں جو اصل عبارت کے بالکل ہی الٹ ہیں۔“

(ایضاً ۳۳)

مولانا آزاد مرحوم اور دوسرے تمام مفسرین نے بین القوسین چند توضیحی الفاظ بڑھادیئے تو یہ حضرات قرآنی عبارت میں بالکل الٹ اور من مانے معنی پہنانے کی وجہ سے گردن زدنی قرار پائے، لیکن مقالہ نگار نے قوسین کی قید سے آزاد ہو کر تین چار صفحے آیت کی فرضی مراد واضح کرنے کے لئے سیاہ کر دیئے، اور ”فاضل و فقیہ“ کے خطاب کے مستحق ہو گئے۔

ان حضرات نے جس اصول شکنی کا ارتکاب کیا، اصل قصور اس کا ہے

”واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہ مولانا ابوالکلام آزاد کا کوئی

قصور ہے۔ اور نہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اور نہ دیگر مفسرین و مترجمین کا، قصور اس اصول شکنی کا ہے، جو اس سلسلہ میں سرزد ہو گئی ہے۔“

(ایضاً ۳۴)

جی ہاں، ان بیچاروں (تمام مفسرین) کو معاذ اللہ اتنی بصیرت اور عقل کہاں نصیب تھی، کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کسی اصول کی پابندی کا لحاظ رکھتے، اور تمام انبیاء و اولیاء کے عمل متواتر کو ”عمل بد“ قرار دینے کی ہمت کرتے۔ یہ تمام چیزیں مقالہ نگار کی فضیلت و فقاہت ہی کو نصیب ہیں۔

تمام مفسرین نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و تابعین کے الفاظ کو خود ساختہ معنی پہنا دیئے

”اس سلسلہ میں دشواری یہ ہے، کہ ہم دلیل میں الفاظ تو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعین کے پیش کرتے ہیں۔ اور ان کو معنی وہ پہنا دیتے ہیں جو ہم نے خود اپنے ہاں متعین کر رکھے ہیں، حالانکہ ہمیں ان حضرات کے الفاظ کا وہی مفہوم لینا چاہئے، جس میں وہ حضرات خود ان الفاظ کو استعمال کرنے کے عادی تھے نہ اپنا خود ساختہ مفہوم۔“

(ایضاً ۳۰)

شان نزول کی حدیث کو سامنے رکھ کر مفسرین نے آیت کے ترجمہ و تفسیر میں تصرفات کئے:

”اس تمہید کے بعد آئیے اس حدیث پر غور کریں جو

آیت زیر بحث کے شان نزول کے سلسلہ میں پیش کی جاتی ہے اور جس کی بنیاد پر آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر میں وہ تصرفات کئے گئے ہیں، جو آپ پہلے دیکھ چکے ہیں۔“
(ایضاً ص ۳۸)

اسلام میں ”مقالہ نگار“ کے ”خود ساختہ اصول“ کو اہمیت ہے، لیکن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین، اور تمام فقہاء کی شخصیت، ان کی سمجھ بوجھ، اور ان کے عمل متواتر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں

”اس سلسلہ میں ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے، کہ اگر بات یہی ہے، جو تم بیان کر رہے ہو تو پھر چودہ سو سال سے مسلمانوں میں تعدد ازدواج کا رواج کیوں چلا آ رہا ہے۔ تم سے پہلے بڑے بڑے جید علماء اور بڑے بڑے مقتدر فقہاء کرام گزر چکے ہیں۔ ان کی سمجھ میں بات کیوں نہیں آئی جو تم کہہ رہے ہو اور انہوں نے عام حالات میں مسلمانوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے سے کیوں نہیں روکا۔ بلکہ تاریخ تو ہمیں بتاتی ہے کہ وہ خود بھی تعدد ازدواج پر عمل کرتے رہے ہیں۔ کیا اتنے بڑے بڑے اکابر ایک غلط اور ناجائز کام کرتے رہے۔ اس کا ایک جواب تو اصولی ہے، اور وہ یہ کہ اسلام میں اہمیت اصول اور قانون کو ہے۔ شخصیتوں کو نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ قرآن و سنت سے ہمیں کیا ہدایات ملتی ہیں۔ اور ان پر ہی ہمیں عمل کرنا چاہئے۔“

اگر کسی شخصیت کا عمل قرآن و سنت کی ہدایات کے خلاف نظر آتا ہے تو تاویل یا توجیہ قرآن و سنت میں نہیں کی جانی چاہئے بلکہ اس شخصیت کے عمل میں کی جانی چاہئے۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۱ ص ۴۶)

امت کے چودہ سو سالہ عمل کی زیادہ سے زیادہ یہ توجیہ ممکن ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں ہنگامی حالات سے دو چار رہیں

”ویسے ہمیں یقین ہے کہ ان حضرات کا عمل قرآن کریم اور سنت نبویؐ کے خلاف نہیں ہوگا۔ اگر ہم اس سلسلہ میں یہ بات ثابت نہیں کر سکتے کہ انہیں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی سخت ضرورت لاحق تھی تو دوسری طرف ہم ان کے سلسلہ میں یہ بات بھی تو ثابت نہیں کر سکتے کہ انہوں نے بغیر جائز ضرورت ہی کے ایک سے زیادہ بیویاں رکھ چھوڑی تھیں۔ قرآن و سنت کی وہ تمام ہدایات جو آج ہمارے سامنے ہیں، یقیناً ان کے سامنے بھی تھیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ تمام ہدایات ہم تک انہی حضرات سے پہنچی ہیں۔ اگر ہم ان کے خلاف کسی سوء ظنی میں مبتلا نہیں ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اب تمام ہدایات کو جانتے ہوئے خود ان کے خلاف عمل کرتے ہوں۔ حسن ظن کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم یہ بات تسلیم کریں کہ یقیناً ان کے دور میں اسلامی معاشرہ عمومی طور پر یا خود ان کے اپنے ذاتی اور خاندانی

حالات، خصوصی طور پر اس امر کے مقتضی ہوں گے کہ وہ اس
ہنگامی یا خصوصی ہدایت پر عمل پیرا ہوں۔“

(ایضاً ص ۴۷)

ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ کا موقف یہ ہے کہ اسلام
میں ”ایمر جنسی“ کی شرائط کے بغیر بھی تعدد ازدواج کی (چار تک) اجازت ہے۔ اور
مقالہ نگار اور ان کے موکلین کا موقف یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ بہر حال ایک
ناقابلِ حمایت برائی ہے، جسے خصوصی حالات اور ہنگامی صورت میں جائز قرار دیا گیا
ہوگا۔ لیکن اسلامی تاریخ میں ایک لمحہ کے لئے نہ یہ شرط کبھی غائب ہوئی، نہ عدم جواز
کا سوال کبھی زیر بحث آیا۔ نتیجہ کے طور پر اس موقف کو تسلیم کر لینا ان کو بھی ناگزیر
ہوا جس کی امت مسلمہ قائل چلی آئی ہے، اب ہم یہ فیصلہ عقلاء پر چھوڑتے ہیں کہ
ان دونوں میں کون سا موقف حق بجانب ہے۔

(الحق ذو القعدہ ۱۳۸۶ھ)

طلاق کے احکام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد،
جناب عمر احمد عثمانی اس وقت فتنہ انکار حدیث کے سربراہ
غلام احمد پرویز کے دست و بازو اور ڈاکٹر فضل الرحمن کی تحریک انکار
دین کے سرپرست اور روح رزاں ہیں، موصوف اس نسبت سے اکثر
و بیشتر اسلام کے متفقہ مسائل پر مشق ناز فرمایا کرتے ہیں۔ ذیل میں
ان کے ایک مضمون ”طلاق کے احکام“ (جو ماہنامہ فکر و نظر جلد ۲
شمارہ ۲ تا ۷ میں شائع ہوا ہے) میں کی گئی تحریفات کا اجمالی جائزہ پیش
کیا جا رہا ہے۔ موصوف کے تمام تراقیات فکر و نظر کے درج بالا
شماروں سے بلطف نقل کئے گئے ہیں۔ مقالہ پر تنقید عنوانات اور
تعلیقات اور بین القوسین جملوں کی شکل میں ہوگی۔ ذیل
میں ان کی تحریفات ملاحظہ ہوں۔

ماڈرن اسلام کی ماڈرن تفسیر؛

”الطلاق مرتان فامساک بمعروف او تسريح
با حسان (الی قوله تعالى) فان طلقها فلا تحل له
من بعد حتى تنكح زوجاً غیره“

ترجمہ: ”(ترجمہ کے بعد) ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ ہر طرح کی مصالحتی کوشش بروئے کار آئے کے بعد (لیکن موجودہ فیملی لاز کی شریعت میں قرآنی آیات کے علی الرغم تین طلاقیں دینے کے بعد مصالحتی کوشش بروئے کار لانے، کا فتویٰ صادر فرمایا جاتا ہے، کیا یہ قرآن کی صریح مخالفت تو نہیں ہے؟ (ناقل) جب یہ ثابت ہو جائے کہ میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی تو شوہر طلاق دے کر معاہدہ نکاح کو فسخ کرنے کا اعلان کر سکتا ہے اس اعلان (ایک طلاق رجعی) سے نکاح بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے؟ یا بدستور باقی رہتا ہے۔ اگر باقی ہے تو مزید طلاق کا حق کیوں نہیں؟ (ناقل) پہلی مرتبہ اس اعلان کے بعد شوہر کو پھر بھی یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو عدت کے دوران طلاق سے رجوع کرے، قریب تین ماہ کا عرصہ (قرآن کریم ایسی عورتوں کے لئے جنہیں ایام آتے ہوں، عدت طلاق تین حیض (یا تین طہر علی اختلاف القولین بتلاتا ہے لیکن عائلی شریعت میں نوے دن کی عدت کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ ناقل) کچھ کم نہیں ہوتا شوہر اس عرصہ میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر سکتا ہے، بیوی بھی شوہر کو منانے اور راضی کر لینے کی کوشش کر سکتی ہے، اگر اس عرصہ عدت میں شوہر نے طلاق سے رجوع کر لیا۔ فہا ورنہ عدت گزر جانے کے بعد رشتہ نکاح بالکلیہ منقطع ہو گیا تاہم اب بھی میاں بیوی کو اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ چاہیں تو تجدید معاہدہ کے ساتھ از سر نو

دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اگر شوہر نے عدت کے دوران رجوع کر لیا تھا یا عدت گزر جانے کے بعد تجدید نکاح کر لی تھی، لیکن مزید تجربہ کے بعد پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دونوں کا نباہ ممکن نہیں، اور وہ ایک دوسرے کے حقوق و واجبات کا حقہ ادا نہیں کر سکتے اور شوہر دوسری مرتبہ بھی طلاق دے دیتا ہے تو اس دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد بھی اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ دونوں اب بھی اپنی اصلاح کر لیں جو باتیں ایک دوسرے کے لئے وجہ شکایت ہوں ان کا ازالہ کر لیں۔ لہذا اگر صورت حال سدھر جانے کی توقع ہو تو شوہر کو اس مرتبہ بھی یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ عدت کے زمانہ میں طلاق سے رجوع کر لے۔ اگر عدت گزر چکی ہے تو میاں بیوی پھر باہمی رضامندی سے تجدیدی معاہدہ کے ذریعے از سر نو نکاح کر سکتے ہیں، اگر اس مرتبہ بھی تجربہ سے یہی ثابت ہوا کہ وہ دونوں واقعی نباہ نہیں کر سکتے اور شوہر تیسری مرتبہ پھر طلاق دے دیتا ہے، تو اب یہ عورت اس کے لئے قطعاً حرام ہو گئی، اب وہ نہ عدت کے دوران اس سے رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت کے بعد تجدید نکاح کر سکتا ہے، اب یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرے لیکن اگر اس کا گزارا وہاں بھی نہ ہو سکے اور دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے یا وفات پا جائے تو اب یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے کیونکہ اس قدر دھکے کھا لینے کے بعد اب توقع کی جا سکتی ہے کہ شوہر کو بھی اپنی حماقتوں کا احساس ہو گیا ہو گا اور وہ بھی

واقعاً اس کے ساتھ نباہ کر لینے کے لئے تیار ہو گیا ہو گا۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۹۹-۱۰۰)

اس تفسیر کا حاصل صرف یہ ہے کہ ایک طلاق کے بعد جب تک رجعت نہ کر لی جائے (یا ختم عدت کے بعد تجدید نکاح نہ کر لی جائے) نہ تو مزید طلاق دینے کا حق ہے اور نہ وہ نافذ ہوں گی لیکن یہ مقالہ نگار کی ذہنی ایچ اور خیالی مفروضہ ہے جو عائلی شریعت کی وجہ جواز پیدا کرنے کے لئے تراشا گیا ہے، ورنہ قرآن کریم کے الفاظ سے، اس کی تائید ہوتی ہے شریعت اسلامیہ میں ایک نکاح کے لئے طلاق کا کامل نصاب تین طلاقیں اور اس کے برعکس عائلی شریعت ایک نکاح میں ایک طلاق کا فتویٰ دیتی ہے۔

طلاق سنت میں صحابہؓ اور فقہاء کے مذاہب کی تفصیل

”اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ ان عورتوں کے لئے

جنہیں ایام آتے ہوں طلاق سنت کیا ہوتی ہے چنانچہ ہمارے اصحاب

(تمام علمائے احناف) نے کہا ہے کہ بہترین طلاق دینے کا طریقہ یہ

ہے کہ آدمی اپنی بیوی کو س وقت طلاق دے جب وہ ایام سے پاک

ہو چکی ہو اور وہ اس کے پاس نہ گیا ہو، پھر وہ اسے چھوڑ دے

تا آنکہ اس کی عدت پوری ہو جائے، اور اگر وہ اسے تین طلاقیں

دینا چاہتا ہو، تو ہر طہر کے وقت ایک طلاق دے دے، اس کے پاس

جانے سے پہلے پہلے۔۔۔ سفیان ثوریؒ کا قول یہی ہے، اور امام

ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ہمیں ابراہیم نخعیؒ کے ذریعے سے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے متعلق یہ بات پہنچی ہے کہ وہ

اسی کو پسند کرتے تھے کہ لوگ ایک سے زیادہ طلاقیں نہ دیں حتیٰ کہ

عورت کی عدت گزر جائے اور یہ صورت ان کے نزدیک اس سے افضل ہے کہ آدمی ہر طہر کے وقت ایک ایک طلاق کر کے اسے تین طلاقیں دے دے۔“ (اگرچہ یہ دوسری صورت بھی ان کے نزدیک جائز تھی، اور وہ تین طہروں میں دی گئی تین طلاق کو شرعاً صحیح اور نافذ سمجھتے تھے، اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ ناقل) امام مالک بن اعین بن سلمہ الماجشون، یسٹ بن سعد، حسن بن صلاح، اور امام اوزاعی نے کہا ہے کہ طلاق سنت یہ ہے کہ عورت کو طہر میں مقاربت سے پہلے ایک طلاق دے دی جائے یہ حضرات عورت کو تین طہروں میں تین طلاقیں دینے کو مکروہ (ناپسند) سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر آدمی اس سے رجوع کرنا نہیں چاہتا تو وہ ایک طلاق دے کر اسے چھوڑ دے تا آنکہ اس کی عدت پوری ہو جائے (تاہم یہ تین طلاقیں ان کے نزدیک نافذ اور شرعاً معتبر ہوں گی کمافی الموطا۔ ناقل) امام شافعی نے فرمایا ہے، جیسا کہ مزنی نے ان سے روایت کی ہے کہ شوہر کے لئے تین طلاقیں دینا حرام نہیں، اگر شوہر اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تجھے سنت کے مطابق تین طلاقیں ہیں، اور عورت پاک ہو چکی ہو اور شوہر اس کے پاس نہ گیا ہو تو تینوں طلاقیں ایک ساتھ پڑ جائیں گی۔“

(بحوالہ امام ابو بکر جصاص "احکام القرآن" ص ۴۲۶ (فکر و نظر جلد ۲ ش ۲ ص ۱۰۳)

ان تمام مذاہب کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر تین طلاقیں، تین طہروں میں متفرق کر کے واقع کی جائیں تو باجماع نافذ ہو جائیں گی، اور بیوی مغلظہ ہو جائے گی البتہ

احناف کے نزدیک یہ صورت غیر احسن ہے تمام صحابہؓ کے نزدیک غیر افضل ہے اور امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک کراہت اور ناپسندیدگی کا پہلو رکھتی ہے لیکن نہ تو ایک سے زائد طلاق کا ایک نکاح اور متفرق طہروں میں کسی نے کبھی حق سلب کیا ہے، نہ اسے غیر نافذ، غیر معتبر، لغو اور لایعنی قرار دیا ہے۔

تمام امت کا یہ فتویٰ کہ تین طہروں میں تین طلاقیں واقع کرنا صحیح اور نافذ ہے تلاعب بالقرآن ہے:

”اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس شخص کا جرم جو اپنی بیوی کو تین طہروں میں تین طلاقیں دے کر اسے اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، اس شخص کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو بیک وقت تین طلاقیں دے کر اسے اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے، کیونکہ یہ دوسرا شخص محض خدا کے ایک حکم کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے مگر پہلا شخص قرآن کے الفاظ سے کھیلتا ہے اور قرآن کے منشا کے خلاف عمل کرتے ہوئے خود قرآن ہی کے الفاظ کی آڑ لیتا ہے۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۵)

تین طہر میں تین طلاق کے قائلین قرآنی منشا سے منحرف، یہودی ذہنیت کے مالک اور قرآنی روح کے پامال کنندہ ہیں، خطرہ ہے کہ کہیں انہیں بندہ نہ بنا دیا جائے

”لیکن کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو قرآن کے اس منشا پر تو عمل کرنا نہیں چاہتے حکم کی روح کو کچل کر حکم کے الفاظ کی آڑ لینا

چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قرآن نے یہی فرمایا ہے تاکہ تین طلاقیں تین مرتبہ کر کے مختلف اوقات میں دی جائیں، لہذا ہم بھی یہ تین طلاقیں تین طہروں میں کر کے دے دیتے ہیں، تاکہ قرآن کے الفاظ کی گرفت سے بھی بچ جائیں، اور بیوی کو اپنے اوپر یوں حرام بھی کر لیں، یہ وہی ”یہودی ذہنیت“ ہے جو وحی الہی کے منشا کے خلاف وحی کے الفاظ سے کھیلنے کی عادی رہ چکی ہے۔ (یہاں اصحاب السبت کا واقعہ مذکور ہے۔ ناقل) بعینہ یہ حال ان لوگوں کا ہے کہ وہ بھی یہودیوں کی طرح قرآن کی روح کو پامال کر کے قرآن کریم کے الفاظ سے کھیلنا چاہتے ہیں ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے ان کو ذلیل بندر بنا دیا تھا۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۳ ص ۱۶۵-۱۶۶)

کچھ لوگ نہیں بلکہ خود مقالہ نگار کی نقل کے موافق تمام صحابہؓ، تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ بلکہ ”عالمی شریعت“ کے نافذ ہونے سے قبل کی تمام امت اگر فاضل و فقیہ مقالہ نگار کے نزدیک ان بدترین جرائم کے مرتکب صرف ”کچھ لوگ“ ہیں تو وہ ان ”بہت سے لوگوں“ کا نام بتلائیں جن کے نزدیک تین طہروں کی تین طلاقیں شرعاً غیر معتبر ہیں۔ اور وہ ان تینوں کو صرف ایک رجعی طلاق قرار دیتے ہیں۔

ایک عجیب و غریب نکتہ ”یقیناً — اور — ہوں گے“

”ان میں ”یقیناً“ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو سیدھی سادھی طرح خدا کی نافرمانی کر کے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار کھیل

لیتے ”ہوں گے“ مگر خدا نے ان کو یہ سخت سزا نہیں دی تھی۔“

(فکر و نظر جلد ۲ شمارہ ۳، ص ۱۶۶-۱۶۷)

اصحاب سبت کا واقعہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہے لیکن یہ ”یقیناً ہوں“ گے کی منطق کہاں مذکور ہے، کیا یہ مقالہ نگار کا اجتہاد فی التاریخ تو نہیں۔“ (ناقل)۔

ان تمام حضرات کا یہ فتویٰ الفاظ قرآن کے خلاف ہے :

” یہ طریقہ طلاق جسے بد قسمتی سے طلاق مسنون کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم کے الفاظ کے خلاف ہے۔“

(حوالہ بالا ص ۱۷۵)

بلکہ عقل و بصیرت کے بھی

”صرف اتنا ہی نہیں کہ“ مروجہ مسلک (جس کی تائید

صحابہ کرامؓ کے اجماعی فتویٰ سے حاصل ہے۔ (ناقل) قرآن کریم کے خلاف ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو عقل و بصیرت کے خلاف بھی معلوم ہوتا ہے۔“

(حوالہ بالا ص ۱۷۶)

دور فاروقی کا حسین مرقع محمد حسین ہیکل کی زبانی :

”اغلب گمان یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عمرؓ کے عہد میں اپنی

بیویوں کو طلاقیں دیتے تھے، وہ طلاق دینے کے بعد بیویوں کے ساتھ

مہربانی کا کوئی سلوک نہیں کرتے تھے بات یہ تھی کہ عراق و شام سے

گرفتار ہو کر بیشمار عورتیں آگئی تھیں، مدینہ منورہ بلکہ تمام جزیرہ

عرب کے لوگ ان کے حسن و جمال کے گرویدہ ہو رہے تھے، لہذا لوگ اپنی بیویوں کو دھڑا دھڑا طلاقیں دینے لگے تھے، تاکہ ان حسین و جمیل لڑکیوں کی رضامندی حاصل کر سکیں جو ان کے دلوں پر قبضہ جما چکی تھیں، یہ لوگ تین طلاقیں ایک ہی لفظ سے دیتے تھے، تاکہ وہ ”ناز آفریں حسینائیں“ بھی مطمئن ہو جائیں کہ اب وہ شوہروں کے دلوں پر تنہا حکمرانی کر سکیں گی، اور انہیں رجوع کرنے کا حق بھی رہے گا۔

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۴۱۷)

یاد رہے کہ محمد حسین ہیکل اور محمد امین مصری، مصر کے فضل الرحمن اور پرویز ہیں، محمد حسین صاحب نے اغلب گمان یہ ہے کہ ساتھ یہ ساری افسانہ طرازی کی ہے جس کا وجود ان کے اغلب گمان سے خارج نہیں پایا جاتا اور یہ خالص مغاربہ اور ان کے ہم رنگ مشارقہ کا انداز ناول نویسی ہے، بد قسمتی ہے کہ یہ لوگ خلفاء راشدین، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو بھی ناول اور افسانہ کے رنگ میں لکھنے پڑھنے کے خوگر ہیں، ان کی تحقیقات کا بیشتر حصہ محض فرضی ہوتا ہے۔

نیز بین القوسین کا اضافہ فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی جانب سے ہے ورنہ ہیکل کو بھی یہ نہیں سوچھی۔

خلیفہ راشد نے ”عربی عصیت“ کی خاطر قرآن کا حکم بدل دیا؟

”حضرت عمرؓ اپنی قوم کے مزاج سے خوب واقف تھے، وہ جانتے تھے کہ اگرچہ وقتی جوش کے ماتحت عرب نوجوان عجمی عورتوں کے حسن و جمال کے گرویدہ ہو رہے ہیں لیکن ان کی عربی عصیت کا

ایک ابھرتی ہوئی قوم کے لئے اپنی قومی عصبیت کا تحفظ بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس عربی عصبیت کو برقرار رکھنے کے لئے اس سے (تین طلاقیں کے نافذ کرنے سے) یہ فائدہ اٹھایا۔“

(فکر و نظر جلد ۲ ش ۷ ص ۳۲۲-۳۲۳)

یہ فیصلہ قرآنی حکم کی روح کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف و استہزا پر مشتمل ہے۔
 ”اس مضمون کی پچھلی قسط میں ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے طلاقیں صرف تین مرتبہ الگ الگ وقفہ کے ساتھ ہو سکتی ہیں اور ایک عدت کے شروع میں ایک طلاق ہی ہو سکتی ہے۔ پہلی دو مرتبہ کی طلاقیں میں مرد کو رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے اور تیسری مرتبہ کی طلاق میں رجوع کرنے کا حق نہیں رہتا“ قرآن کریم کی رو سے کئی کئی طلاقیں (دو یا تین یا ایک وقت میں نہیں دی جاسکتیں۔ اور نہ مختصر وقفوں کے ساتھ ہی ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق کر کے دی جاسکتی ہیں یہ صورت قرآنی حکم کی رو کو پامال کرنے اور اس کے استخفاف و استہزا پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بیک وقت کئی کئی طلاقیں دے دینے سے بھی بری ہے۔“

(ایضاً ص ۳۲۲-۳۲۵)

صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہاء کا فیصلہ محرف حکم کی اتباع میں تھا

”صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہاء کی اکثریت کا فیصلہ دراصل

حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے ماتحت تھا لہذا اگر وہ وجہ موجود نہیں، جو حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کا باعث بنی تھیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ قرآن کریم، سنت رسول اور قیاس، اور مصالح عامہ کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہے، اور جو فیصلہ (قرآن کریم سنت رسول، قیاس اور مصالح عامہ ان سب کے علی الرغم وقتی ضروریات اور ہنگامی مصالح (یعنی قومی عصیت کی حفاظت۔ ناقل) کے ماتحت کسی ایک وقت میں ضرور نا کر لیا گیا تو (اور اس پر بقول خود ان کے اجماع منعقد ہو گیا تھا۔ ناقل) اسے دوامی حیثیت دے دی جائے۔“

(ایضاً ص ۴۲۶)

نتیجہ! نتیجہ!! نتیجہ!!!

”لہذا چونکہ وہ ضرورتیں اور مصلحتیں جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے ان کے بقول قرآن کے اصل حکم کو بدل کر روح حکم کے استخفاف و استہزا اور اس کی پامالی کا ارتکاب کیا گیا تھا (ناقل) اب باقی نہیں رہیں، اس لئے ہمیں اصل حکم کی طرف لوٹنا چاہئے، جو شریعت اسلامی نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔“

(فکر و نظر ج ۲ ش ۷ ص ۱۲۷)

گویا مقالہ نگار امت مسلمہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں فرضی ضرورتوں کے لئے معاذ اللہ حضرت عمرؓ صحابہؓ تابعینؓ اور ائمہ فقہاءؒ کی طرح شریعت اسلامی کے اصل حکم کو بدل کر ان قبیح جرائم کے ارتکاب کی مزید غلطی نہیں کرنی چاہئے اور جو مطلقہ

عورتیں حضرت عمرؓ صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کے فیصلہ کے موافق اپنے شوہروں کے لئے قطعی حرام ہو گئی ہوں انہیں مطلقہ رجعیہ قرار دے کر تین طلاق دینے والے شوہروں کے پاس ٹھہرنے پر قانوناً مجبور کرنا چاہئے اس طرح عائلی شریعت کی روح بھی خوش ہو جائے گی اور زنا کاری کے لئے شرعی جواز بھی پیدا ہو جائے گا اور خاندانی منصوبہ بندی کی بدولت بن باپ کے بچوں کی تعداد میں اگر کچھ کسر رہ جائے گی تو اس شرعی جواز سے پیدا شدہ فرضی باپ کے بچوں سے وہ بھی پوری ہو جائے گی۔

پھر کون نہیں جانتا کہ اسلام قومی عصبيت کے بت توڑنے کے لئے آیا تھا، لیکن مقالہ نگار کے ”فقہ کی داود بختی“ کہ انہوں نے ہیکل صاحب کی افسانہ نگاری سے خلیفہ راشدؓ کے خلاف (معاذ اللہ) قومی عصبيت کی برقراری کے لئے تحریف حکم قرآن کی دستاویز بھی مرتب کر لی اور محرف کے حکم پر صحابہؓ و تابعینؓ کے جمع ہو جانے کو بھی جائز قرار دے لیا۔ (ناقل)

(ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک ۱۳۸۶ھ اپریل ۱۹۶۷ء)

یتیم پوتے کی وراثت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد
جناب عمر احمد عثمانی صاحب اس وقت منکرین حدیث
اور ڈاکٹر فضل الرحمان ایسے ملحدین کے ترجمان اور سرپرست
کا کردار ادا کر رہے ہیں، جناب عثمانی صاحب اپنے افکار
و نظریات کو تحریر کا جامہ پہنا کر خامہ قمر طاس پر لاتے ہیں تو ڈاکٹر
فضل الرحمان صاحب اپنی تنقیدات و تحقیقات کی عمارت اس
پر اٹھاتے ہیں۔

ذیل میں یتیم پوتے کی وراثت کے بارہ میں جناب عمر
احمد عثمانی کی تحریفات مشمولہ فکر و نظر جلد ۳ ش ۳-۵-۶ سے
مندرجہ ذیل اقتباسات بہ لفظ ماخوذ ہیں۔ تنقید، عنوانات، بین
القوسین اور تفصیلی تنقیدات کی شکل میں ہے۔

مولانا مودودی کا فتویٰ

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی
موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وارث نہیں ہوتا، بلکہ

وارث اس کے چچا ہوتے ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے علاوہ کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا ہے، جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنا قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔“

(رسالہ ترجمان بابت ماہ مارچ ۱۹۵۲ء) (فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰۴)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اقتباس (مع اختصار) اس لئے نقل کرنا ناگزیر ہوا کہ فاضل مقالہ نگار نے اسی کو طرح مصرع قرار دیا ہے اسے نقل کئے بغیر ان کے آئندہ اقتباسات کا مفہوم واضح نہ ہو سکتا۔

مولانا مودودی کا یہ کہنا کہ ”جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے علاوہ کسی کا اختلاف نہیں“ یہ مولانا کا تسامح ہے ورنہ شیعہ حضرات کا بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں، چنانچہ ان کی معتبر کتب ”من لا یخضرہ الفقہ“ ”الاستبصار“ اور ”فروع کافی“ وغیرہ میں تصریح ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کی نقل کا ماخذ کیا ہے؟

بات کا بتنگڑ

عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”مولانا موصوف نے اپنے اس جواب میں اس امر کا

اعتراف فرمالیا ہے کہ مولانا موصوف کو اپنی انتہائی کوشش (یہ

”انتہائی کوشش“ کا صریح پیوند مذکورہ عبارت سے کیسے نکل آیا؟۔ ناقل) کے باوجود قرآن و حدیث میں ایسا کوئی صریح حکم نہ ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد قرار دیا جاسکے (نفی) ”صریح حکم“ کے ملنے کی گئی ہے، یا ”وجود حکم کی قطعی نفی“ کا دعویٰ کیا گیا ہے جو حکم قرآن و حدیث میں صراحتاً موجود نہ ہو بلکہ کسی آیت یا حدیث سے صحیح اصول استنباط کے ساتھ مستنبط اور سلف سے خلف تک تمام امت کا بلا کسی اختلاف کے اس کے استنباط کی صحت پر اتفاق ہو آپ اسے کس ”صریح دلیل“ سے رد کر دیں گے۔ ناقل)

اور نہ صرف یہ کہ مولانا موصوف ہی کو ایسا کوئی صریح حکم نہیں مل سکا جسے فقہاء کے متفقہ فیصلہ کی بنیاد کہا جاسکے بلکہ اس پورے بارہ سال کے عرصہ میں پورے ملک میں کسی دوسرے عالم دین نے بھی آج تک نہ کوئی قرآن کریم کی صریح آیت پیش فرمائی ہے (یہ برخود غلط پروپیگنڈا ہے جو فکرو نظر کے فاضل و فقیہ مقالہ نگار کی ذہنی غذا ہے، اس کے لئے کم از کم بینات دسمبر ۱۹۶۲ء اور ماہ جنوری ۱۹۶۳ء میں مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی کے عالمانہ مقالہ کا مطالعہ فرمایا جائے لیکن اس کا کیا علاج کیا جاسکتا ہے کہ الحاد اور زندقہ کے پردے عقل و بصیرت پر چھائے ہوئے ہیں۔

ع چہ کنم چشم بد خونہ کند بکس نگاہے۔ ناقل)

اور نہ کوئی صریح اور صحیح حدیث نبوی، جس کے معنی

یہ ہیں کہ پورے پاکستان میں کسی عالم دین کو آج تک کوئی قرآن و حدیث کا ایسا صریح حکم نہیں مل سکا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بنیاد بنایا جاسکے۔“

(فکر و نظر اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۳۰۶)

سلف سے خلف تک تمام امت پر تحریف کا الزام اور اس کے مبادیات

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے خلافت راشدہ کے آخری وقت (اس سے کسی کو یہ وہم نہ ہونا چاہئے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت راشدہ ۳۵ھ پر ختم ہو گئی اور یہ کہ معاذ اللہ شاہ صاحب کے نزدیک حضرت علیؓ کی خلافت، خلافت راشدہ نہ تھی بلکہ یہاں خلافت راشدہ سے مراد وہ خلافت خاصہ ہے جس میں دور نبوت کی برکات پوری طرح موجود تھیں، تفصیل کے لئے ازالۃ الخفا کا مطالعہ فرمایا جائے۔ ناقل) یعنی شہادت عثمان غنیؓ (۳۵ھ) تک شاہ صاحبؒ کی تحقیق میں مسلمانوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ (یعنی عقائد و نظریات کا اختلاف، ورنہ فروعی مسائل کا اختلاف اس وقت بھی تھا، ملاحظہ ہو حجتہ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۰ باب اسباب اختلاف الصحابۃ والتابعین فی الفروع۔ ناقل) وہ اس

دور کو دور اجماع کہتے تھے، (یعنی جو مسائل اس دور میں بلا کسی اختلاف کے تسلیم کئے گئے وہ مسائل اجماعی مسائل کہلاتیں گے آئندہ کسی کو ان میں اختلاف کرنے کی گنجائش نہ ہو گی۔ ناقل) اس کی تفصیل ازالۃ الخفاء میں مذکور ہے۔ شہادت عثمانؓ کے بعد اختلاف شروع ہوا اب وہی اجماع مستند ہو گا جو مذکورہ دور اول کے تتبع میں منعقد ہو، شاہ صاحبؒ اسی دور کو خیر القرون قرار دیتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل ازالۃ الخفاء میں موجود ہے۔“

(ماہنامہ الفرقان بریلی شاہ ولی اللہ نمبر)

اس کے بعد خود حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ :
 ”اور اسباب تحریف میں اجماع کی پیروی ہے“ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ حاملین دین کا ایک فرقہ (گروہ جماعت) جن کی نسبت عام لوگوں کا یہ گمان ہو کہ ان کی رائے اکثر یا ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ کسی امر پر اتفاق کرے، اور اس اتفاق سے یہ خیال کیا جائے کہ ثبوت حکم کے لئے یہ اتفاق قطعی دلیل ہے، اور یہ اجماع ایسے امر میں ہے جس کی قرآن و حدیث میں کوئی اصل نہیں ملتی۔

(یہ اجماع اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے کیونکہ سب کے سب لوگ ایسے اجماع پر متفق ہیں، جس کی سند قرآن و حدیث میں ہو، یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو، اور لوگوں نے ایسے اجماع کو جائز قرار

نہیں دیا جس کی سند قرآن و حدیث میں کوئی بھی نہ ہو۔)
چنانچہ اس قول الہی میں اسی طرف اشارہ ہے اور جب کفار
سے کہا جاتا ہے کہ ان چیزوں پر ایمان لے آؤ جو خدا تعالیٰ نے
نازل کی ہیں تو وہ بھی جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی باتوں کی
پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔“

(اردو ترجمہ جنتہ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۲۰۸ مطبوعہ نور محمد کراچی)

ان تصریحات کی روشنی میں (لیکن کیا انہی تصریحات کی
روشنی میں مقالہ نگار اپنے اور اپنے ادارہ تحقیقات کے موقف
کا جائزہ لینے کے لئے بھی تیار ہوں گے۔ ناقل) ہمیں اس بات
کا جائزہ لینا ہو گا کہ :

۱ — کیا شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے حضرات صحابہ
کرام نے کبھی کسی مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اپنے اس فیصلے
کا اعلان فرمایا تھا کہ ہم اس امر پر اجماع کرتے ہیں کہ یتیم
پوتا اپنے دادا کی میراث سے حصہ نہیں پاسکے گا۔ اور سارا
ترکہ اس کے چچا کو مل جائے گا اگر حضرات صحابہ کرامؓ نے
ایسا کوئی اعلان شہادت عثمانؓ سے پہلے پہلے فرمایا تھا تو کہاں
اس کی نشاندہی ہونی چاہئے۔

۲ — اگر ایسا اجماع منعقد ہو چکا ہے تو اس کی سند
قرآن کریم کی کون سی آیت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
کون سے ارشاد سے ملتی ہے؟ یا وہ کون سی قرآنی آیت یا

۳۔۔۔۔۔ اگر ایسی کوئی بات نہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے) تو کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جس کی سند قرآن و حدیث سے نہ مل سکے اور نہ ہی وہ قرآن و حدیث سے مستنبط ہو فقہاء کے متفقہ فیصلہ کی بنا پر جائز کہا جا سکتا ہے؟

۴:----- کیا ایسے کسی اجماع یا اتفاق کو جو قرآن و حدیث سے مستند یا مستنبط نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں (کیونکہ یہ بات کسی دوسرے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اسے شاہ صاحبؒ جیسا آدمی ہی کہہ سکتا تھا) اسباب تحریف میں سے ایک سبب شمار نہیں کیا جائے گا۔

”محقق“ مقالہ نگار کے اس طویل اقتباس میں چند امور لائق توجہ ہیں:

○ مقالہ نگار نے امت کے اس اجماعی فیصلہ کو کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تحریف قرار دینے کے لئے بلا فہم و تدبر، شاہ صاحبؒ کی دو عبارتیں پیش کیں، ایک حضرت سندھیؒ کی روایت سے، اور دوسری خود شاہ صاحبؒ کی کتاب حجتہ اللہ البالغہ کے لمدود ترجمہ سے ہم نے یہ دونوں عبارتیں یہاں من و عن نقل کر دی ہیں لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دونوں

عبارتوں سے امت کے سلف سے خلف تک پر تحریف کا قرطاس ابیض کیسے مرتب کر لیا گیا کیونکہ پہلی عبارت کا مفاد صرف اتنا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک خلافت خاصہ کا دور دور اجماع کہلانے کا مستحق ہے اس لئے اس دور میں جو مسائل محل نزاع نہیں بنے، ان کو اجماعی مسائل کہا جائے گا، اور بعد میں کسی کو یہ حق نہیں ہوگا، کہ ان میں مشاغبہ کرے، چنانچہ ازالۃ الخفا میں --- جس کا حوالہ مولانا سندھیؒ نے دیا، اور مقالہ نگار کو اصل کتاب سے نقل کرنے کی جرأت نہ ہوئی ٹھیک یہی بات شاہ صاحبؒ نے فرمائی ہے، فرماتے ہیں :

” شرائع ملت محمدیہ (علی صاحبہا العلوة والسلام) دو قسم است، قسمی آنت کہ پردہ از روئے حقیقت در اں قسم برانداخته شد و تکلیف ناس باں مستحق گشت، اگر کسے بہ شبہ ضعیف متمسک شدہ بخلاف آں قائل شود معذور نہ گردد، و مقلد آں قائل نیز معذور نہ باشد، فی الحقیقت مدار شریعت ہماں احکام است و تسنن و ابتداء بہ قبول ورد آں منوط و عند کم من اللہ فیہ برہان۔ براں صادق و آں ماخوذ است از صریح کتاب یا صریح سنت مشہورہ یا اجماع طبقہ اولی، یا قیاس جلی بر کتاب و سنت، چوں حکمے بایں وجہ ثابت شود مجال خلاف نماند و مخالف آں معذور نباشد۔“

(ازالۃ الخفا طبع جدید ج ۱ ص ۳۰۷)

ترجمہ: ”دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام دو قسم ہیں، ایک قسم وہ ہے کہ ان میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا

گیا ہے۔ (شریعت نے ان کو صاف کھول کر بیان کر دیا) اور لوگوں کا ان احکام کے ساتھ مکلف ہونا ثابت ہو چکا ہے اب اگر کوئی شخص کسی کمزور شبہ کو دستاویز بنا کر ان احکام کی مخالفت کرتا ہے وہ قطعاً معذور نہ ہوگا اور نہ اس کا مقلد معذور ہوگا۔ درحقیقت مدار شریعت یہی احکام ہیں سنی اور بدعتی ہونا ان ہی احکام کے قبول کرنے یا رد کر دینے سے وابستہ ہے، اور عند کم من اللہ فیہ برہان (تمہارے پاس اللہ کی جانب سے اس میں واضح دلیل آچکی ہو) جو صریح کتاب اللہ یا صریح سنت مشہورہ یا طبقہ اولی کے اجماع یا کتاب و سنت پر قیاس جلی سے حاصل شدہ ہوں چنانچہ جب کوئی حکم ان چار میں سے کسی ایک وجہ سے ثابت ہوگا، اس میں مخالفت کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اور ایسے حکم کی مخالفت کرنے والا معذور نہ ہوگا۔“

اس کے بعد ”دوسری قسم اجتہادی مسائل“ کو ذکر کرنے کے بعد اگلے صفحہ پر خلفائے راشدین کی قریشیت ان کے سوابق اسلامیہ اور بشارت جنت کو قسم اول میں شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”حجة اللہ بر مکران آنما قائم است و شبہات رکیکہ
ایشان عند اللہ معذور نہ ساخت ایشاں را و مکر ایشاں مبتدع
است دور از حق برہان اللہ اور از بساط محمدیین صلی اللہ
علیہ متبوعہ مطرود و مقہور گردانیدہ بدعة مکفرة عند البعض و
مفسقة عند الاخرین۔“ (ازالہ الحجاج ص ۳۰۸)

ترجمہ: ”ان امور کے منکرین پر حجت الہی قائم ہے“ اور ان کے وہی تباہی شہادت انہیں عند اللہ معذور نہیں بنا سکتے ان امور کا منکر مبتدع ہے۔ حق سے دور ہے برہان الہی نے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بساط سے مطرود و مقہور کر کے باہر نکال دیا ہے ان کی یہ بدعت بقول بعض موجب کفر ہے اور بعض کے نزدیک بدترین فسق کی موجب ہے۔“

شاہ صاحبؒ کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو احکام طبقہ اولیٰ میں محل نزاع و بحث نہیں رہے، بلکہ انہیں بالاتفاق تسلیم کیا گیا، ان میں اور کسی مخالف رائے کا اظہار اس دور میں نہیں ہوا وہ احکام اسی طرح قطعی ہیں جس طرح صریح کتاب اللہ، اور صریح سنت مشہورہ سے ثابت شدہ احکام قطعی ہیں ایسے احکام کی مخالفت کرنے والا شاہ صاحبؒ کے الفاظ میں بدعتی، حق سے دور، اور ملت اسلامیہ سے مطرود و مقہور کہلائے گا وہ ہزاروں شہادت رکیکہ پیش کرے لیکن نہ وہ عند اللہ ان شہادت کی وجہ سے معذور ہوگا، نہ اس کے یہ شہادت کسی درجہ میں مستحق توجہ قرار دئے جائیں گے۔

اب ہم مقالہ نگار سے ان ہی کی پیش کردہ شہادت کو سامنے رکھ کر سوال کرتے ہیں کہ کیا دور نبوت اور دور خلافت راشدہ (یا مولانا سندھیؒ کے الفاظ میں دور اجماع) میں کسی پوتے کو بیٹے کی موجودگی میں میراث دلائی گئی؟ یا کیا یہ مسئلہ دور اجماع میں کبھی نزاع و اختلاف کا نشانہ بنا؟ کیا ہیکل اور محمد امین مصری جیسے لوگوں نے بھی کوئی ایسا واقعہ نقل کیا؟ اگر نہیں (اور یقیناً نہیں) تو کیا وہ خود اپنے پیش کردہ آئینہ میں اپنی بدعت کفرہ یا مفسدہ حق سے دوری، اور بساط محمدیین سے مطرودیت و مقہوریت کا بھیانک چہرہ دیکھنا پسند کریں گے؟

لگے ہاتھوں یہ بھی فرما دیا جائے کہ آپ کا نام نہاد ”ادارہ تحقیقات“ جو صرف اجماعی مسائل کو نہیں بلکہ صریح کتاب اور صریح سنت مشورہ کے قطعی مسائل کو بھی وقتی اور دائمی قرار دے کر بدل ڈالنا ”کارِ ثواب“ قرار دیتا ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک اس کی بدعت حق سے دور، مطرودیت مقہوریت، خروج از ملت اسلامیہ اور تکفیر عند البعض یا تنفیق اشد الفسق عند آخرین کا مقام بلند کیا ہوگا؟

○ موصوف کا یہ کہنا کہ ”اسباب تحریف میں اجماع کی پیروی ہے۔“ یہ دوسری عبارت ہے جو امت پر تحریف کی فرد جرم عائد کرنے کی غرض سے مقالہ نگار نے حجتہ اللہ کے اردو ترجمہ سے نقل کی ہے، ہم نے اپنے ناظرین کی سہولت کے لئے اسے قوسین کے ذریعہ دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے حصہ میں شاہ صاحب (اسباب تحریف کو شمار کرتے ہوئے) ایسے اجماع کو موجب تحریف قرار دیتے ہیں جس کی دعوت آج کل ادارہ تحقیقات اسلامی کی جانب سے دی جا رہی ہے یعنی کسی ملک کے یا چند ممالک کے کچھ لوگ مل کر اگر کسی مسئلہ پر اتفاق کر لیں، خواہ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی سند نہ ہو تو اس کے بارے میں یہ باور کرایا جائے گا کہ ہمارے دور میں یہی دینی مسئلہ ہے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، کہ یہ شرعی مسئلہ نہیں ہوگا، بلکہ اسے شرعی مسئلہ قرار دینا شریعت محمدیہؐ میں تحریف ہے، اگر ایسے نام نہاد اجماع کو صحیح مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ چند ہی سالوں میں دین اسلام کا حلیہ بگڑ جائے گا، اور شریعت محمدیہؐ بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گی۔

بظاہر شاہ صاحبؒ کا مقصد یعنی اسباب تحریف کا بیان کرنا اتنے فقرہ سے پورا ہو جاتا تھا لیکن ان کی ”ایمانی فراست“ کو فوراً تنبیہ ہوا کہ کہیں ان کی اس

عبارت سے کسی زندیق کو اجماع امت کے خلاف زہر افشانی کا موقع نہ مل جائے، اس لئے وہ معا بطور استدراک فرماتے ہیں :

(واضح رہے کہ) یہ ”اجماع“ اس اجماع کے علاوہ ہے جس پر امت کا اتفاق ہے۔

اب اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب ”اجماع امت کی طرف سے خود بخود بطور وکیل صفائی پیش ہو کر اعلان فرماتے ہیں کہ سلف سے خلف تک کے کسی متفقہ فیصلہ اور اجماعی مسئلہ کو اسباب تحریف قرار دے کر ٹھکرا دینا نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ خود تحریف کا موجب ہے اب اس پر شاہ صاحب کی دلیل سنئے فرماتے ہیں :

”کیونکہ ”سب کے سب لوگ“ ایسے اجماع پر متفق

ہیں جس کی سند قرآن و حدیث میں ہو، یا ان دونوں میں سے کسی نہ کسی سے مستنبط ہو۔“

یعنی شاہ صاحب ”پوری ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں کہ امت محمدیہ کا اجماع صرف ان ہی مسائل پر ہوا ہے اور سب کے سب لوگ صرف اسی اجماعی مسئلہ پر متفق ہوئے ہیں جس کی سند قرآن و حدیث میں صراحتاً یا استنباطاً پائی جاتی ہے اور ایسے کسی مسئلہ پر امت متفق نہیں ہوتی جس کی سند قرآن و حدیث میں موجود نہ ہو۔ نہ ایسے اجماع کو صحیح کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب کے نزدیک امت کے تمام اجماعی مسائل قرآن و حدیث کی صراحت یا استنباط پر مبنی ہیں اور چونکہ استنباط کبھی خفی ہوتا ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ کالج کے چند گریجویٹوں یا کسی مغربی قسم کی یونیورسٹی کے چند پروفیسروں کو بھی سند اجماع کا علم ہو، اور یہ کہ اجماع امت کی مخالفت براہ

راست قرآن و حدیث ہی کی مخالفت ہے اس لئے خرق اجماع حرام ہے بلکہ بعض مواقع میں کفر ہے۔ (ملاحظہ ہو اکفار الملحدین فی ضروریات الدین)۔

اب مقالہ نگار بتلائیں کہ شاہ صاحبؒ کی یہ دونوں عبارتیں انہوں نے کس مرض کے علاج کے لئے نقل کر دیں، کیا وہ شاہ صاحبؒ کی تصریح کے علی الرغم صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کے اجماع کو چیلنج کریں گے؟ کیا ان کی عقل یہ باور کرتی ہے کہ تمام صحابہؓ، تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ دین میں تحریف کے مرتکب رہے اور یا ان کے اس خانہ ساز نظریہ میں کوئی جان ہے کہ چودہ صدیوں کی امت قرآنی حکم (پوتے کی میراث بیٹے کی موجودگی میں) کے بارے میں ٹھوکریں کھاتی رہی اور جب سے قلم مقالہ نگار ایسے اہل تحقیق کے ہاتھ آیا تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں ان کے لئے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اور انہیں یکایک انکشاف ہوا کہ اف! تمام امت تو اس مسئلہ میں غلط کار ہی رہی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

○ مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ ”کیا صحابہ کرامؓ نے حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پہلے کسی مقام پر جمع ہو کر یتیم پوتے کے وارث ہونے کے اجماع کا اعلان کیا تھا؟“ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ: ”اجماع صحابہؓ“ کا مفہوم ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی دور صحابہؓ میں وہ مسئلہ بغیر کسی اختلاف کے رہا ہے، ابھی ابھی آپ کے سامنے آئے گا، کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے وارث نہ ہونے پر صحابہ کرامؓ کا اجماع تھا، البتہ اجماع صحابہؓ کا یہ عجیب و غریب مفہوم جس کا مطالبہ مقالہ نگار فرماتے ہیں، یعنی صحابہؓ کا کسی ایک مقام پر جمع ہو کر بالاتفاق اعلان کرنا یہ بجائے خود غلط، خانہ ساز، اور مضحکہ خیز ہے اس کے لئے بھی شاہ صاحبؒ ہی کی تصریح ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں :

”و معنی اجماع کہ بر زبان علمائے دین شنیدہ باشی آں
نیست کہ ہمہ مجتہدان لا۔ شذ فرد در عصر واحد بر مسئلہ اتفاق کنند
زیرا کہ این صورتے ست غیر واقع بل غیر ممکن عادی۔“

(ازالہ الحجاج ص ۱۰۰)

ترجمہ: ”اجماع کا لفظ تم نے علما کی زبان سے سنا ہوگا اس کے
معنی یہ نہیں کہ تمام مجتہدین سب کے سب کسی زمانہ میں کسی
مسئلہ پر اس طرح اتفاق کر لیں کہ کوئی مجتہد بھی اس سے خارج
نہ رہے کیونکہ یہ صورت نہ صرف یہ کہ واقعہ کے خلاف ہے
بلکہ عادتاً ناممکن بھی ہے۔“

شاہ صاحب ”صحت اجماع کے لئے عصر واحد کے تمام مجتہدین کے اتفاق
کی شرط کو طفلانہ تصور قرار دیتے ہیں لیکن مقالہ نگار اس میں ایک مقام پر جمع
ہو کر متفقہ اعلان کی شرط کا اضافہ فرماتے ہیں۔
○ ازراہ کرم پہلے اجماع صحابہؓ کے مفہوم کی تصحیح کر لیجئے۔ اس کے بعد وہ کہاں
ہے کہ نشاندہی کا سنئے، امام مالکؒ فرماتے ہیں :

الف : ----- وہ امر جس پر ہمارے یہاں سب کا اتفاق ہے، اور جس پر
میں نے ہمارے شہر (مدینہ طیبہ) کے اہل علم کو پایا ہے۔ یہ ہے کہ پوتوں کی
حیثیت وہی ہے جو بیٹوں کی ہے بشرطیکہ ان سے اوپر کے درجہ میں بیٹے موجود نہ
ہوں، پوتوں کا حکم اس صورت میں بیٹوں کا سا ہے۔ اور پوتیوں کا بیٹیوں کا سا۔
وہ بیٹوں کی طرح وارث اور حاجب ہوں گے، البتہ صلیبی بیٹا اور پوتا جمع ہو
جائیں تو اس صورت میں میراث صرف صلیبی بیٹے کو ملے گی اور پوتے پوتی کا

(موطا امام مالکؒ)

میراث میں کوئی حق نہ ہوگا۔“

ب : ----- یہ تو امام دارالہجرت کی شہادت اپنے وطن مالوف (مدینہ طیبہ) کے تمام اہل علم (صحابہ و تابعین) کے اجماع کے متعلق ہوئی، اب اس پر شاہ صاحبؒ نے جو مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے :

قلت علی هذا اتفق اهل العلم۔

(المسوی علی الموطا۔ مطبوعہ مکہ مکرمہ ج ۲ ص ۸۴)

ترجمہ : ”میں کہتا ہوں کہ تمام اہل علم کا اسی پر اتفاق ہے۔“

ج : ----- مقالہ نگار کے مسلم و معتمد علیہ قاضی شوکانیؒ تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں :

ولا خلاف ان ابناء البنین فی المیراث

کا لبنین مع علمہم

(ج ۱ ص ۳۹۶)

ترجمہ : ”اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ پوتوں کا حکم بیٹوں کا سا ہے، بشرطیکہ بیٹے موجود نہ ہوں۔“

د : ----- مقالہ نگار نے امام ابو بکر جصاص رازیؒ کی طویل عبارت تو نقل فرمادی لیکن اس کا آخری فقرہ ہضم کر گئے یعنی :

وهذا قول اهل العلم جميعا من الصحابة

والتابعين۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۱۰۲)

ترجمہ : ”اور (بیٹے کی موجودگی میں پوتے کا وارث نہ ہونا) یہ تمام اہل علم یعنی صحابہؓ و تابعینؓ کا قول ہے۔“

یہ تین چار حوالے ہم نے صرف ان اکابر کے نقل کئے ہیں جن سے مقالہ نگار نے بار بار استشہاد کیا ورنہ ابن حجرؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، علامہ عینیؒ، حافظ ابن حزمؒ، وغیرہ تمام اکابر امت کی معتبر کتب اٹھا کر دیکھئے آپ کو اس مسئلہ میں صحابہؓ، تابعینؒ، اور تمام امت کا اجماع ہی ملے گا، اگر مقالہ نگار اور ان کی جماعت کو ان حضرات میں سے کسی کی نقل پر بھی اعتماد نہیں تو ہم خدا حافظ کے سوا اور کیا عرض کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ مقالہ نگار خدا لگتی کہیں کہ اگر یہی شہادتیں ان کے حق میں ہوتیں تو وہ کسی کو ان لن ترانیوں کی اجازت دیتے؟

اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہونے کے بارہ میں قرآن و سنت سے شہادت مانگنا مضحکہ خیز ہے کیونکہ ہم اس سے پہلے اس مسئلہ میں اجماع صحابہؓ و تابعینؒ کی شہادتیں ایسے اکابر سے جن پر مقالہ نگار کو بھی اعتماد کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔۔۔۔۔ پیش کر چکے ہیں۔ پھر اجماع امت بالخصوص طبقہ اولیٰ کی اہمیت بھی شاہ صاحبؒ کی تصریحات سے عرض کر چکے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ شاہ صاحبؒ کی جس عبارت کو سامنے رکھ کر مقالہ نگار نے امت کے خلاف تحریف کی دستاویز مرتب کی ہے، اس کی وضاحت بھی کر چکے ہیں کہ خود یہی عبارت اجماع امت کی ذمہ داری لیتی ہے ان تمام امور کے پیش نظر سب سے پہلے تو اجماع صحابہؓ کی سند کا مطالبہ ہی نادرست ہے اس لئے کہ اس مطالبہ کی تہ میں یہ بر خود غلط تصور کار فرما ہے کہ صحابہ کرامؓ خدا اور رسول اور کتاب و سنت کے منشا کے خلاف پر جمع ہو سکتے ہیں، اسلام میں اس تصور ہی کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اس نظریہ کا حامل بقول شاہ صاحبؒ :

زندیق است، اور امے باید بقتل رسانید

ترجمہ: ”زندیق ہے“ اسے سزائے موت ہونی چاہئے۔“

اور اگر (شاہ صاحبؒ کے بقول) اس زندیقانہ مطالبہ کو ایک سیکنڈ کے لئے صحیح بھی فرض کر لیا جائے، تو اس کا جواب خود ان کی اپنی عبارت میں موجود ہے، چنانچہ آگے چل کر الاقرب فالاقرب کی بحث میں وہ فرماتے ہیں۔

”دوسرے اصول الاقرب فالاقرب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیت سے مستنبط ہے، للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون“ اب یہ بحث تو اسی جگہ آئے گی، کہ یہ قرآن کریم کی تصریح ہے، یا اس سے مستنبط ہے، اور یہ کہ یہ استنباط صحیح ہے یا نہیں، لیکن اتنی بات تو مقالہ نگار نے بھی تسلیم کر لی ہے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے مستنبط قرار دیا گیا ہے۔ پس سند اجماع وہی آیت ہے۔

○ گزشتہ معروضات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مقالہ نگار کی ”ایسی کوئی بات نہیں“ کی بات محض ”بات بنانا“ ہے مگر :

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

○ قرآن کی سند خود ان کے اقرار سے ثابت کی جا چکی ہے، اور حدیث کی سند کے لئے الاقرب فالاقرب کی بحث کا ذرا سا انتظار فرمائیے۔

○ صحابہؓ، تابعینؒ، اور ائمہ دینؒ کے متفقہ فیصلہ کو تحریف قرار دینا تو ”فاضل و فقیہ مقالہ نگار“ اور ان کے رفقا ہی کو زیب دیتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں تو وہ اہل اجماع کو مفت میں بدنام کرتے ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہو گا ان حضرات کا قصور تو صرف اتنا ہے کہ وہ فیصلہ خداوندی اور فیصلہ نبوت پر کیوں جمع رہے، اگر ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ تو مقالہ نگار آپ ﷺ کے

بارے میں کیا فرمائیں گے اور خود اپنے متعلق ان کا کیا فتویٰ ہو گا؟ مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا تھا ----- بے ادب محروم گشت از لطف حق ----- ہمیں مجتہدین عصر حاضر کی حرمان نصیبی پر رحم آتا ہے جو بیک جنبش قلم نہ صرف اول سے آخر تک پوری امت پر تحریف کا فتویٰ صادر کرتے ہیں بلکہ ذوات رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لپیٹ میں لے آتے ہیں۔ قائلہم اللہ انی یوفکون۔

بے مایہ پاسبان کو دنیا بھر کے پھاڑوں کے ہم وزن ہونے کا خبط

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”واقعہ یہ ہے کہ ہمارا علم و تفقہ اپنی پوری بے مائیگی کے ساتھ اس علم و تفقہ کا پاسبان بھی نہیں ہے، جو ہمارے فقہا کرام کا حصہ تھا لیکن اس کے باوجود ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حضرات بہر حال انسان تھے، فرشتے اور معصوم نہیں تھے، لہذا علمی دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ مسائل کی تحقیق میں ہم ان جذبات سے بلند ہو کر غور و فکر کریں۔“

(ایضاً ص ۳۱۲)

اگر یہ فقرہ مقالہ نگار کا تکلف، بناوٹ اور تصنع محض نہیں تو کیا ان کے بے مایہ علم و تفقہ سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ جس بے مایہ پاسبان کی شیخی اور تعلیٰ میں دنیا بھر کے سربشک پھاڑوں کے ہم پلہ تلنے بلکہ ان سے بھاری ثابت ہونے کی خواہش چٹکیاں لے، یا جو شخص بہ سلامتی ہوش و حواس اسی بے مایہ

پاسنگ کی غلط اندیش متعلیٰ کے فریب میں آکر دنیا بھر کے پہاڑوں سے اسے بھاری ثابت کرنے پر ایک سو ایک دلائل پیش کر دے، ان دونوں کے لئے ادارہ تحقیقات کے لغاتچہ میں کون سا لفظ وضع کیا گیا اور اس کے پیش کردہ دلائل کا مرتبہ عقلی عدالت میں کیا ہوگا؟

چراغِ مردہ کجاؤ آفتاب کجا

○ یہ بظاہر خوشنما عقیدہ اکثر زنادقہ کی طرف بکثرت دہرایا جاتا رہا ہے، لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ اگر سلف سے خلف تک پوری کی پوری امت کا مجموعہ بھی مقالہ نگار کی بارگاہ عالی میں غلطی سے محفوظ ثابت نہیں ہوتا تو ان کے واسطہ سے نقل شدہ قرآن اور اسلام دونوں کیسے محفوظ رہے، اور اگر یہ دونوں بھی اپنے غیر محفوظ ناقلین کی بدولت معصوم نہیں، تو غیر معصوم پر ایمان لانے کا حکم کیوں ہے اور کیسے ہے؟۔

پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں کہ اگر تمام صحابہؓ تابعینؓ، فقہاء اور پوری امت کا مجموعہ بھی معصوم نہیں تو مقالہ نگار اینڈ کمپنی کو فرشتہ معصوم ہونے کا پروانہ کہاں سے اور کب سے مل گیا ہے؟ اور اگر مقالہ نگار اپنے اور اپنی جماعت کے لئے بھی فرشتہ معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے جیسا کہ ان کی ”پوری بے مائیگی“ سے بظاہر یہی واضح ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ پوری امت کی بجائے غلط کار، تحریف کنندہ، جی چاہی کرنے والے اور ”قرآنی فہم سے نا آشنا“ قسم کے معزز القاب، ہم ان ہی پر کیوں چسپاں نہ کر لیں۔ جن کی پوری امت کے خلاف جرح سے دین میں رخنہ اندازی کا دروازہ پھوپٹ کھلتا ہے۔

○ مقالہ نگار ہمیں معاف رکھیں، یہ نری جذباتی بات نہیں بلکہ شرعاً، اخلاقاً اور

قانوناً یہ اصولی بحث ہے، خود سوچئے کہ آج کے جمہوری دور میں پوری امت کے مقابلہ میں آپ کی تحقیقات کون قبول کرے گا۔

امام ابوبکر جصاص ”قابل اعتماد ہیں

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”ہم نے شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازیؒ کے اقتباسات اس لئے پیش کر دیئے ہیں کہ وہ فقہ حنفی کے ایک جلیل القدر امام ہیں۔ ان کے ارشادات ہمارے علماء کرام کے نزدیک بھی مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

(نکرو نظر جلد ۳ ش ۵ ص ۳۷۰)

بلاشبہ امام جصاصؒ کی شخصیت قابل اعتماد ہے، مگر جب وہی صحابہؓ و تابعینؓ کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا، تو کیا وجہ ہے کہ مقالہ نگار فقہ حنفی کے جلیل القدر امام، شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس نقل پر اعتماد کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ لن یصلح العطار ما افسده الدهر۔“

آئندہ مباحث میں مقالہ نگار کی تحقیقات کا ماخذ

”الاقرب فالاقرب کی یہ بحث اور اس کی مثالیں مولانا حافظ محمد سلم صاحب جیراچدہری کے رسالہ ”محبوب الارث“ سے مستفاد ہیں۔“

(نکرو نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۳۰۹)

جب علم فرائض جیسے دقیق مباحث میں مقالہ نگار کے راہنما آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، اور فقہا مجتہدین کی جگہ حافظ محمد اسلم جیراچوری ایسے بزرگ ہوں تو ان کی سرگردانی کی توجیہ کیا مشکل ہے؟ مقالہ نگار کی منقبت میں مدیر فکر و نظر کا درج ذیل خراج تحسین ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے :

”ہمارے فاضل دوست کے طرز تحریر کا امتیازی وصف یہ ہے، کہ وہ مسئلے کے ہر گوشے پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی ذاتی تنقید کو ائمہ سلف کی تنقیدات کا ہمیشہ تابع رکھتے ہیں۔“
(جلد ۲ ص ۵-۶)

اور پھر ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ :
وہ شیفہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

تقسیم میراث کے شرعی اصول

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”ہمارے فقہا کرام نے جب کے لئے دو اصول مقرر کئے ہیں۔ ۱۔ اگر کوئی شخص مورث کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطے سے رشتہ رکھتا ہو، وہ اس وقت تک حصہ نہیں پا سکتا جب تک وہ درمیانی واسطے موجود ہے۔ ۲۔ جب حرمان کا دوسرا اصول الاقرب فالاقرب کا ہے۔ یعنی قریب کا رشتہ دار دور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔“

(فکر، نظر، ۲ ش ۶ ص ۶۰۷)

اصول دوم میں صحابہ، تابعین، فقہاء، مجتہدین
بلکہ معاذ اللہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے بھی مراد خداوندی کو نہیں سمجھا۔

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

دوسرے اصول کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ یہ
قرآن کریم کی اس آیت سے مستنبط ہے للرجال نصيب
مما ترک الوالدان والاقربون الايتہ (مع ترجمہ) اس آیت
کریمہ میں یہ دونوں باتیں خصوصیت کے ساتھ غور طلب ہیں،
کہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں وہ انداز بیان کیوں
اختیار نہیں فرمایا جو ہمارے فقہاء نے اس آیت کریمہ سے نکالا
ہے قریب ترین رشتہ داروں، مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ
میں حصہ ملے گا، جو ان کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار
چھوڑ جائیں، بلکہ اس کے برعکس یہ انداز بیان کیوں اختیار
فرمایا ہے کہ --- ”مردوں اور عورتوں کو اس ترکہ میں سے
حصہ ملے گا، جو ان کے والدین اور قریب ترین رشتہ دار چھوڑ
جائیں“ نیز یہ بات کچھ کم غور طلب نہیں کہ قرآن کریم نے
”الاقربون“ کی موجودگی میں اپنے مفہوم کے لحاظ سے تمام
قریبی رشتہ داروں کو شامل ہے، جس میں ظاہر ہے کہ والدین
بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہیں ”الوالدان“ کی جداگانہ صراحت کو
کیوں ضروری سمجھا؟ صرف ”الاقربون“ کے لفظ پر کیوں اکتفا

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۷-۴۰۸)

اس بحث میں مقالہ نگار کا بیان کل تین دعووں پر مشتمل ہے :

۱ : ----- الاقرب فالاقرب کا اصول قرآن کریم کی محولہ آیت سے مستنبط کہا جاتا ہے۔

۲ : ----- یہ اصول ہمارے فقہانے نکالا ہے۔

۳ : ----- یہ استنباط چونکہ قرآنی انداز بیان کے برعکس ہے اس لئے صحیح نہیں۔ آئیے ان تین دعووں پر غور کریں۔

اول۔۔۔۔۔ قرآن کریم کے الفاظ آپ کے سامنے ہیں، تقسیم میراث کا جو اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ٹھیک ان ہی الفاظ کو ”الاقرب فالاقرب“ کے اصول میں لے لیا گیا ہے، صرف اتنا فرق ضرور نظر آتا ہے کہ قرآن نے الاقربون کے ایک ہی لفظ (بصیغہ جمع) میں تمام اقارب کو درجہ بدرجہ لے لیا ہے۔ اور الاقرب فالاقرب کے اصول میں اس تدریج و ترتیب کی وضاحت کے لئے دو مفرد لفظوں کے درمیان فاء تعقیب لائی گئی ہے۔ اب اس اصول کو قرآنی لفظ کی شرح و تفسیر کہنا تو بجا ہو گا لیکن اسے استنباط قرار دینا (جب کہ اس اصول میں قرآن کی اصل تعبیر کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔) مقالہ نگار ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اہل علم و دانش سے اس کی توقع نہیں کی جانی چاہئے۔

دوم۔۔۔۔۔ یہ دعویٰ جسے بار بار مقالہ نگار نے دہرا کر غلط تاثر دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ فقہائے کرام کا نکالا ہوا اصول ہے، قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے، یہ فقہا کا نکالا ہوا اصول نہیں، بلکہ خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ

و سلم کی بیان فرمودہ شرح و تفسیر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، مسند دارمی، مسند احمد بن حنبل، مسند امام ابوحنیفہ، اور سنن دارقطنی میں مختلف، متعدد اور متواتر المعنی، اسانید کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے۔

”الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فلاولى رجل

ذكر“۔

(قرآن و سنت کے مقرر کردہ حصے ان کے مستحقین کو دے دو، پھر جو مال باقی رہ جائے وہ قریب تر رشتہ دار مرد کا حق ہے)

اس حدیث پاک میں ”اولیٰ“ معنی اقرب ہے، چنانچہ شاہ صاحبؒ اس حدیث پاک پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

(اقول) قد علمت ان الاصل فى التوارث

معنيان وقد ذكرناهما وان المودة والرفق لا يقبرا لافى القرابة القريبة جدا، كالام والاخوة، دون ما سوا ذلك، فاذا جاوزهم الامر تعين التوارث بمعنى القيام مقام الميت، والنصرة له وذلك قوم الميت واهل نسبه وشرفه الا قرب فالاقرب

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲۰ ص ۱۲۱)

ترجمہ: ”میں کہتا ہوں کہ یہ بات تم کو معلوم ہو چکی ہے کہ توارث کے اندر اصل دو چیزیں ہیں، جن کو ہم بیان کر چکے ہیں

اور یہ کہ محبت و شفقت کا صرف اس قرابت میں لحاظ کیا جاتا ہے، جو بہت ہی قریب ہو جیسے ماں اور بھائی، ان کے ماسوا میں نہیں۔

پس جب یہ موجود نہ ہوں (یا ان کے حصص ادا کرنے کے بعد بھی مال باقی رہ جائے) تو اب تو ریث، میت کے قائم مقام ہونے، اور اس کی معاونت کرنے کے اعتبار سے معین ہو گی، اور وہ میت کی قوم اور اس کے اہل نسب و شرافت ہیں، جن میں ”الاقرب فالاقرب“ کا لحاظ ہوگا۔“

قرآن کریم کے لفظ ”الاقربون“ کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو امور کی وضاحت فرمائی :

۱۔ تقویم ذوی الفروض۔ ۲۔ اور عصبات میں الاقرب فالاقرب کے اصول کی رعایت، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صرف زبانی تشریح پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ عملاً اسے جاری بھی فرمایا، اور حسن اتفاق یہ کہ اس کے اجرا کے لئے صورت بھی وہی اختیار فرمائی جس میں آج کل شغب کیا جا رہا ہے، چنانچہ مسلم شریف کے علاوہ تمام صحاح ستہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ موجود ہے، کہ بیٹی کے لئے نصف ترکہ ہے پوتی کے لئے چھٹا حصہ، اور باقی ماندہ حقیقی بہن کا ہے۔ (میت کے یہی تین وارث تھے) شاہ صاحبؒ اس فیصلہ نبوت کی توجیہ اس طرح فرماتے ہیں :

(اقول) وذاک لان الابد لا یزاحم

الاقرب فیما یحوزہ فما بقی فان الابد احق

به حتی یستوفی ما جعل اللہ لذاک الصنف

فالابنة تاخذ النصف كاملا وابنة الابن في
حكم البنات فلم تزاحم البنت الحقيقة
واستوفت ما بقى من نصيب البنات، ثم كانت
الانت عصبه لان فيها معنى من القيام مقام
البنت وهى من اهل شرفه
(حجة الله البالغة ج ۲ ص ۱۲۲)

ترجمہ: ”میں کہتا ہوں کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ الابد
(دور کا رشتہ) اقرب (نزدیک کے رشتہ دار) سے اس کے حصہ
میں مزاحم نہیں ہو سکتا، البتہ جو مال باقی رہ جائے، ابد اس کا
حقدار ہے تا آنکہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس صنف کے لئے مقرر
فرمایا اسے حاصل کر لے، پس بیٹی (چونکہ پوتی کی بہ نسبت
اقرب ہے اس لئے وہ) پورا نصف لے گی، اور پوتی بیٹیوں
کے حکم میں داخل تو ہے (مگر چونکہ ابد ہے) اس لئے وہ حقیقی
بیٹی سے مزاحمت نہیں کر سکتی اور بیٹیوں کا باقی ماندہ حصہ
(۱/۶) حاصل کرے گی، پھر بہن عصبہ ہے، کیونکہ اس میں بیٹی
کے قائم مقام ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں، اور وہ میت کے
اہل شرف میں سے بھی ہے۔“

پھر قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ اصول
”الاقرب فالاقرب“ کی روشنی میں صحابہ کرامؓ نے بیٹی کی موجودگی میں پوتے
کے وارث نہ ہونے کا کھل کر ”اجماعی فتویٰ“ دیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن
مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور سلیمان بن ربیعہؓ

کی مہر تصدیق کے ساتھ تو اسی مذکورہ بالا حدیث میں مذکور ہے، اور حضرت زید بن ثابتؓ کا فتویٰ صحیح بخاری میں موجود ہے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ بات تو تقریباً ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو علم فرائض کی سند عطا کرتے ہوئے فرمایا تھا افرضکم زید (تم سب میں علم فرائض کے سب سے بڑے عالم زید ہیں) مگر یہ بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگی، کہ علم میراث کی مشکلات حل کرانے کے لئے خلیفہ راشد امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود بنفس نفیس زید بن ثابت کے در دولت پر حاضری دیا کرتے تھے، اور ان کے فتویٰ کو سند اور حجت مانتے تھے، (ملاحظہ ہو کنز العمال میراث الجدد) ان حقائق کے پیش نظر فکر و نظر کے فقیہ مقالہ نگار سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ ”الاقرب فالاقرب“ کا اصول بیچارے فقہا کرام کا نکالا ہوا ہے۔ یا صاحب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے؟ اور بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو وارث قرار نہ دینے کی وجہ سے، کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، عبد اللہ بن مسعود، زید بن ثابت، حضرت عمر، ابو موسیٰ اشعری، سلیمان بن ربیعہ اور ان کے فتاویٰ کو قبول کرنے والے تمام صحابہؓ اور خود شاہ صاحبؒ پر بھی تحریف کی زبان طعن دراز کرنے کی جرات فرمائیں گے۔؟ مقالہ نگار کا تیسرا دعویٰ یہ تھا کہ ”الاقرب فالاقرب“ کا اصول چونکہ قرآنی تعبیر ”الاقربون“ کے برعکس ہے، اس لئے یہ صحیح نہیں، اس کا کافی جواب تو یہ ہے، کہ یہ اصول خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ ہے، فقہائے کرام، تشریح نبویؐ سے ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے، اس لئے مقالہ نگار کی تمام تر جرح و تنقید کا اصل نشانہ فقہا کرام کے مقتدا۔۔۔۔ اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرار پاتے ہیں۔ (معاذ اللہ

منہ) اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مقالہ نگار اتنا بھی نہیں جانتے تو ان دقیق مباحث پر خامہ فرسائی کی کیوں زحمت اٹھائی کہ قرب وبعد نسب متکررہ ہیں، جب آپ زید کو عمر کا اقرب قرار دیں گے، تو لامحالہ عمر زید کا اقرب قرار پائے گا، پس اگر بیٹا، پوتے کی نسبت اقرب الی المیت ہے، تو میت بھی پوتے کی نسبت بیٹے کی اقرب ہوگی، یہ عجیب غریب فلسفہ کسی نے کب سنا ہوگا، کہ بیٹا تو بلاشبہ اقرب ہے، لیکن مرنے والا اپنے بیٹے کا اقرب نہیں، بلکہ اس کا قرب بیٹے اور پوتے کے ساتھ یکساں ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ، مورث کو اقرب کہا جائے، یا وارث کو دونوں کا مال صرف ایک ہے، البتہ جہاں علت توریت کو ذکر کیا جائے گا وہاں مورث کی اقربیت ذکر کی جائے گی اور جہاں علت توراث کا ذکر چھڑے گا وہاں اقربیت وارث کا ذکر ہوگا۔

ان تمام حضرات کی ”جی چاہی“ بات

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”مسائل میراث کے عمیق مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمارے فقہا کرام نے یہ قانون تو مستنبط فرما لیا ہے، لیکن اس کے نفاذ میں انہوں نے کسی باقاعدگی کو مد نظر نہیں رکھا، بلکہ جہاں ان کا جی چاہا اس قانون کا نفاذ فرما لیا اور جہاں ان کا جی چاہا اسے نظر انداز کر دیا۔“

(فکر و نظر جلد ۳ ش ۶ ص ۴۰۸)

مسائل میراث کا عمیق مطالعہ تو جیراجپوری صاحب کے محبوب الارث سے استفادہ ہی سے ظاہر ہے، رہا فقہائے کرام کے بارے میں ”جی چاہا“ کا

افسانہ اس کی حقیقت سابقہ معروضات سے کھل گئی ہوگی، مقالہ نگار کے وارد کردہ نقوض کا حل بھی ان ہی گذارشات سے بادی تامل معلوم کیا جاسکے گا ورنہ نادان کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

الاقرب فالاقرب کا ماڈرن مفہوم

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”اگر اس قانون کو صحیح ماننا ہے تو ہمیں اس کا ایسا مطلب لینا ہوگا جس سے یہ قانون ہر جگہ فٹ بیٹھ جائے، اس لئے لازماً اس قانون کا یہی اور صرف یہی مطلب لینا ہوگا کہ اقرب وہ رشتہ دار ہے جو بلا واسطہ میت سے رشتہ رکھتا ہو یا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہو، لیکن مورث کی وفات کے وقت وہ واسطہ باقی نہ رہا ہو۔“

(ص ۴۱۵)

○ مقالہ نگار قرآن و سنت اور اجماع صحابہ کے مقرر کردہ اصول کو صحیح مانتے ہیں یا نہ مانتے یہ ان کا اپنا ایمانی معاملہ ہے البتہ فٹ آتی پھانسی دینا عقلاً جانتے ہیں کہ کہاں ہوتا ہے۔

○ مقالہ نگار صاحب جیراچپوری صاحب کی تقلید میں کتاب و سنت، صحابہ و تابعین، اور فقہاء مجتہدین کے اعتماد کو تو جواب دے ہی چکے تھے، لیکن ”الاقرب فالاقرب“ کا ماڈرن مفہوم بیان کرنے بیٹھے تو ہدایت عقلیہ کو بھی خیرباد اور خدا حافظ کہہ گئے، یعنی یہ اقرار ہے کہ بیٹا بلا واسطہ رشتہ دار ہے اور پوتا بالواسطہ رشتہ رکھتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اصرار ہے کہ عقل و خرد

کے علی الرغم ان دونوں کو ایک ہی درجہ میں ”اقرّب“ قرار دیا جائے، عجب نہیں کہ ان کی اس تحقیق پر یتیم پوتوں کو بھی ہنسی آجائے۔

نتیجہ، نتیجہ، نتیجہ

جناب عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں :

”لہذا ہم نہایت دیانتداری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ یتیم پوتوں کی اپنے دادا کی وراثت سے محرومی کسی صحیح بنیاد پر مبنی نہیں ہے، لہذا ہمیں اپنی فقہ کی اس فروگزاشت کو تسلیم کر کے ان مظلوموں کے ساتھ انصاف برتنے میں کسی قسم کی علمی عصبيت کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہئے۔ اور ہمیں کھلے دل کے ساتھ تسلیم کر لینا چاہئے کہ یتیم پوتے اپنے دادا کی میراث سے حصہ پانے کے ہر اعتبار سے مستحق ہیں۔ الخ۔“

(ص ۲۱۷ آخری فقرہ)

مقالہ نگار کی ”نہایت دیانتداری“ سر آنکھوں پر، لیکن معاف کیجئے ہم اس سے پہلے ”نہایت دیانتداری“ کے ساتھ قسمیں کھانے والے کے فریب کو آزما چکے ہیں۔ (وقاسمهم مانی لکمالمن الناصحین) اس لئے ہم خدا اور رسول کے احکام کے مقابلہ میں نہ تو کسی کی ”نہایت دیانتداری“ پر اعتماد کرنے کی ہمت رکھتے ہیں، نہ کسی کی عقل و خرد پر۔

فقہ اور فقہاء کی فروگزاشت نہیں بلکہ جرأت سے کام لیجئے اور اسلام اور صاحب اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرضی فروگزاشیں لوگوں کو تسلیم کرائیے کیونکہ فقہا کرام تو محض صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ سروچشم کی

تعمیل کر رہے ہیں، ان بے چاروں پر برسنا تو ایسا ہی ہوگا کہ زید کی عداوت میں اس کے نشان قدم کو پیٹنا شروع کر دیا جائے۔

لیکن کیا رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین نے ان فرضی مظلوموں کو محروم کر کے انصاف نہیں کیا؟

فقہا پر ”علمی عصبیت“ کا الزام مقالہ نگار کو مبارک ہو، یہ علمی عصبیت نہیں بلکہ ”ایمانی تقاضا“ ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

(ماہنامہ الحق محرم ۱۳۸۷ھ)

ڈاکٹر گورایہ کے اجتادات

ڈاکٹر گورایہ اور تعبیر شریعت کا اختیار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد،

”علامہ اقبال اور جدید اسلامی ریاست میں تعبیر شریعت کا اختیار“ کے عنوان سے ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ایم اے۔ پی ایچ ڈی کا ایک مضمون روزنامہ جنگ لاہور ۱۱-۱۲-۱۸ فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعتوں میں ادارتی صفحات میں شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے علامہ اقبال کی کتاب ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے حوالے سے (جو انگریزی کے علامہ کے خطبات مدراس کا مجموعہ ہے) علامہ کے چند اجتہادی افکار کی اپنے ذوق کے مطابق تشریح کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب محکمہ اوقاف پنجاب کے ایک ذمہ دار سرکاری افسر ہیں، اس حیثیت سے انہیں بڑی حد تک سرکاری فکر کا ترجمان بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ پیش نظر مضمون میں، جو خالص پرویزی رنگ میں لکھا گیا ہے، انہوں نے دور ایوبی کے ڈاکٹر فضل الرحمن کی یاد تازہ کر دی ہے، جس سے صاف جھلکتا ہے کہ وہ موجودہ حکومت کی بھی اسی طرح رہنمائی کرنا چاہتے ہیں جس طرف ڈاکٹر فضل الرحمن نے فیلڈ مارشل ایوب خان کی رہنمائی کی تھی، اور وہ اس حکومت کو بھی اسی انجام سے دوچار کرنا چاہتے ہیں جو فیلڈ مارشل صاحب کا ہوا تھا۔

جناب گورایہ صاحب کے خیالات کا جائزہ لینے سے پہلے اجتہاد کے موضوع پر

چند امور کا عرض کر دینا مناسب ہوگا :

۱۔۔۔۔۔ جو شخص دین اسلام پر عقیدہ رکھتا ہو، اور آنحضرت ﷺ کے امتی ہونے کا دعویٰ رکھتا ہو اس کو شرعی احکام کے قبول کئے بغیر چارہ نہیں، قرآن کریم میں بار بار ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول“ کی تاکید کی گئی ہے، اور اطاعت کے معنی قبول احکام کے سوا کچھ نہیں۔

شرعی احکام کی چند قسمیں ہیں :

اول —۔۔۔۔۔ وہ احکام جو قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں صراحةً مذکور ہیں۔ یہ احکام خواہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، اور دینی امور سے متعلق ہوں یا دنیوی امور سے، ان کا قبول کرنا لازم ہے اور ان سے انحراف کی کسی امتی کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے :

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله
ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم
ومن يعص الله ورسوله فقد ضل لا مبينا۔

(سورہ احزاب-۳۶)

ترجمہ: ”اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا“ اور نہ ایماندار عورت کا“ جب کہ مقرر کروے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام، کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا“ اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔“ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

یہ آیت کریمہ ایک خاص دنیوی امر کے بارے میں نازل ہوئی، آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کے نکاح کے لئے اپنی پھوپھی کی لڑکی

زمین بنت محش کا انتخاب فرما کر پیغام نکاح دیا۔ حضرت زید پر چونکہ یہ عرفی عیب لگا ہوا تھا کہ آزادہ کردہ غلام تھے، حضرت زینب اور ان کے بھائی عبد اللہ بن محش نے اس رشتہ سے انکار کر دیا کہ ہم باعتبار خاندان و نسب کے ان سے اشرف ہیں، اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کو حضرت زینب اور ان کے بھائی نے سنا تو سمع و طاعت بجالائے۔ اور نکاح پر راضی ہو گئے۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اگر کسی دنیوی معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے کوئی فیصلہ صادر ہو جائے اس کو دل و جان سے قبول کرنا شرط ایمان ہے۔ اور اس سے انحراف صریح گمراہی ہے۔
آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

امرت ان اقاتل الناس حتی يشهدوا ان
لا اله الا الله ويؤمنوا بى وبما جئت به

(صحیح مسلم۔ ص ۳۷ ج ۱)

ترجمہ: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ ”لا اله الا الله“ کی گواہی دیں، اور مجھ پر اور ان تمام امور پر جو میں لے کر آیا ہوں، ایمان لائیں۔“

دوم — حضرات خلفائے راشدینؓ کے وہ فیصلے جن سے صحابہ کرامؓ نے اتفاق فرمایا، اور جو صحابہ کرامؓ کے دور سے پوری امت کے نزدیک مسلم اور متفق علیہ چلے آتے ہیں۔ یہ امور بھی قرآن و سنت کے ساتھ ملحق ہیں اور ہمارے لئے قطعی و یقینی ہیں، ان کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں لازم ہے، اور ان سے انحراف کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے طریقہ کو ”سبیل المؤمنین“ فرمایا ہے، اور اس کے چھوڑنے والوں کو جہنم رسید کرنے

کا اعلان فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له
الهدى ويتبع غير سبيل المومنين نوله ما تولى
ونصله جهنم وساءت مصيرا -

(النساء - ۱۱۵)

ترجمہ: ”اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس
پر سیدھی راہ، اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف، تو ہم
حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے
ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا۔“

(ترجمہ حضرت شیخ المنذّر)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات خلفائے راشدینؓ کے طریقہ و سنت کو
مضبوط پکڑنے کی تاکید بلوغ فرمائی ہے :

فانه من يعش منكم بعدى فيرى اختلافا
كثيرا فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين
المهدين، تمسكوا بها وعضوا عليها
بالنواجذ، واياكم ومحدثات الامور، فان كل
محدثه بدعة وكل بدعة ضلالة

(مشکوٰۃ - ص ۳۰)

ترجمہ: ”کیونکہ جو شخص تم میں سے میرے بعد جیتا رہا وہ بہت سے
اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ خلفائے
راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا، اس کو مضبوطی سے تھام لینا اور

کچیلوں سے اس کو پکڑ لینا اور خبردار! نئے نئے امور سے بچتے رہنا

کیونکہ ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت کمرائی ہے۔

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت، سنت نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا تتمہ ہے، اور وہ بھی قرآن و سنت ہی کی طرح امت کے لئے واجب العمل ہے۔ ان کے طریقہ کے خلاف جو طریقہ ایجاد کیا جائے وہ بدعت و کمرائی ہے۔

سوم — جن مسائل کا حکم صراحتاً قرآن و حدیث میں مذکور نہیں، اور نہ ان کے بارے میں حضرات خلفائے راشدینؓ کا کوئی فیصلہ ہی سامنے آیا، قرآن و سنت کے نصوص میں غور کر کے ان کا حکم دریافت کرنا ”اجتہاد و استنباط“ کہلاتا ہے۔ اسی طرح جن مسائل میں بظاہر دلائل کا تعارض ہو، وہاں بھی کسی جانب کو اختیار کرنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔ احکام کی پہلی دو قسمیں محل اجتہاد نہیں، صرف آخری قسم محل اجتہاد ہے۔

۲ — مندرجہ بالا بحث سے دو باتیں معلوم ہو گئیں :

اول — اجتہاد کی تعریف : یعنی جن مسائل کا حکم کتاب و سنت میں منصوص نہیں، نہ اجماع سے ثابت ہے ان کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے مجتہد کا اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔

دوم — یہ کہ محل اجتہاد صرف وہ مسائل ہیں جن کا حکم کتاب و سنت میں منصوص نہیں، نہ اجماع امت سے ثابت ہے، کیونکہ منصوص اور اجماعی احکام اجتہاد سے بالاتر ہیں۔

۳ — جو شخص اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو اس پر غیر منصوص مسائل کا حکم

شرعی معلوم کرنے کے لئے اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے اور جو شخص اس کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ کسی مجتہد سے رجوع کرے۔

۴ — اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اجتہاد کی صلاحیت کون رکھتا ہے، اور کون نہیں؟ اور یہ کہ کسی شخص کے مجتہد ہونے کے لئے کیا شرائط درکار ہیں؟ اصول فقہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، جس کا خلاصہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ”ازالہ الخفا“ میں تحریر فرمایا ہے، اختصار کے پیش نظر میں اسی خلاصہ کو یہاں نقل کر دیتا ہوں، وہ تحریر فرماتے ہیں :

”واصل معنی اجتہاد آنست کہ جملہ عظیمہ از احکام فقہ دانستہ باشد بادلہ تفصیلیہ از کتاب و سنت و اجماع و قیاس۔ و ہر حکمے را منوط بدلیل او شناختہ باشد۔ و ظن قوی بہماں دلیل حاصل کردہ۔ پس دریں زمانہ مجتہد نمے تواند شد مگر کسے کہ جمع کردہ باشد پنج علم را :

۱۔ علم کتاب۔ قراءۃ و تفسیر۔

۲۔ و علم سنت باسانید آں و معرفت صحیح و ضعیف درآں۔

۳۔ و علم اقوال سلف در مسائل۔ تا از اجماع تجاوز نہ نماید۔

و نزدیک اختلاف علی قولین قول ثالث اختیار نہ کند۔

۴۔ و علم عربیت از لغت و نحو و غیر آں۔

۵۔ و علم طرق استنباط و وجوہ تطبیق بین المختلفین۔

بعد ازاں اعمال فکر کند در مسائل جزئیہ۔ و ہر حکمے را

منوط بدلیل او شناسد و لازم نیست کہ مجتہد مستقل باشد مثل ابی

حنیفہ و شافعی بلکہ مجتہد منتسب کہ تحقیق سلف را شناختہ
واستدلالات ایشان فہمیدہ ظن قوی در ہر مسئلہ بہم رساند کافی
است۔“

(ازالہ الخفا فارسی ص ۴)

ترجمہ : ”اور اصل معنی اجتہاد کے یہ ہیں کہ احکام فقہ کے ایک بہت
بڑے مجموعہ کا، ان کے تفصیلی دلائل یعنی کتب و سنت اور اجماع
و قیاس کے ساتھ علم رکھتا ہو۔ اور ہر حکم کے اس کی دلیل کے
ساتھ مربوط ہونے کو پہچانتا ہو۔ اور ہر مسئلہ کا ظن قوی اس کی خاص
دلیل کے ساتھ حاصل کئے ہوئے ہو، پس اس زمانے میں مجتہد نہیں
ہو سکتا مگر وہی شخص جو پانچ علوم کا جامع ہو :

۱۔ کتاب کا علم، قرأت و تفسیر کے اعتبار سے۔

۲۔ سنت کا علم، اس کی اسانید کے ساتھ اور اس میں صحیح و ضعیف
کی معرفت بھی رکھتا ہو۔

۳۔ تمام مسائل میں علمائے سلف کے اقوال کا علم رکھتا ہو تاکہ
اجماع امت سے نہ نکل جائے۔ اور جس مسئلہ میں دو قول ہوں
وہاں تیسرا قول اختیار نہ کرے۔

۴۔ عربیت سے متعلقہ علوم پر حاوی ہو۔ مثلاً لغت، صرف و نحو،
اشفاق وغیرہ۔

۵۔ استنباط کے طریقوں کا علم رکھتا ہو، اور دو مختلف دلیلوں کے
درمیان کس طرح تطبیق دی جاتی ہے ان وجوہ تطبیق سے واقف

ہو۔

ان علوم کے بعد اس کی بھی صلاحیت رکھتا ہو کہ اپنی فکر و بصیرت کو مسائل جزئیہ میں استعمال کرے اور ہر حکم کا جس دلیل پر مدار ہے اسے پہچانے۔

اور لازم نہیں ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کی طرح مجتہد مطلق ہو بلکہ مجتہد منتسب بھی کافی ہے جس نے سلف کی تحقیق کو پہچان رکھا ہو، اور ان کے استدلالات کو سمجھ رکھا ہو، اور ہر مسئلہ میں دلیل کے ساتھ ظن قوی حاصل کر رکھا ہو۔“

ان علوم پنج گانہ میں سے ہر علم ایک ایسا وسیع الاطراف دریائے محیط ہے کہ عمریں کھپ جائیں مگر اس کا آخری کنارہ ہاتھ نہ آئے۔

مثلاً قرآن کریم ہی کو لیجئے۔ حافظ سیوطیؒ نے ”الاتقان فی علوم القرآن“ میں اس سلسلہ میں اسی علوم کی فہرست اور ہر علم سے متعلق مختصر سی بحث ذکر کی ہے، جن کا جاننا ایک عالم قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔ اسی پر حدیث، علم فقہ، علم اصول اور دیگر علوم دینیہ کو قیاس کر لیا جائے، کہ ان میں سے ہر علم میں مہارت کے لئے کتنی صلاحیت درکار ہے؟۔ حضرت شاہ صاحبؒ علوم قرآن کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”و تحقیق آنست کہ احیائے تفسیر قرآن نیز بغیر ایں علوم پہمگلانہ میسر نیست، لیکن معتبر آنجا احادیث اسباب نزول، و مناسب اوست۔ و آثار سلف در باب تفسیر۔ و حفظ و قوت فہم سیاق و سباق۔ و توجیہ و مانند آں۔ و بر علم تفسیر قیاس باید کرد جمیع فنون دینیہ را، واللہ اعلم۔“

(ازالۃ الخفاص ۵)

ترجمہ: ”اور تحقیق یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا احیا بھی ان علوم پنج گانہ کے بغیر میسر نہیں، لیکن وہاں معتبر ہے اسباب نزول کی احادیث اور اس کے مناسبات کا علم ہونا، تفسیر کے باب میں آثار سلف کا معلوم ہونا، حافظہ، سیاق و سباق کے فہم کی قوت، اور اس کی توجیہ وغیرہ۔ اور علم تفسیر پر باقی فنون دینیہ کو قیاس کر لیا جائے۔“

الغرض مجتہد کے لئے لازم ہے کہ ان علوم پنجگنانہ میں مہارت و امامت کا درجہ اسے نصیب ہو۔ اسی کے ساتھ حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے دو فائدے اور معلوم ہوئے :

اول — یہ کہ صرف ان میں مہارت و حذاقت اجتہاد کے لئے کافی نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ اسے ملکہ اجتہاد کا حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ اور ملکہ اجتہاد ان علوم میں مہارت سے ماورا چیز ہے۔ جس طرح علم عروض میں مہارت، اور اوزان شعرہ کے ضبط کر لینے اور دواوین شعر کے حفظ کر لینے سے کوئی شاعر نہیں بن جاتا۔ بلکہ شعر گوئی ایک ملکہ ہے جو کسی شخص کی فطرت میں ودیعت رکھا جاتا ہے۔ اور علم عروض کی مہارت اور دواوین شعر کا حفظ اس کے لئے معین اور آلہ کی حیثیت رکھتا ہے ٹھیک اسی طرح یہ علوم پنج گانہ شرط اجتہاد ضرور ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص ان میں مہارت رکھتا ہو وہ مجتہد بھی ہو جائے۔ بلکہ اجتہاد ایک فطری صلاحیت اور ملکہ ہے جو کسی شخص کی فطرت میں ودیعت رکھا جاتا ہے۔ تاکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بقول اس کے ذریعہ :

”اعمال فکر کند در مسائل جزئیہ و ہر حکمے را منوط بدلیل او

شناسد۔“

”ترجمہ : اپنی فکر و بصیرت کو مسائل جزئیہ کے استخراج

میں استعمال کرے اور ہر حکم کا جس دلیل خاص پر مدار ہے اسے پہچانے۔“

اور یہ ملکہ اسی شخص کو نصیب ہوتا ہے جو علوم پنج گانہ کے ساتھ ساتھ طہارت و تقویٰ کے درجہ علیا پر فائز ہو، اور فہم و ذکا اور نور بصیرت سے آراستہ و پیراستہ ہو۔

دوسرا — فائدہ حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام سے یہ معلوم ہوا کہ یہ شرائط جو ذکر کی گئی ہیں مجتہد مطلق کی نہیں بلکہ مجتہد منتسب کے لئے بھی یہ شرائط لازم ہیں، اجتہاد مطلق کا مرتبہ و مقام اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعجاز علیؒ نے حاشیہ کنز الدقائق کے مقدمہ میں ان شرائط کا ذکر کرنے کے بعد صحیح لکھا ہے :

”وهذه الشروط هي آية المجتهد فمن ادعاه وهو خال عنها فمثله كمثل من يدعى ان في قوته صعود السماء بلا معراج۔“

ترجمہ: ”اور یہی شروط کسی شخصیت کے مجتہد ہونے کی علامت ہیں، پس جو شخص ان شرائط کے بغیر اجتہاد کا دعویٰ کرے اس کی مثال اس شخص کی ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ سیڑھی کے بغیر آسمان پر چڑھنے کی طاقت رکھتا ہے۔“

اوپر مجتہد کے ملکہ اجتہاد کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں :

”ولا بد بعد ذلك ان يحصل عنده ملكة

بسبب ممارسۃ هذه العلوم والتامل فى الادلة
 يتمكن بها من استنباط الاحكام من ادلتها
 ولا بد بعد هذه الملكة من تاسيسه قواعد يخرج
 عليها استنباطاته وتفريعاته كقواعد الشافعى
 وباقى الائمة وهذه القواعد هى التى اعجزت
 الناس عن بلوغ حقيقة مرتبة الاجتهاد؛ اذ لا
 يكفى فى الاجتهاد معرفة ما تقدم بدون حصول
 الملكة المذكورة وتاسيس القواعد المذكورة
 فمن جهل شيئاً مما تقدم او علم جميعه ولم
 تحصل له هذه الملكة المتقدمة او حصلت ولم
 يوسس بها قواعد وادعى الاجتهاد لقد اخطا
 وعليه البيان والا ثبات۔

ترجمہ: ”اور ان شرائط کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ان علوم میں
 مذاقت و مہارت اور دلائل شرعیہ میں غور و فکر کی وجہ سے اسے
 ایسا ملکہ حاصل ہو جائے جس کی بدولت اسے دلائل شرعیہ سے
 استخراج کرنے پر قدرت حاصل ہو۔ اور تنہا اس ملکہ کا حصول بھی
 کافی نہیں۔ بلکہ لازم ہے کہ اس ملکہ کے بعد وہ ان قواعد کی تاسیس
 کرے، جن پر اس کے استنباط و تفریعات کی بنیاد ہو۔ جیسا کہ امام
 شافعیؒ کے اور باقی ائمہ کے قواعد ہیں۔

اور یہی وہ قواعد ہیں جنہوں نے لوگوں کو مرتبہ اجتہاد کی
 حقیقت تک پہنچنے سے عاجز کر دیا ہے، کیونکہ اجتہاد میں علوم مذکورہ کا

جاننا پہچانا کافی نہیں، جب تک کہ یہ ملکہ اجتہاد حاصل نہ ہو، اور قواعد اجتہاد کی تائیس نہ رکھی جائے۔

پس جو شخص علوم مذکورہ بالا سے جاہل ہو یا تمام مذکورہ بالا علوم پر حاوی ہو مگر اسے یہ ملکہ اجتہاد نصیب نہ ہو، یا یہ ملکہ بھی حاصل ہو، مگر وہ قواعد اجتہاد کی تائیس نہ کرے، اس کے باوجود اجتہاد کا دعویٰ کرے تو وہ خطا کا مرتکب ہے، اور اس پر لازم ہے کہ اپنے مرتبہ اجتہاد کو دلیل سے ثابت کرے۔“

(مقدمہ حاشیہ کنز الدقائق ص ۵)

۵ — اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔ کسی نے اسے بند نہیں کیا۔ البتہ ائمہ اربعہ کے بعد ائمہ اربعہ کے مرتبہ کا کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوا کیونکہ علم کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے علم کا پھیلاؤ اور اس کا طول و عرض بڑھتا جا رہا ہے، اور اسی تناسب سے اس کا عمق اور اس کی گہرائی گھٹتی جا رہی ہے اور جس تناسب سے علم کی گہرائی کم ہوتی گئی اسی تناسب سے مرتبہ اجتہاد میں تنزل آتا رہا۔

مجتہد مطلق سلف میں بہت سے اکابر ہوئے ہیں، اور ان میں سے بہت سے حضرات مستقل فقہی مکتب فکر کے بانی بھی ہوئے جن میں امام لیث بن سعد، امام سفیان ثوری، اور امام اوزاعی وغیرہ کے اسمائے گرامی بطور خاص لائق ذکر ہیں، لیکن حق تعالیٰ شانہ کی عنایت خاصہ، مشیت مطلقہ اور حکمت بالغہ نے ائمہ اربعہ کے مذاہب کو ایسا شرف فروغ عطا فرمایا کہ ان کے سامنے باقی تمام فقہی مسالک ماند پڑ گئے، نہ ان ائمہ اربعہ کی طرح ان کے اجتہادات کے اصول و فروع مرتب و مدون ہو سکے، اور نہ ان کے فقہی سرمایہ کی تنقیح و ترجیح اور تہذیب و ترتیب ہو سکی۔ نتیجہ یہ کہ امت ان چار فقہی مسالک پر متفق ہو گئی۔ اور ان کے علاوہ دیگر فقہی اجتہادات پس منظر میں

چلے گئے۔

ان ائمہ اربعہ کے بعد بھی بہت سے حضرات اجتہادی صلاحیتوں کے مالک ہوئے۔ (اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، اس کا سلسلہ جاری رہے گا)۔ لیکن چوتھی صدی کے بعد کوئی مجتہد مطلق امت میں پیدا نہیں ہوا۔ اور پیدائش ہونے کے یہ معنی نہیں کہ علما نے کسی منصوبہ بندی کے تحت ان کی پیدائش پر پابندی عائد کر دی تھی۔ بلکہ ”اجتہاد مطلق“ کے لئے جن ضروری شرائط اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ ان صلاحیتوں کا حامل کوئی شخص پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت تھی، چونکہ دین کی تشریح و تعبیر کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے اصول و فروع مرتب ہو چکے تھے۔ اور پیش آنے والے جدید مسائل کا حل ان اصول و قواعد کی روشنی میں ہو سکتا تھا۔ اس لئے آئندہ انہی اصول پر اجتہاد کی راہ رکھی گئی۔ اور کسی مجتہد مطلق کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ امت میں بڑے بڑے اکابر اہل علم پیدا ہوئے، اور ان میں سے بہت سے حضرات علوم دینیہ کے جامع تھے مگر چوتھی صدی کے بعد کسی کو اجتہاد مطلق کے دعویٰ کا وسوسہ بھی نہیں آیا اور اگر وفور علم اور وسعت معلومات کی بنا پر کسی کو اس کا کچھ خیال ہوا بھی تو اہل علم نے دعویٰ اجتہاد کی دلیل طلب کر کے اس کا ایسا منہ بند کیا کہ ساری شئی بھول گیا۔

مثلاً حافظ ابن تیمیہؒ کے دعویٰ اجتہاد کے لئے خود گورایہ صاحب نے بھی اقبال کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ حافظ ابن تیمیہؒ کی تالیفات دنیا میں موجود ہیں جو شخص ان کی کتاب پڑھے گا وہ اس کی شہادت دے گا کہ وہ اپنا انتساب امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کو اگر دعویٰ بھی ہے تو مجتہد مطلق ہونے کا نہیں بلکہ مجتہد منتسب ہونے کا دعویٰ ہے۔ اجتہاد مطلق کا دعویٰ ان کی طرف منسوب کرنا ان پر بے جا تہمت ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ بلاشبہ علم کا بحر مواج ہیں اور یہ ٹھانھیں مارتا ہوا سمندر جب کناروں سے اچھلتا ہے تو اس کا سیلاب بے کراں راستہ کی ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے، لیکن اجتہاد مطلق کی چوٹی اس سے بہت ہی دور و بلند و بالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے جن چند مسائل میں شدوذ و تفرد اختیار کیا انہیں ان کے تلافیہ میں بھی مکمل نفوذ و رواج نصیب نہ ہوا چہ جائیکہ ان کے اجتہاد مطلق کا مرتبہ امت میں تسلیم کیا جاتا۔ گویا حافظ ابن تیمیہؒ کے اجتہاد کی ترکنازیاں چند مسائل تک محدود رہیں اور وہ بھی لائق پذیرائی نہیں سمجھے گئے۔

حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی وسعت علم اور جلالت قدر سے دنیا واقف ہے۔ کثرت تالیف میں انہیں گوتے سبقت حاصل ہے۔ دینی علوم میں سے شاید ہی کوئی فن ایسا ہو گا جس میں سیوطیؒ کی کوئی تصنیف نہ ہو، کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی ”اجتہاد مطلق“ کا وہم ہو گیا تھا۔ اہل علم نے ایسے چند مسائل لکھ بھیجے جن میں شافعی مذہب کے دو قول ہیں، اور ان سے کہا گیا کہ اجتہاد کا ادنیٰ درجہ دو میں ہے ایک قول کو ترجیح دینا ہے، ذرا اپنی علمی قوت سے ان مسائل میں دو قولوں میں سے ایک کو ترجیح دے کر اپنے لئے اجتہاد کا ادنیٰ ترین مرتبہ ہی ثابت کر دکھائیے، اجتہاد مطلق تو بہت دور کی چیز ہے، لیکن حافظ سیوطیؒ اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکے۔ اور ان کا دعویٰ اجتہاد ہمیشہ کے لئے خاموشی کی غار میں دفن ہو گیا۔ حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ شروط اجتہاد ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں :

ترجمہ ”چنانچہ حافظ سیوطیؒ نے باوجود اپنے علمی احاطہ کے

اجتہاد کا دعویٰ کیا تو ان کے ہم عصر اہل علم ان کے مقابلہ میں کھڑے

ہو گئے۔ چنانچہ مناوی لکھتے ہیں :

”سیوطیؒ پر اس کی وجہ سے قیامت برپا ہو گئی اور ان کا یہ

دعویٰ خود ان کے زمانے میں بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور اہل علم نے ان کو مناظرے کی دعوت دی مگر وہ اہل علم کا سامنا نہ کر سکے۔
مناوی آگے لکھتے ہیں :

”اہل علم نے سیوطیؒ کو لکھا کہ جب آپ اجتہاد کے مدعی ہیں تو آپ پر لازم ہے کہ اسے دلیل سے ثابت کریں تاکہ جواب مطابق دعویٰ ہو اور آپ کو پانچویں فقہی مسلک کا بانی تصور کیا جائے۔“

علامہ شہاب الدین ابن حجرؒ (الہتبی المکی المتوفی ۹۷۳ھ) لکھتے ہیں :

”جب جلال الدین سیوطیؒ نے اجتہاد کا دعویٰ کیا تو ان کے ہم عصران کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بیک زبان ہو کر ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔ انہوں نے سیوطیؒ کے سامنے ایک سوالنامہ پیش کیا جس میں چند ایسے مسائل درج کئے جن میں مشائخ شافعیہ نے مطلقاً دو قول ذکر کر دیئے ہیں (اور ان میں سے کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دی) اہل علم نے سیوطیؒ سے مطالبہ کیا کہ اگر انہیں (یعنی سیوطیؒ کو) اجتہاد کا ادنیٰ مرتبہ حاصل ہے جسے ”اجتہاد فتویٰ“ کہتے ہیں، تو ذرا یہ بتائیں کہ ان دو قولوں میں کون سا قول رائج ہے؟ اور مجتہدین کے قواعد کے مطابق اس کی ترجیح کی وجہ بھی بتائیں۔ لیکن سیوطیؒ نے یہ سوالنامہ بغیر جواب کے واپس کر دیا۔ اور یہ عذر کیا کہ میں بہت مصروف ہوں، اس لئے ان سوالات پر غور کرنے کی فرصت نہیں :

شیخ شہاب الدین ابن حجرؒ اس واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں :

”اس سے اجتہاد کے ادنیٰ مرتبہ یعنی ”اجتہاد فتویٰ“ کی دشواری کا اندازہ کرو تمہیں ظاہر ہو جائے گا کہ اس ادنیٰ مرتبہ اجتہاد کا مدعی بھی اپنے معاملہ میں مبتلائے حیرت اور ذہنی و فکری فساد کا شکار ہے۔ وہ اندھی اونٹنی پر سوار ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے، چہ جائیکہ کوئی شخص اجتہاد مطلق کا دعویٰ کرے اور اجتہاد مطلق کے مرتبہ کا تصور جس شخص کے ذہن میں ہو اسے ان زمانوں کے کسی شخص کی طرف اس مرتبہ اجتہاد کو منسوب کرتے ہوئے شرم آئے گی۔ بلکہ شیخ ابن الصلاح اور ان کے متبعین کا کہنا ہے کہ ”اجتہاد مطلق قریباً تین سو سال سے منقطع ہو چکا ہے۔“ اور ابن الصلاح کے زمانے کو بھی قریباً تین سو سال گزر چکے ہیں، گویا سیوطیؒ کے زمانے سے چھ سو سال پہلے اجتہاد مطلق منقطع ہو چکا تھا۔ (حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی وفات ۹۱۱ھ میں ہوئی) بلکہ ابن الصلاح نے بعض اصولین سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانہ سے اب تک کوئی مجتہد مطلق مستقل پیدا نہیں ہوا۔“

شیخ شہاب الدین ابن حجرؒ التبیانیؒ الکی آگے لکھتے ہیں :

”اور جب کہ ائمہ شافعیہ کے درمیان اس نکتہ پر طویل معرکہ آرائی ہوئی ہے کہ امام الحرمین اور حجتہ الاسلام امام غزالیؒ اور ان دونوں کا علمی مرتبہ و مقام کسی کو معلوم نہیں۔۔۔ آیا یہ دونوں حضرات ”اصحاب وجوہ“ میں سے ہیں یا

نہیں؟ جب کہ ”اصحاب وجوہ“ کا مرتبہ مجتہدین سے بہت ہی کم تر ہے تو دوسرے لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ بلکہ صاحب بحر نے تو صاف لکھا ہے کہ ”وہ اصحاب وجوہ میں سے نہیں تھے۔“ اور یہ باوجود ان کے اس قول کے ہے کہ ”اگر امام شافعی“ کے فتاویٰ ضائع ہو جائیں تو میں ان کو اپنے حافظہ سے املا کر اسکتا ہوں۔“

پس جب یہ اکابر بھی اجتہاد فی المذہب کے مرتبہ کے اہل نہ ہوئے تو جو شخص ان حضرات کی اکثر عبارتوں کو ٹھیک سمجھنے سے بھی معذور ہو اس کے لئے کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ وہ اس سے بھی اعلیٰ مرتبہ کے اجتہاد یعنی ”اجتہاد مطلق“ کا دعویٰ ہانکتا پھرے۔
سبحانک هذا بہتان عظیم

اور ”انوار“ میں امام رافعیؒ نے نقل کیا ہے کہ :

”قوم کا گویا اس پر اجماع ہے کہ آج کوئی مجتہد مطلق نہیں۔ اور دیار شام کے عالم ابن ابی الامّ شروط اجتہاد کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

”ہمارے زمانے کے کسی عالم میں ان شروط اجتہاد کا وجود نہیں بلکہ آج روئے زمین پر کوئی مجتہد مطلق نہیں پایا جاتا۔ باوجودیکہ اہل علم نے تفسیر و حدیث اور اصول و فروع کی اس قدر کتابیں تصنیف کی ہیں کہ ان تصنیفات سے زمین کو بھر دیا ہے۔ اسکے باوجود کسی خطہ زمین میں نہ صرف یہ کہ مجتہد مطلق نہیں پایا جاتا بلکہ کسی امام کے مذہب کا ایسا مجتہد فی المذہب بھی موجود نہیں

جس کے اقوال کو اس کے امام کے مذہب میں تخریج شدہ روایت کا درجہ دیا جاسکے۔

اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس مرتبہ کی تحصیل سے عاجز کر دیا ہے۔ اپنے بندوں کو یہ بتانے کے لئے کہ زمانہ ختم ہو رہا ہے، اور قیامت کا قرب ہے، اور اجتہاد مطلق (کے درجے کے علم) کا اٹھ جانا بھی علامات قیامت میں سے ایک علامت ہے۔“

اور امام قفال جنہیں ”شیخ الاصحاب“ (شیخ الاصحاب سے مراد ہے ”اصحاب وجوہ“ کے استاذ، اصحاب وجوہ کا لفظ حضرات شافعیہ کے یہاں بولا جاتا ہے جس کی وضاحت آگے قفال کے قول میں آرہی ہے۔ ناقل) کا خطاب دیا گیا ہے، فرماتے ہیں :

” مجتہد فتویٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو اجتہاد مطلق کے شروط کا جامع ہو۔ اور ایسا مجتہد اب دنیا میں موجود نہیں۔ دوسرا وہ جو ائمہ اجتہاد میں کسی کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً امام شافعیؒ کی طرف، اور وہ اپنے امام کے مذہب کا ایسا ماہر و حاذق ہو کہ اس کا علم امام کے تمام اصول و فروع پر محیط ہو۔ اور امام کے اصولوں میں سے کوئی اصول اس کے علم سے خارج نہ ہو۔ پس جب اس سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جائے تو اگر اسے اپنے امام کی کوئی صراحت معلوم ہو تو اس کے مطابق جواب دے ورنہ اس کے مذہب میں اجتہاد کر کے اس کے اصولوں پر اس مسئلہ کی تخریج کرے۔ اور یہ مرتبہ کبریت احمر سے زیادہ نادر الوجود ہے۔“

پس جب کہ امام قفال کا قول ان کی جلالت قدر کے باوجود یہ ہے، حالانکہ ان کے تلامذہ اور غلام بھی شافعی مذہب ہیں ”اصحاب الوجوہ“ کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ تو ہمارے دور کے علما میں سے کسی کے مرتبہ اجتہاد پر فائز ہونے کا کیا سوال ہے؟ یاد رہے کہ قاضی حسین قورانی، امام الحرمین کے والد جوینی، صید لانی، سنجی وغیرہم جیسے اکابر امام قفال کے غلاموں کی صف میں شامل ہیں۔ اور ان حضرات کے انتقال کے بعد اور امام حجتہ الاسلام ابو حامد غزالی کے شاگردوں کے انتقال کے بعد امام شافعی کے مذہب میں تخریج وجوہ اور اجتہاد و منتسب کا مرتبہ بھی ختم ہو گیا بعد میں صرف مذہب شافعی کے ناقل و حافظ ہی رہ گئے۔ اور اس زمانے میں تو دنیا ہی ان سے خالی ہو گئی۔ اور زمانہ ان جیسے لوگ پیدا کرنے سے بانجھ ہو گیا۔

اس اقتباس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ ”اجتہاد و منتسب کے درجہ کا بھی کوئی شخص باقی نہیں رہا، اور صرف فقہی مذاہب کے حافظ و ناقل ہی رہ گئے ہیں۔“ لیکن چار پانچ صدیوں کے مزید انحطاط کی بدولت اب واقعہ یہ ہے کہ فقہ حنفی یا شافعی و مالکی کے ”حافظ“ بھی دنیا سے ناپید ہو رہے ہیں اور خل خل افراد ہی ایسے نظر آئیں گے جن کی نظر فقہی جزئیات پر محیط ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی آخر میں ابنائے زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ومنه يعلم ايضا بطلان دعاوى قوم
الاجتهاد من اهل عصرنا منهمكين في الدنيا
وجمعها وفي شهواتها ولذاتها يشغلون جميع

اوقاتہم بذلک لا يتصورون الاجتهاد بل ولا العلم وانما يدعون ذلک فهما منهم ان المجتهد يباح له ما لا يباح لغيره من المحرمات المجمع عليها وغيرها لا يعلمون ان من شروط الاجتهاد عدم معارضة الكتاب والسنة والا جماعاً۔

ترجمہ: ”یہیں سے ہمارے ابنائے زمانہ کے مدعیان اجتہاد کے دعویٰ کا باطل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ یہ حضرات سر سے پاؤں تک دنیا کے سمیٹنے میں منہمک ہیں، اور ہمہ وقت اس کی لذتوں اور شہوتوں کے حصول میں مشغول رہتے ہیں، ان کے ذہن میں نہ تو اجتہاد کا تصور ہے۔ اور نہ دین کا علم ہی رکھتے ہیں۔ ان کے دعویٰ کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجتہد کے لئے وہ چیزیں مباح ہو جاتی ہیں جو دوسروں کے لئے مباح نہیں ہوتیں، یعنی وہ چیزیں جو بالاجماع حرام ہیں مجتہد اپنے اجتہاد کے زور سے ان کو بھی حلال کر لیا کرتا ہے، یہ مسکین اتنا بھی نہیں جانتے کہ اجتہاد صحیح کیلئے یہ شرط ہے کہ وہ کتاب و سنت اور اجماع امت کے معارض نہ ہو۔“

۷۔۔۔۔۔ ایک طرف قرب قیامت اور علمی انحطاط کی بنا پر فہم شریعت کی صلاحیتیں رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہیں اور قلوب پر ہوائے نفس اور اعجاب بالرائے کے جذبات غالب آرہے ہیں۔ اور دوسری طرف جدید دور اور جدید تمدن نے بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کے شرعی احکام دریافت کئے جاتے ہیں۔ اس مشکل

کا حل یہ ہے کہ وقت کے جامع ترین اہل علم اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے ایسے ماہرین کے علم سے استفادہ کیا جائے، جن کا اخلاص و تقویٰ مسلم ہو۔ اور جن کا علم و فہم اور تدین لائق اعتماد ہو۔ ان کے اجتماعی غور و فکر سے ان مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔

حدیث شریف میں ہے :

عن علی رضی اللہ عنہ قال قلت یا رسول اللہ! ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تامرنی؟ قال شاوروا فیہ الفقہا والعابدین، ولا تمضوا فیہ رای خاصۃ (قال الہیثمی، رواہ الطبرانی فی الاوسط، ورجالہ موثقون من الصحیح) *

(مجمع الزوائد ص ۱۷۸ ج ۱)

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں آپ کا کوئی بیان، کرنے یا نہ کرنے کا، نہ ملتا ہو تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کیا کیا جائے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس بارے میں فقہاء و عابدین سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں، اور اس میں شخصی رائے کو دخل نہ دیں۔“

حضرت اقدس شیخ الاسلام مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقہ نے ”بینات“ بابت ربیعین ۱۳۸۳ھ میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی تھی، اس سلسلہ میں

چند رہنما اصول بھی تحریر فرمائے تھے۔ اسے افادے کی غرض سے اس مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ نقل کر دیا گیا ہے۔

۸ — حق تعالیٰ شانہ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔ اسلئے ایسے انتظامی امور جن کا حرام و حلال اور جائز و ناجائز سے تعلق نہیں، اور نہ ان میں شارع کی طرف سے کوئی نص ہو، ان میں حکومت کے لئے یا پارلیمنٹ کے لئے قانون سازی کا وسیع میدان موجود ہے۔ جب کہ اس قانون سازی سے نہ تو کسی نص شرعی کی مخالفت لازم آتی ہو، اور نہ شریعت مطہرہ کے کسی قاعدے سے خروج لازم آتا ہو۔

اجتہاد کے موضوع پر ان چند تمہیدی نکات کے بعد اب ہم ڈاکٹر گورایہ صاحب کے خیالات کا جائزہ لیں گے۔

علامہ اقبال : مجتہد مطلق؟

ڈاکٹر گورایہ صاحب علامہ کے حوالے سے ایسے افکار پیش کرنا چاہتے ہیں جو کسی حساس مسلم معاشرہ میں آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتے اس لئے انہیں ضرورت ہوئی کہ علامہ اقبال مرحوم کا قد مصنوعی طور پر بڑھایا جائے۔ ان کے لئے غیر واقعی بلندی ثابت کی جائے، اور پھر ان کی رفعت و عظمت کی بام بلند سے قوم کو خطاب کیا جائے۔ ماکہ گورایہ صاحب کے قارئین و سامعین کی گردنیں علامہ کی بلند قامتی کے آگے ایسی جھک جائیں کہ کسی کو ان کے نام پر پیش کئے گئے ناپختہ اور غیر منہضم خیالات پر دلیل طلب کرنے کا حوصلہ اور ان پر تنقید کا یارا نہ رہے۔

علامہ اقبال مرحوم کی عام شہرت ایک ملی شاعر، ایک نکتہ رس فلسفی، ایک دانشمند حکیم اور تہذیب جدید کے ایک دانائے راز ناقد کی حیثیت سے ہے، لیکن

گورایہ صاحب اپنی ضرورت کے لئے ان کی اپنی صف سے اٹھا کر انہیں ائمہ دین کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں، ہمارے سامنے ان کا تعارف دین و شریعت کے ایک مجتہد اعظم اور مجتہد مطلق کی حیثیت سے کراتے ہیں۔ ابو حنیفہ و شافعی (رحمہم اللہ) کو ان کے سامنے ہیچ ثابت کرتے ہیں، اور ان حضرات کے فقہی سرمایہ کو علامہ اقبال کی آرا کے مقابلہ میں باطل و فرسودہ قرار دیتے ہیں۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ اس چہ بوالعجیست
گورایہ صاحب بغیر کسی جھجک کے لکھتے ہیں :

”علامہ اقبال اجتہاد کے درجہ اول اجتہاد مطلق کے داعی ہیں، اور وہ خود مجتہد مطلق ہیں۔ ان دو اصطلاحوں کا استعمال وہ اپنے قلم سے خود کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اجتہاد کے اصول خود وضع کئے ہیں۔ اور انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے ماخذ شریعت قرآن و حدیث، اجماع اور قیاس پر جو بحث کی ہے وہ نہایت بصیرت افروز ہے۔ جس سے ان کے اجتہاد کے وضع کردہ قواعد و ضوابط واضح ہو جاتے ہیں۔“

”علامہ اقبال کی رائے میں گزشتہ فقہی افکار فرسودہ ہو چکے ہیں اور کسی قوم کے فرسودہ افکار اسکے احیا و تجدید کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔“

جناب گورایہ صاحب کی اس تحریر کو پڑھ کر جو پہلا تاثر ذہن پر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ”اجتہاد“ کسے کہتے ہیں؟ اور مجتہد مطلق کون ہوتا ہے؟ ورنہ اگر ان الفاظ کی عظمت ان کے ذہن میں ہوتی تو ان الفاظ کے بے جا استعمال سے وہ ان مقدس اصطلاحات کی توہین و تذلیل نہ کرتے۔

اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ موصوف نے تین قسطوں میں ”اجتہاد“ پر مقالہ لکھا مگر کہیں ہلکا سا اشارہ بھی اس طرف نہیں کیا کہ اجتہاد کس چیز کا نام ہے؟ اس کی تعریف اور غرض وغایت کیا ہے؟ اجتہاد کے ضروری آلات و شرائط کیا ہیں؟ اجتہاد صحیح اور اجتہاد باطل کے درمیان ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ اور یہ کہ ”مجتہد مطلق“ کو کم سے کم کن صلاحیتوں کا مالک اور کن صفات کا حامل ہونا چاہئے؟ جب آپ یہی نہیں بتاتے کہ اجتہاد کا مفہوم کیا ہے؟ اسکے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اور یہ نسخہ کس موقع پر استعمال کیا جاتا ہے؟ تو آپ کا خود ساختہ ترازو ہاتھ میں لے کر بیٹھ جانا اور یہ فیصلے دینا کہ فلاں کو اجتہاد کا حق ہے فلاں کو نہیں، یا یہ کہ فلاں شخص یا فلاں ادارہ چشم بد دور ”مجتہد مطلق“ ہے، اس پر قرآن کریم کی زبان میں یہی کہا جاسکتا ہے:

”ان ہی الا اسماء سمیتموھا انتم
وآباکم“ (نجم- ۲۳)

ترجمہ: ”یہ سب نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ
دادوں نے۔“

گورایہ صاحب کے بقول علامہ مجتہد مطلق تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ آپ کا دعویٰ ہے اس کی دلیل؟ کیا علامہ نے خود مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ فرمایا تھا؟ کیا اس دعویٰ کو دلائل کی روشنی میں ثابت کر دکھایا تھا؟ کیا (گورایہ صاحب اور ان کے ہم نفسوں کے سوا) ان کے اس دعویٰ کو امت نے تسلیم کر لیا تھا؟ کیا علامہ نے اجتہاد کے اصول و فروع اور اس کے شرائط و لوازم اور مجتہد کے اوصاف اور آلات پر کوئی ”اصول فقہ“ مرتب فرمایا تھا؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو کیا اجتہاد کے موضوع پر اپنے چند ذاتی رجحانات و خیالات پیش کرنے سے آدمی ”مجتہد مطلق“

بن جاتا ہے۔۔۔۔؟ لیکن اس الحاد پرور دور میں گورایہ صاحب کا ”اجتہاد“ ذرا بھی لائق تعجب نہیں۔ جس زمانے میں مرزا غلام احمد قادیانی کو ”محمد رسول اللہ“ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہو، جس زمانے میں ”اللہ و رسول“ کا ترجمہ ”مرکز ملت (مرکزی حکومت) کے ساتھ کیا جاتا ہو، جس زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کے لئے عقل و ایمان کی شرط بھی غیر ضروری قرار دے دی گئی ہو، اور مسٹر پرویز اور مسٹر محمد علی لاہوری قادیانی ایسے لوگ ”مفسر قرآن“ کہلاتے ہوں۔ اس زمانے میں اگر گورایہ صاحب ایک قومی شاعر کو ”مجتہد مطلق“ قرار دے کر اسے ابو حنیفہ و شافعی کے ہمدوش لاکھڑا کریں تو یہ ان کا ایک معمولی سا کارنامہ ہے، اور دور جدید کے مجتہدوں سے اسی قسم کے کارناموں کی توقع کی جاسکتی ہے :

”اس کار از تو آید و مرداں چنین کنند“

گورایہ صاحب نے علامہ اقبال کو مجتہد مطلق کے منصب پر فائز کر کے ان کے ”اجتہاد مطلق“ کے چند نادر نمونے بھی پیش فرمائے ہیں جو ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں :

پہلا اجتہاد : خلافت نہیں، جمہوریت

موسم ف ”طرز حکومت“ کا عنوان قائم کر کے علامہ اقبال کا پہلا اجتہادی نظریہ پیش فرماتے ہیں کہ ترکی کا الغائے خلافت کا ”اجتہاد“ صحیح تھا۔ موصوف لکھتے ہیں :

”علامہ اقبال کے نزدیک جمہوری طرز حکومت روح اسلام

کے عین مطابق ہے۔ اور قانون سازی کا صحیح اور جائز حق ایک

منتخب اسمبلی کو حاصل ہے۔ وہ ترکی کے اس ”اجتہاد“ کو روح اسلام

کے عین مطابق قرار دیتے ہیں جس میں خلافت ایک منتخب اسمبلی کو

تفویض کرنے کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس پر وہ رائے کا اظہار
ان الفاظ میں کرتے ہیں :

”ذاتی طور پر میرا ایمان ہے کہ ترکی کا اجتہاد کلی طور پر جائز
ہے۔ یہ اتنا درست ہے کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت
نہیں۔ اس لئے کہ ایک تو جمہوری طرز حکومت مکمل طور پر روح
اسلام کے عین مطابق ہے۔ ثانیاً ان نئی قوتوں کے پیش نظر جو عالم
اسلام میں بیدار ہو چکی ہیں جمہوری طرز حکومت اور بھی ناگزیر
ضرورت بن جاتی ہے۔“

اس اجتہاد کے کئی پہلو غور طلب ہیں :

اولاً : اسلام یا روح اسلام؟

مندرجہ بالا مجتہدانہ عبارت میں ”روح اسلام“ کا لفظ کئی بار آیا ہے اور ہمارا
جدت پسند طبقہ بڑی افراط سے اس لفظ کے استعمال کا عادی ہے۔ لیکن گورایہ صاحب
نے اس امر کی وضاحت نہیں فرمائی کہ ”روح اسلام“ کیا چیز ہے؟ آیا یہ لفظ اسلام ہی
کا مترادف ہے، یا اسلام سے الگ کوئی چیز ہے۔ اگر اسلام اور ”روح اسلام“ ایک ہی
حقیقت کے دو نام ہیں تو اسلام کو چھوڑ کر ”روح اسلام“ کی اصطلاح کیوں استعمال کی
جاتی ہے، یہ محض ایک فیشن ہے جس کے ذریعہ جدت پسندی اور مغربیت کی تقلید
کے جذبہ کو تسکین دینا مقصود ہے، یا اس کے تحت کوئی گہری حکمت مضمّن ہے؟

اسلام تو ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے، اور یہ وہ
دین ہے جو حضرت حق جل شانہ نے نبی رحمت ﷺ کے ذریعہ انسانیت کو عطا
فرمایا، لیکن یہ ”اسلام کی روح“ کس نے نکالی؟ کب نکالی گئی؟ اور یہ کہاں سے
دستیاب ہوتی ہے؟ جس کا حوالہ جناب گورایہ صاحب دے رہے ہیں؟

شاید ہمارے کچھ دوست میرے اس نکتہ کی تضحیک فرمائیں کہ میں نے یہ کیا لفظی بحث شروع کر دی ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ ”روح اسلام“ کی اصطلاح محض ”بدعت الفاظ“ نہیں بلکہ اس کے تحت ایک خوفناک الحاد مضمحل ہے ہمارا تجدد پسند طبقہ اس نظریہ کا قائل ہے (اور اسے مغربی یونیورسٹیوں میں شاید یہی سبق پڑھایا گیا ہے) کہ دنیا کا کوئی قانون غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اسلامی قوانین بھی غیر متبدل نہیں ہیں، خواہ وہ نصوص قطعیہ ہی سے ثابت ہوں۔ البتہ اسلام نے قانون سازی کا محور چند اعلیٰ و ارفع اصولوں کو بنایا ہے۔ اسلام کی قانونی جزئیات بدل سکتی ہیں مگر یہ ”راہنما اصول“ غیر متبدل ہیں مثلاً عدل، مساوات، اخوت، انسانی ہمدردی وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند مبہم اصول ان حضرات کے نزدیک اسلامی قانون کی روح ہیں۔ اور یہی اصول ان کی اصطلاح میں ”روح اسلام“ کہلاتے ہیں۔

ہمارے تجدد پسند طبقہ کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام کے ان اصول عامہ (یا روح اسلام) کو باقی رکھتے ہوئے ہم دین اسلام کے تمام جزئیات میں اپنے دور کے مقتضیات کے مطابق تبدیلی کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی اسلام کی دعوت ہے۔ یہی قرآن و سنت کا تقاضا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اسلام کی ابدیت کے۔

ان کے بقول رسول اللہ ﷺ نے یا آپ کے خلفاء راشدینؓ نے جو فیصلے کئے تھے وہ اپنے زمانے کے مقتضیات کے پیش نظر تھے، اور ہمیں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کرنی ہے۔ اس لئے نہ تو ہم خلفائے راشدینؓ کے کسی فیصلہ کے پابند ہیں، اور نہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے۔ بعد کے ائمہ مجتہدین تو خیر کس شمار و قطار میں ہیں۔ راقم الحروف کی کئی تجدد پسندوں سے گفتگو ہوئی۔ ان کو اسی نظریہ کا قائل پایا۔

ڈاکٹر فضل الرحمن اپنی تحریروں میں کھل کر کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ

کے فیصلے بھی ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ قانونی نظیر ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گورایہ صاحب بھی ائمہ مجتہدین کو لتاڑتے ہوئے ابھی صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ تک پہنچے ہیں (جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا) صرف آنحضرت ﷺ کے دامن عصمت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ذرا جھجکتے ہیں، شاید کسی مصلحت کی وجہ سے۔ تاہم جب کہ ائمہ مجتہدین (ابو حنیفہؒ و شافعیؒ وغیرہ) ان کے اجتہاد کی برق رفتاری کے سامنے غبارِ راہ بن چکے ہیں، اور جب کہ خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کے بدلنے کا وہ فتویٰ صادر فرما چکے ہیں، اگر ان کی اجتہادی ترقیات کی برق رفتاری کا یہی عالم رہا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی آئندہ فتوحات کیا کیا ہوں گی؟

شاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است
سال دیگر گر خدا خواہد خدا خواہد شدن

الغرض یہ ہے ”روح اسلام“ کی وہ اصطلاح جو ہمارے متجددین کو مغرب سے القا ہوئی ہے۔ اور جس میں خوفناک الحاد و ارتداد کی روح مضمر ہے۔ یہ تھی وہ اصل وجہ جس کی بنا پر میں نے دورِ جدید کے مجتہد مطلق جناب گورایہ صاحب سے (جو حسن اتفاق سے میرے ہمنام بھی ہیں) یہ سوال کیا کہ آپ اسلام کے بجائے ”روح اسلام“ کے قائل کیوں ہیں؟ اسلام کو چھوڑنے کا سبب کیا ہے؟ اور ”روح اسلام“ کو اختیار کرنے کی کیا علت ہے؟

ثانیاً : خلافت یا جمہوریت؟

جہاں تک راقم الحروف کے ناقص علم کا تعلق ہے، جمہوریت دورِ جدید کی پیداوار ہے۔ اسلام کا نظریہ حکومت جدید دور کی جمہوریت نہیں، بلکہ خلافت ہے۔ قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں واضح طور پر نظریہ خلافت پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ

قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی خلافت کے لئے ہوئی ہے :

واذ قال ربك للملائكة اني جاعل في

الارض خليفة

(البقرہ-۳۰)

ترجمہ : ”اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا

ہوں زمین میں ایک نائب۔“

(ترجمہ حضرت شیخ المنذّر)

حضرت داود (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) سے فرمایا گیا :

يا داود انا جعلناك خليفة في الارض

فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى

فيضلك عن سبيل الله ان الذين يضلون عن

سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم

الحساب

(ص ۲۶)

ترجمہ : ”اے داود ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر

لوگوں میں انصاف سے، اور نہ چل جی کی خواہش پر، پھر وہ تجھ کو

بجلا دے اللہ کی راہ سے، مقرر جو لوگ بھٹکتے ہیں اللہ کی راہ سے ان

کے لئے سخت عذاب ہے، اس بات پر کہ بھلا دیا انہوں نے دن

حساب کا۔“

(ترجمہ شیخ المنذّر)

حضرت موسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) اپنی قوم سے فرماتے ہیں :

عسى ربكم ان يهلك عدوكم ويستخلفكم

فی الارض فینظر کیف تعملون۔

(الاعراف۔ ۱۲۹)

ترجمہ: ”نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کر دے تمہارے دشمن کو، اور خلیفہ کر دے تم کو ملک میں، پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو۔“

(ترجمہ حضرت شیخ المنذ)

امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰت والتسلیمات) سے وعدہ فرمایا گیا ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا کی جائے گی جیسا کہ ان سے پہلے حضرات کو عطا کی گئی :

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم۔

(النور۔ ۵۵)

ترجمہ: ”وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو۔“

(ترجمہ حضرت شیخ المنذ)

یہ قرآن کریم کی چند آیات تھیں۔ چند احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مثلاً ایک حدیث شریف میں ہے :

کانت بنو اسرائیل تسوسہم الانبیاء
کلما ہلک نبی خلفہ نبی، وانہ لا نبی بعدی
وسیکون خلفا فیکثرون۔

(تفق علیہ، مشکوٰۃ ص ۲۳۰)

ترجمہ: ”بنی اسرائیل کی سیاست انبیا کے ہاتھ میں تھی۔ جب ایک نبی کا انتقال ہو جاتا تو اس کی جگہ دو سرانبی آجاتا۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے۔“

ایک اور حدیث میں ہے :

اذا بویع لخلیفین فاقتلوا الآخر منہما۔

(رواہ مسلم مشکوٰۃ ص ۲۳۰)

ترجمہ: ”جب دو خلیفوں سے بیعت کی جائے تو ان میں سے دوسرے کو قتل کر دو۔“

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

یکون فی آخر امتی خلیفۃ یحشی المال
حشیا ولا یعدم۔

(رواہ مسلم مشکوٰۃ ص ۴۶۹)

ترجمہ: ”میری امت کے آخری حصہ میں ایک خلیفہ ہوگا جو دونوں ہاتھوں سے بھر کر مال دے گا۔ اور گن کر نہیں دے گا۔“

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم یوتی اللہ
الملک من یشا۔

(ابو داؤد ص ۲۸۲ ج ۲)

ترجمہ: ”خلافت نبوت تیس سال ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں سلطنت عطا فرمائیں۔“

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

لو كنت مستخلفا احدا عن غير مشورة
لا استخلفت ابن ام عبد۔
(ابن ماجہ ص ۱۳)

ترجمہ: ”اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے خلیفہ بناتا تو عبد اللہ بن مسعود کو بناتا۔“

ایک اور حدیث شریف میں ہے :

ان هذا الامر بدا نبوة ورحمة ثم يكون
خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم كائن جبرية
وعتوا وفسادا في الارض يستحلون الحرير
والفروج والخمور، يرزقون على ذلك وينصرون
حتى يلقوا الله

(رواه البيهقي في شعب الایمان۔ مشکوٰۃ ص ۳۶۰)

ترجمہ: ”یہ دین نبوت و رحمت سے شروع ہوا، پھر خلافت و رحمت ہو جائے گی، پھر کٹ کھنی سلطنت ہوگی پھر جبریت، سرکشی اور فساد فی الارض ہوگا۔“

یہ لوگ ریشم کو، عصمتوں کو اور شراب کو حلال کر لیں گے، اس کے باوجود ان کو رزق بھی ملے گا اور ان کی مدد بھی ہوگی، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملیں۔“

اس آخری حدیث سے واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس امت میں ”طرز حکومت“ کے سلسلہ میں چار دور ارشاد فرمائے ہیں :

پہلا دور نبوت و رحمت کا، یہ آنحضرت ﷺ کا دور نبوت و عصمت تھا۔

دوسرا دور خلافت و رحمت کا، یہ حضرات خلفائے راشدینؓ کا دور تھا جو ٹھیک ٹھیک منہاج نبوت پر قائم تھا۔ اور امت اسلامیہ کے لئے سرپا رحمت و برکت تھا۔ تیسرا دور ملوکیت کا، جو خلفائے راشدینؓ کے بعد سے شروع ہوا اور خلافت عثمانیہ کے آخری تاجدار تک باقاعدہ رہا۔ اسکے بعد کہیں کہیں اس کے آثار و نشانات باقی رہ گئے۔

چوتھا دور جبریت و سرکشی اور فساد فی الارض کا، یہ ملوکیت کے بعد دور جدید کی جمہوریت ہے، اور اس میں جمہوریت کے نام پر دھونس اور دھاندلی، جبریت و سرکشی اور فساد فی الارض کے جو کارنامے انجام دیئے جا رہے ہیں ان کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہر شخص کر رہا ہے۔ گویا ملوکیت کے بعد جس دور کو جمہوریت کا سنہری دور کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جبریت کا سیاہ ترین دور ہے، جس میں پارلیمنٹ کو قانون سازی کے کلی اختیارات تفویض کر دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پروا کئے بغیر ہر قسم کی قانون سازی کی مجاز ہے ”جمہوریت کی ماں“ برطانیہ میں پارلیمنٹ نے ”ہم جنسی شادی“ کے جواز کا قانون وضع کر کے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی تصدیق کر دی ہے کہ :

”يَسْتَحْلُونَ الْحَرِيرَ وَالْفُرُوجَ وَالْخُمُورَ“

ترجمہ: ”یہ لوگ ریشم کو، بدکاری کو اور شراب کو حلال کر لیں گے۔“

الغرض جہاں تک قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات کا تعلق ہے ان سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام، جدید جمہوریت کا قائل نہیں بلکہ نظریہ خلافت کا داعی ہے۔ جس کے لئے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین میں بسایا گیا لیکن ہمارے مجتہد مطلق گورایہ صاحب، خلافت کے بجائے جمہوریت کو ”روح اسلام“ کے عین مطابق

قرار دیتے ہیں، معلوم نہیں اس ”روح اسلام“ کی وحی ان پر کہاں سے نازل ہوئی ہے۔

خلافت و جمہوریت ایک چیز نہیں، بلکہ طرز حکومت کے بارے میں یہ دو الگ الگ نظریے ہیں، اور ان دونوں کے درمیان مشرق و مغرب کا بعد اور زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ (مشرق و مغرب اور زمین و آسمان کے الفاظ یہاں محض محاورے کی زبان میں استعمال کئے گئے ہیں، مگر ان میں یہ لطیفہ ہے کہ خلافت و جمہوریت پر ان کا حقیقی مفہوم بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ خلافت مشرقی چیز ہے، اور جمہوریت مغرب سے درآمد شدہ اصطلاح۔ خلافت آسمانی حکم ہے، اور جمہوریت زمین کی پیداوار۔ اس لئے واقعہً ان کے درمیان مشرق و مغرب کا بعد اور آسمان و زمین کا فاصلہ ہے، ناقل) ان دونوں کے درمیان فرق و اختلاف کی تشریح ایک بسیط مقالے کا موضوع ہے۔ مگر میں یہاں ان دونوں کی تعریف نقل کرتا ہوں۔ اسی سے اہل فہم کو معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے؟ چنانچہ خلافت کی تعریف، امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے الفاظ میں یہ ہے :

ہی الرئاسة العامة فى التصدى لاقامة
الدين باحياء العلوم الدينية واقامة اركان
الاسلام والقيام بالجهاد وما يتعلق به من
ترتيب الجيوش والفرض للمقاتلة واعطائهم
من الفتى والقيام بالقضا واقامة الحدود ورفع
المظالم والامر بالمعروف والنهي عن المنكر
نيابة عن النبى صلى الله عليه وسلم۔

۲۔ ارکان اسلام کو قائم کرنا۔

۴۔ عدل وانصاف کا قائم کرنا۔ حدود شرعیہ کا جاری کرنا اور ظالم سے مظلوم کا حق دلانا۔

۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام۔“

اور جمہوریت کی تعریف یہ کی گئی ہے :

”وہ طرز حکومت‘ جس میں بادشاہ کے بجائے عوام کے نمائندے کاروبار حکومت کو انجام دیتے ہیں۔“

(علمی لغات ص ۵۴۳۔ مولفہ جناب وارث سرہندی ایم اے)

دونوں کے مفہوم پر ذرا سا غور کیجئے تو دونوں کے درمیان مندرجہ ذیل فرق سامنے آجاتے ہیں :

۱۔۔۔۔۔ خلافت کا ادارہ آنحضرت ﷺ کی نیابت کے لئے ہے۔ اور جمہوریت میں عوام کے نمائندے عوام کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

۲۔ — خلافت کی غرض و غایت اقامت دین ہے۔ یعنی خدا کی زمین پر خدا کے

دین کا نفاذ۔ جب کہ جمہوریت کی غرض و غایت ہے، عوام کے پسندیدہ قانون کا جاری کرنا۔

۳ — خلافت کا ادارہ شتر بے مہار نہیں، بلکہ وہ قانون الہی کا پابند اور شریعت الہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ گویا شریعت خلافت سے بالاتر قانون ہے، اور کوئی شخص بھی شریعت سے انحراف کی صورت میں خلیفہ پر روک ٹوک کر سکتا ہے۔
قرآن کریم میں ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا
الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي
شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَحَسَنُ تَأْوِيلًا -

(النساء۔ ۵۹)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور
حاکموں کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو
رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے، اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر
اور قیامت کے دن پر، یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا
انجام۔“

(ترجمہ حضرت شیخ المنذ)

آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے جو عہد لیا تھا اس میں ایک شق یہ
تھی :

وَأَنْ لَا نَنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ إِلَّا أَنْ تَرَوْا

كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بَرْهَانٌ - (صحیح بخاری ص ۱۲۵ ج ۲)

ترجمہ :- ”اور ہم اہل حکومت سے حکومت کے معاملے میں منازعت نہ کریں۔ الایہ کہ کھلا ہوا کفر دیکھو جس میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے برہان و دلیل ہے۔“

قال النووی المراد بالكفر هنا المعصية
ومعنى الحديث لا تنازعوا ولا الامور في
ولا يتهم ولا تعترضوا عليهم الا ان تروا منهم
منكرا محققا تعلمونه من قواعد الاسلام
فاذا رايتم ذلك فانكروا عليهم وقولوا بالحق
حيثما كنتم۔

(فتح الباری۔ ص ۸ ج ۱۳)

ترجمہ :- ”اہم نوویؒ فرماتے ہیں کہ کفر سے مراد یہاں معصیت ہے،
’در حدیث کے معنی یہ ہیں کہ ارباب حکومت سے ان کی حکومت
کے بارے میں منازعت نہ کرو، اور نہ ان پر اعتراض کرو۔ الایہ کہ
تم ان کی جانب سے کسی صریح منکر کا ارتکاب دیکھو۔ جس کا منکر
ہونا تمہیں قواعد اسلام سے معلوم ہو۔ پس جب تم ایسی چیز دیکھو تو
ان پر روک ٹوک کرو اور حق بات کہو خواہ تم کہیں بھی ہو۔“

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اولین خطبہ خلافت میں حمد و ثنا

کے بعد فرمایا تھا :

ایہا الناس انی قد ولیت علیکم ولست
بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسات
فقومونی۔

(البدایہ والنہایہ ص ۳۰۱ ج ۶)

ترجمہ: ”لوگو! مجھے تمہارا سربراہ بنادیا گیا ہے اور میں تم سے بہتر نہیں ہوں، پس اگر میں بھلائی کروں تو میری مدد کرو، اور اگر میں برائی کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار انہوں نے (لوگوں کا امتحان کرنے کے لئے) برسرِ ممبر فرمایا :

انما المال مالنا، والفی فیئنا فمن شئنا
اعطيناه، ومن شئنا منعنا۔

ترجمہ: ”یہ (بیت المال) کا مال ہمارا ہے، اور یہ فئے ہماری ملک ہے۔ ہم جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں۔“

ان کو کسی نے جواب نہ دیا، اگلے جمعہ کو پھر یہی فرمایا، مگر کسی نے جواب نہ دیا، تیسرے جمعہ کو پھر یہی الفاظ دہرائے۔ اب کی بار حاضرین مسجد میں سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا :

کلا ! انما المال مالنا، والفی فیئنا، فمن
حال بیننا و بینہ حاکمناہ الی اللہ
باسیافنا۔

ترجمہ: ”ہرگز نہیں! بلکہ یہ مال ہمارا (مسلمانوں کا) ہے اور یہ فئے ہماری ہے، جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا ہم اس کا فیصلہ اپنی تلواروں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دیں گے۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جمعہ سے فارغ ہوئے تو اس شخص کو بلا بھیجا اور

اسے اپنے ساتھ لے کر اندر تشریف لے گئے، لوگوں نے سمجھا کہ اس غریب کی تو شامت آگئی۔ لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ وہ صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی چارپائی پر بیٹھے ہیں، اور حضرت معاویہؓ لوگوں سے فرما رہے ہیں :

ان هذا احیانی احیاء اللہ سمعت رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول سیکون بعدی
امرا یقولون ولا یرد علیہم یتقاحمون فی
النار کما تتقاحم القردة۔

ترجمہ: ”بے شک اس نے مجھے زندہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو زندہ رکھیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے بعد کچھ حکام ہوں گے، وہ غلط باتیں کہیں گے مگر کوئی ان کو ٹوکے گا نہیں۔ یہ لوگ دوزخ میں ایسے گریں گے جیسے بندر ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔“

میں نے پہلے جمعہ کو ایک بات کہی، مگر کسی نے میری تردید نہیں کی، اس پر مجھے اندیشہ ہوا کہ خدا نخواستہ میں بھی انہی امرا میں سے ہوں۔ دوسرے جمعہ کو میں نے یہی بات دہرائی، مگر کسی نے میری تردید نہیں کی۔ تب میں نے دل میں سوچا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں۔ تیسرے جمعہ کو میں نے پھر یہی بات دہرائی تو اس شخص نے کھڑے ہو کر میری تردید کر ڈالی۔

فا حیانی احیاء اللہ۔

ترجمہ: ”پس اس نے مجھے زندہ کر دیا اللہ اس کو زندہ رکھے۔“

(قال البیہقی ج ۵ ص ۲۳۶) رواہ البرانی فی الکبیر الاوسط، ابو سعید و رجالہ ثقات)

اسی ایک واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حکمرانوں کی جو بات حدود شرعیہ سے متجاوز ہو اس پر روک ٹوک کرنا کتنا ضروری ہے۔ چنانچہ شریعت کے حوالے سے خلفا پر روک ٹوک کے واقعات اتنی کثرت سے ہیں کہ احاطہ شمار سے خارج ہیں۔

برعکس اس کے جمہوری نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ مطلق العنان ادارہ ہے اور اس کا وضع کیا ہوا دستور سب سے بالاتر قانون ہے، اس سے بالاتر کوئی قانون نہیں جس کے حوالے سے ان پر روک ٹوک کی جاسکے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں جب نفاذ شریعت کا سوال پیدا ہوا تو بعض روشن خیال دانشوروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ شریعت کے ادارے کو پارلیمنٹ سے بالاتر تسلیم کرنا پارلیمنٹ کی توہین ہے اور اس کی بالادستی کو مجروح کرنا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ارکان متفقہ طور پر کوئی قانون وضع کر دیں تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

گورایہ صاحب بھی شریعت کے مقابلہ میں ”عوام کے منتخب نمائندوں“ کی بالاتر حیثیت ہی کو منوانا چاہتے ہیں۔ الغرض خلافت کے بجائے جمہوریت کو ”روح اسلام“ کے عین مطابق کہنا صریحاً غلط ہے۔

ثالثاً : کیا جمہوریت واقعی جمہوریت ہے؟

گزشتہ معروضات سے معلوم ہوا ہو گا کہ جمہوریت کابت مغرب کے سومات میں تراشا گیا ہے جس کی ”عوام“ اور ”عوامی نمائندگی“ کے حوالے سے خوب نمائش ہی نہیں، بلکہ پرستش کی جاتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت کے نام سے عوام کا جس قدر استحصال کیا جاتا ہے اس کی مثالیں شاید دور ملکیت میں بھی مل سکیں گی۔ جمہوری نظام میں عوام کے نمائندے، حوالہ تو عوام کی خواہشات کا دیتے ہیں، لیکن واقعہ انہیں عوام کی رائے کا کوئی احترام نہیں ہوتا، بلکہ وہ رائے عامہ کے

خلاف من مانیاں کرتے ہیں، اس کی واضح مثال ”مسلمانوں کا عائلی قانون“ ہے جو ایوب خان کے دور سیاہ میں جبر و استبداد کے ذریعہ عوام پر مسلط کیا گیا۔ اور بعد میں ”عوامی نمائندوں“ نے اس کو منظور کر لیا۔

پاکستان کے عوام کی اکثریت اس قانون کو غلط سمجھتی ہے لیکن ارباب اقتدار اور ”عوام کے نمائندوں“ نے عوام کی کثرت رائے کا کبھی احترام نہیں کیا۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ پاکستان کی ۹۵ فیصد اکثریت فقہ حنفی پر عمل پیرا ہے۔ اگر جمہوریت کے پجاریوں اور عوام کے نام نہاد نمائندوں کو عوام کی کثرت رائے کا ذرا بھی احترام ہوتا تو وہ فوراً فقہ حنفی کا نفاذ کر دیتے۔ مگر آج تک کسی کو نہ عوام کے ایمان و عقیدہ کا خیال آیا، اور نہ عوام کی رائے کو لائق احترام سمجھا گیا۔ میں جناب گورایہ صاحب سے دریافت کرتا ہوں کہ پاکستان کے ۹۵ فیصد عوام کے مسلک و عقیدہ اور اس کی رائے اور خواہش کو چالیس سال تک مسلسل ٹھکراتے چلے آنا آخر جمہوریت کی کون سی قسم ہے؟ اور آنجناب اسمبلیوں کو ”تعبیر شریعت کا اختیار“ دینے کا جو فلسفہ تراش رہے ہیں کیا پاکستان کی ۹۵ فیصد رائے عامہ نے آپ کو اس کا اختیار دیا ہے؟ کیا یہی جمہوریت ہے جس میں ۹۵ فیصد عوام کی رائے کا کوئی احترام نہیں کیا جاتا، اور ”فرقہ واریت“ کا طعنہ دے کر اسے پامال کر دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ”جمہوریت“ یا ”سلطانی جمہور“ کا نعرہ محض عوام کو دھوکہ دینے اور ان کو سبز باغ دکھا کر اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ جمہوریت کے پجاریوں کے دل میں ”جمہور کی رائے“ ان کے عقیدہ و ایمان اور ان کے مسلک و مشرب کا کوئی احترام نہیں۔ گویا جمہوریت وہ ہاتھی ہے جس کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور ہیں۔ اسکا ظاہر زن بازاری کی طرح عشوہ طراز ہے۔ مگر اس کا باطن گندگیوں سے لبریز۔

موجودہ جمہوریت کا طرز انتخاب بھی جمہوری نہیں۔ بلکہ یہ ایک مختصر سی اقلیت کو عوام کی گردنوں پر مسلط کرنے کی سازش ہے۔ اس کی مثال میں بھٹو صاحب کی ”عوامی جمہوریت“ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ بھٹو صاحب کو مشرقی پاکستان میں ایک ووٹ بھی نہیں ملا تھا اور مغربی پاکستان میں ”عوام“ عوام“ کے مسلسل نعروں کے باوجود انہیں ۳۳ فیصد ووٹ مل سکے۔ گویا ۳۳ فیصد رائے دہندگان کے نمائندوں کی ایک مختصر سی اقلیت کو آٹھ کروڑ عوام کی تقدیر سے کھیلنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اور پھر اس دور میں عوام کی جو گت بنائی گئی۔ جس طرح شرفا کی عزت و آبرو پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ اور عوام کو سیدھا کرنے کے لئے جس طرح ”دلائل کیپ“ کھولے گئے اس کی کہانی عوام کو کبھی نہیں بھولے گی۔ فرمایا جائے کہ کیا ”جمہوریت“ اسی کا نام ہے؟ اور یہی جمہوریت ہے جسے گورایہ صاحب روح اسلام کے عین مطابق قرار دے رہے ہیں؟

رابعاً: مصطفیٰ کمال کا اقدام روح اسلام کے عین مطابق؟

جناب گورایہ صاحب ”جمہوری اجتہاد“ کے شوق میں ترکی کے مصطفیٰ کمال کے اقدام کو حق و صواب اور روح اسلام کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، شاید انہیں لیلائے جمہوریت کے عشق میں مصطفیٰ کمال کے وہ سیاہ کارنامے یاد نہیں رہے جو اس نے جمہوریت کے نام پر انجام دیئے، مثلاً :

۱: — خلافت اسلامیہ کا الغا، جس سے پورا عالم اسلام لرز گیا، اور اسلام کے ازلی دشمنوں کے گھر میں گھی کے چراغ جلے۔

۲: — اسلامی قانون کو معطل کر کے اس کی جگہ مغربی قانون کا نفاذ۔

۳: — عربی رسم الخط پر پابندی اور اس کی جگہ رومن رسم الخط کا جاری کرنا۔

۴: — دینی مدارس اور تکیوں کی منسوخی، دینی علوم کی تعلیم پر پابندی اور اسے لائق تعزیر جرم قرار دینا۔ اس زمانے کے ایک ترک عالم نے بتایا کہ مصطفیٰ کمال کے زمانے میں انہوں نے گھوڑوں کے اصطبلوں میں صحیح بخاری کا درس دیا۔

۵: — اسلامی شعائر کا اظہار ممنوع، حتیٰ کہ اذان پر بھی پابندی۔

۶: — خواتین کے شرعی پردہ پر پابندی عائد کی گئی، اور عورتوں کا بے پردہ مغربی لباس میں نکلنا لازم قرار دیا گیا۔

۷: — ترکی کے قومی لباس کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور مغربی لباس کا پہننا لازم قرار دیا گیا۔

۸: — لاکھوں علما و صلحا کو تہ تیغ کیا گیا، اور لاکھوں کو جلا وطن کیا گیا۔ مختصر یہ کہ کیونسٹوں کے ہاتھوں سمرقند و بخارا میں اسلام اور مسلمانوں پر جو گزری وہی مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی میں اسلام اور مسلمانوں کا حشر ہوا۔ اگر ترکی قوم کے دل کی گہرائیوں میں ایمان و عقیدہ پیوست نہ ہوتا تو اندیشہ تھا کہ مصطفیٰ کمال کے ہاتھوں ترکی دوسرا سپین بن جاتا۔ جو شخص مصطفیٰ کمال کے اس ذہنی ارتداد والحاد کو ”صحیح اجتہاد“ قرار دیتا ہے اور اسے روح اسلام کے عین مطابق قرار دیتا ہے، خود اس کا اسلام سے رشتہ مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علم و فہم، عقل و دانش اور عقیدہ و ایمان کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اسلام کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ رضا با کفر کفر ہے۔ جو شخص مصطفیٰ کمال کے ان صریح کفریات کو ”اجتہاد صحیح“ قرار دیتا ہو، اور انہیں ”روح اسلام“ کے عین مطابق بتاتا ہو اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے۔

(بینات شعبان سنہ ۱۴۰۷ھ)

پارلیمنٹ اور اجتہاد :

گورایہ صاحب کے نزدیک تعبیر شریعت کا نام اجتہاد ہے۔ ان کے نزدیک یہ کام نہ مولوی ملا کا ہے نہ ائمہ مجتہدین کا۔ بلکہ یہ اختیار صرف اور صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے، انہوں نے اپنے اس مضمون میں اس فقرے کو بار بار دہرایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ”شریعت بل“ کی تحریک سے حد درجہ لرزاں و ترساں ہیں اور انہیں یہ شدید خطرہ لاحق ہے کہ کہیں چالیس سال کے بعد پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ نہ ہو جائے۔ چنانچہ ”تعبیر شریعت“ پارلیمنٹ کا اختیار کے تحت لکھتے ہیں :

”اسلامی ریاست کی منتخب مقننہ کا بنیادی فریضہ تعبیر شریعت

ہے۔ اس وقت یہی سب سے اہم مسئلہ قوم کو درپیش ہے کہ

شریعت کی تعبیر کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ کیا فقہی مسلکوں کو

حاصل ہے؟ یا تعبیر شریعت کا اختیار منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے؟

تعبیر شریعت ہی کا اسلامی نام اجتہاد ہے۔“

”تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں؟“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :

”علامہ اقبال کا جواب نہایت واضح اور دو ٹوک ہے۔ ان کے

ز نزدیک اب وقت آگیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں

سے اختیار اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ قانون ساز

اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فرقے دور

ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں۔ اب جمہوریت کا دور ہے۔“

آگے لکھتے ہیں :

”اب وقت آگیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں

کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے، جو اس کی جائز اور اصل حقدار ہے، وہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس حق کا استعمال کرے۔“

گے لکھتے ہیں :

” علامہ اقبال کا اجتہاد غیر مبہم ہے، عہد جدید میں تعبیر شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے، ان کے اس اجتہاد کے دو بڑے سبب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں۔۔۔۔۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے۔ خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا، بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔“

پارلیمنٹ خدا کی نمائندگی کرتی ہے یا عوام کی؟

گورایہ صاحب فرماتے ہیں کہ تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا انتخاب عوام کرتے ہیں، اور وہ عوام ہی کی نمائندگی کرتی ہے، جب کہ ”شریعت“ عوام کا وضع کردہ قانون نہیں، بلکہ حضرت حق جل شانہ کا نازل کردہ قانون عدل ہے۔ اور ”تعبیر شریعت“ کے معنی ہیں حق تعالیٰ شانہ کے نازل کردہ قانون کی تشریح میں حق تعالیٰ شانہ کی نمائندگی کرنا۔ گویا ”تعبیر شریعت“ حق تعالیٰ شانہ کی ترجمانی و نمائندگی کا نام ہے۔ اس کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ترجمانی کا اہل ہو۔ عوام نے اپنے ذوق و معیار کے مطابق جن

نمائندوں کو منتخب کیا وہ عوام کی نمائندگی تو کر سکتے ہیں، مگر حق تعالیٰ شانہ کی ترجمانی و نمائندگی کا حق انہیں کیسے حاصل ہو گیا؟ اس کا حق تو اسی کو حاصل ہے جس پر حق تعالیٰ شانہ کی نظر انتخاب واقع ہوئی ہو، اور اسے ان صلاحیتوں سے آراستہ کر دیا گیا ہو جن کی اس ترجمانی کے لئے ضرورت ہے۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :

ولما كان التبليغ عن الله سبحانه يعتمد العلم بما يبلغ والصدق فيه لم تصلح مرتبة التبليغ بالرواية والفتيا الا لمن اتصف بالعلم والصدق فيكون عالما بما يبلغ صادقاً فيه ويكون مع ذلك حسن الطريقة مرضى السيرة عدلاً في اقواله وافعاله متشابه السر والعلانية في مدخله ومخرجه واحواله واذا كان منصب التوقيع عن الملوك بالمحل الذي لا ينكر فضله ولا يجهل قدره وهو اعلى المراتب السنيات فكيف بمنصب التوقيع عن رب الارض والسماوات؟

(اعلام الموقعين ج ۱ ص ۱۰)

ترجمہ: چونکہ حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے بات پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ پہنچانے والا اس کا علم بھی رکھتا ہو اور اس میں سچا بھی ہو، اس لئے خواہ یہ تبلیغ بطور روایت ہو، یا بصورت فتویٰ، اس کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو علم و صدق کے ساتھ موصوف ہو تاکہ جس چیز کی وہ ترجمانی کر رہا ہے اس کا علم بھی رکھتا ہو اور اس

میں سچائی بھی ہو، اور اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ اس کی روش خوب اور اس کی سیرت پسندیدہ ہو، وہ اپنے اقوال و افعال میں عادل ہو اور تمام جلی و خفی امور و احوال میں اسکا ظاہر و باطن یکساں ہو، اور جب کہ بادشاہوں کی ترجمانی کا منصب ایسا عالی شان ہے کہ اس کے فضل و کمال کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس کی قدر و منزلت سے کوئی ناواقف نہیں اور وہ بلند مناصب میں سے اعلیٰ ترین منصب شمار کیا جاتا ہے تو زمین و آسمان کے مالک کی ترجمانی کے منصب کی بلندی و نزاکت کا کیا عالم ہوگا؟

جناب گورایہ صاحب کی غلط فہمی یا مغالطہ اندازی کا منشا یہ ہے کہ نفسیاتی اصول کے مطابق آدمی اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اور وہ اپنے ماحول کے اثرات سے خالی الذہن نہیں ہو سکتا، دور جدید میں قانون سازی کا کام پارلیمنٹ کرتی ہے اور پارلیمنٹ سے بالا کسی ادارے کا تصور ہی دور جدید کی جمہوریت میں نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ قانون سازی کا کام عوام کا منتخب ادارہ کرتا ہے جسے عربی میں ”التشریع“ کہا جاتا ہے، اس سے گورایہ صاحب نے یہ نظریہ اختراع کر لیا کہ ”شریعت کی تعبیر“ کا حق بھی عوام ہی کے منتخب نمائندوں کو ہے، حالانکہ بہت موٹی سی بات ہے کہ جس کی شریعت ہے، اسی کی طرف سے نمائندگی کی سند درکار ہے، عوام کی نمائندگی کی سند پر خدا کی شریعت کی تعبیر کا اختیار قطعاً لغو و باطل ہے۔ عوام کا نمائندہ، خدا کا نمائندہ نہیں کہ اسے عوام کی نمائندگی کی بنا پر تعبیر شریعت کا حق مل جائے۔

البتہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی سہولت کے لئے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، اس لئے انتظامی امور میں مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکومت قانون سازی کر سکتی ہے اور پارلیمنٹ کو بھی یہ اختیار ہے، مگر ”تعبیر شریعت“

سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

تعبیر شریعت کا اختیار پارلیمنٹ کو کیوں

اس عنوان کے تحت گورایہ صاحب نے فقہی مسالک کے بجائے پارلیمنٹ کو تعبیر شریعت کا حق دینے کی دو وجہیں ذکر کی ہیں :

”پہلی وجہ یہ کہ فرقے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں اور اب جمہوریت کا دور ہے، چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے بعد عہد بنو امیہ میں اور بعد میں عہد بنو عباس میں تعبیر شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ تعبیر شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے، جو اس کی اصل اور جائز حق دار ہے۔ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اس حق کا استعمال کرے۔“

دوسری وجہ یہ ہے کہ متحارب فرقوں کی موجودگی میں عہد جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی طریقے سے قانون سازی میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جاسکتا ہے، کیونکہ عوام ”ریاست“ اور معاشرے کے معاملات میں گہری بصیرت کے مالک ہوتے ہیں، اور ان کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے جان اور بے نتیجہ رہتی ہے۔“

ان دو وجہوں کے ذکر کرنے کے بعد بھی گورایہ صاحب کا ضمیر اپنی بات پر مطمئن نہیں ہوتا، اس لئے وہ علامہ اقبال کے حوالے سے دوبارہ اس کے دو اسباب بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

”علامہ کا اجتہاد غیر مبہم ہے، عہد جدید میں تعبیر شریعت کا اختیار صرف اور صرف منتخب قومی اسمبلی کو حاصل ہے، ان کے اس ”اجتہاد“ کے دو بڑے سبب ہیں :

پہلا سبب یہ ہے کہ فقہی مسئلوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں، کیونکہ پوری قوم کی شریعت ایک ہے جب کہ وہ ایک شریعت کی بجائے مختلف اور متخارب فقہوں کے نمائندے ہیں، وہ اپنے فرقے کے لئے اپنی فقہ کی تعبیر تو کر سکتے ہیں مگر پوری قوم کے لئے شریعت کی تعبیر نہیں کر سکتے۔

”دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے، خدا نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا، بلکہ اس کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے۔ عہد رسالت میں حضور رسول اکرم ﷺ ریاستی امور، حکومتی معاملات اور معاشرتی و معاشی اداروں کی تشکیل میں عوام کی رائے معلوم فرماتے تھے ”وشارہم فی الامر“ (قرآن-۵۹/۳) (اور حکومت میں آپ ﷺ ان سے مشورہ لیں) کا یہی مفہوم ہے۔ اس قرآنی اصول پر مبنی نظام حکومت ”وامرہم شوریٰ بینہم“ (قرآن ۳۸-۳۲) (ان کے امور حکومت باہم مشورے سے طے پاتے ہیں) سے یہی مراد ہے۔ یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے۔“

اس تقریر میں گورایہ صاحب نے ان جیلوں بہانوں کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، جن کو ہمارا تجدد پسند طبقہ قید شریعت سے آزادی کے لئے استعمال کرنے کا خوگر ہے۔ گورایہ صاحب نے اس طویل اقتباس میں اپنے قارئین کو (بلکہ خود اپنے نفس کو بھی)

جو جو مغالطے دینے کی کوشش کی ہے ذرا ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے :

اولاً : کیا فقہی مسلک فرقے ہیں؟

گورایہ صاحب کا پہلا مغالطہ یہ ہے کہ وہ گمراہ فرقوں کو اور اہل حق کے فقہی مسالک کو ایک ہی ترازو سے تولتے ہیں اور سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں حالانکہ فقہی مسالک یا مکاتب فکر فرقے نہیں، بلکہ اہل سنت والجماعت ہی کی شاخیں ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد تھے ان کے درمیان کوئی اعتقادی و نظریاتی اختلاف نہیں تھا وہ سب دین حق کے پرستار تھے، لیکن فروعی مسائل میں اجتہادی اختلاف ان اکابر میں بھی پایا جاتا تھا، لیکن ان اجتہادی و فروعی اختلافات کے باوجود وہ سب ایک ہی ”جماعت“ تھے، بعد میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی کے زمانے میں نئے نئے نظریات نے سر اٹھانا شروع کیا اور بدعتی عقائد اور منحرف نظریات کی بنیاد پر مختلف فرقے منظم ہونے لگے۔ مثلاً خوارج، شیعہ، مرجیہ اور قدریہ وغیرہ۔۔۔۔۔ صحابہ کرامؓ اور اکابر تابعین نے ان سے بیزاری کا اعلان کیا، ان سے مباہلے کئے، بعض اوقات قتل و قتال کی نوبت آئی، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قدریہ سے اظہار برأت کرنا صحیح مسلم میں موجود ہے :

قال اذا لقيت اولئك فاخبرهم اني بري

منهم وانهم براء مني، والذي يحلف به عبد الله بن

عمر لو ان لاحدكم مثل احد ذهباً فانفقها ما

قبل الله منه حتى يومن بالقدر.

(صحیح مسلم ص ۲۷ ج ۱)

ترجمہ: ”فرمایا“ جب تو ان سے ملے تو ان کو بتا دینا کہ میں ان سے
بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں اور عبد اللہ بن عمر جس چیز کی قسم
کھاتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اگر احد پہاڑ کے برابر
سونا بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے
قبول نہیں فرمائیں گے جب تک کہ تقدیر پر ایمان نہیں لاتا۔“

اور خارجیوں سے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتل کرنا تاریخ کا
معروف واقعہ ہے اور ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
يقول سيخرج قوم في آخر الزمان حداث
الاسنان سفها الا حلام يقولون من قول خير
البريم

لا يجاوز ايمانهم حناجرهم يمرقون من
الدين كما يمرق السهم من الرمية فاينما
لقيتموهم فاقتلوهم فان في قتلهم اجرا لمن
قتلهم يوم القيامة

(صحیح بخاری ص ۱۰۲۳ ج ۲)

ترجمہ: ”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے
سنا کہ آخری زمانے میں کچھ لوگ نکلیں گے جو نو عمر اور کم عقل
ہوں گے اور وہ بہترین باتیں کریں گے۔“

لیکن ان کا ایمان طلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ دین سے
اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے تم ان کو

جہاں بھی پاؤ قتل کرو، کیونکہ ان کے قتل میں اس شخص کو قیامت کے دن اجر ملے گا جو انہیں قتل کرے گا۔

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول
یخرج فی هذه الامة ولم یقل منها قوم تحقرون
صلواتکم مع صلواتہم یقرؤن القرآن لا یجاوز
حلوقہم او حناجرہم یمرقون من الدین کمروق
السهم من الرمیۃ
(ایضاً)

ترجمہ : ”میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ اس امت میں اور یہ نہیں فرمایا کہ اس امت سے ایک قوم نکلے گی کہ تم اپنی نماز کو ان کی نماز کے مقابلہ میں ہیچ سمجھو گے وہ قرآن پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے نکل جاتا ہے۔“

اور شیعہ روافض کے ہر اول دستہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آگ میں جلانا بھی مشہور واقعہ ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے :

انی علی بزنا دقة فاحرقہم فبلغ ذلک ابن
عباس فقال وکنت انا لم احرقہم لنہی رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تعذبوا بعذاب اللہ
ولقتلہم لقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
من بدل دینہ فاقتلوم۔ (صحیح بخاری ص ۴۲۳ ج ۱ ص ۱۰۲۲ ج ۲)

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چند زندیق لائے گئے، آپ نے ان کو آگ میں جلادیا، حضرت ابن عباسؓ کو یہ بات پہنچی تو فرمایا اگر میں ہوتا تو ان کو جلاتا نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی کو عذاب نہ دو، میں ان کو قتل کرا دیتا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے جس نے اپنا دین تبدیل کر لیا (یعنی اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا) اسے قتل کر دو۔“

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اطلاع پہنچی کہ کچھ لوگ ان کو (حضرت علیؓ کو) حضرات شیخینؓ پر فضیلت دیتے ہیں، آپ یہ سن کر ممبر پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

بلغنی ان اقواما یفضلونی علی ابی بکر
وعمر ولو کنت تقدمت فیہ لعاقبت فیہ فمن
سمعتہ بعد هذا الیوم یقول هذا فهو مفتر۔ علیہ
حد المفتری ثم قال ان خیر هذه الامة بعد
نبیہا ابو بکر ثم عمر، ثم اللہ اعلم بالخیر بعد۔
قال وفی المجلس الحسن بن علی فقال واللہ!
لو ستمی الثالث، ستمی عثمان۔

(ازالة الخفا فارسی ص ۳۱۷ ج ۱)

ترجمہ: ”مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کچھ لوگ مجھے ابو بکر و عمر پر فضیلت دیتے ہیں، اگر میں نے پہلے اس سلسلہ میں تنبیہ کر دی ہوتی تو میں انہیں اس پر سزا دیتا، پس آج کے بعد اگر میں نے کسی کو یہ بات

کہتے ہوئے سنا تو وہ مفتری ہے اور اس پر مفتری کی سزا (اسی کوڑے) جاری ہوگی پھر فرمایا اس امت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر ابو بکرؓ ہیں، پھر عمرؓ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون بہتر ہے، راوی کہتے ہیں کہ مجلس میں حضرت حسن بن علیؓ بھی موجود تھے انہوں نے فرمایا بخدا! اگر آپ تیسرے کا نام لیتے تو حضرت عثمانؓ کا نام لیتے رضی اللہ عنہم۔“

الغرض ان فرق باطلہ کے ابتدائی دور ہی میں حضرت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان پر شدید نکیر فرمائی، فمائش بھی کی، اور سزائیں بھی دیں، مگر چونکہ ان فرقوں کی بنیاد اخلاص و للہیت پر نہیں تھی اسلئے اس فمائش اور نکیر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ یہ فرقے امت مسلمہ میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے اور بہت سے کم فہم افراد کو اپنا صید زبوں بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان تمام فرقوں کے مقابلہ میں آنحضرت ﷺ کی پیگشائی کے مطابق امت مسلمہ کی بھاری اکثریت آنحضرت ﷺ کے خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ پر قائم رہی، اور گمراہ فرقوں سے امتیاز کے لئے انہوں نے اپنا لقب ”اہل سنت والجماعت“ رکھا چنانچہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

لا يزال من امتي امة قائمة بامر الله
لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى ياتي
امر الله وهم على ذلك۔

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۵۸۳)

ترجمہ: ”میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے صحیح حکم پر قائم رہے گی، جو شخص ان کا ساتھ نہ دے یا ان کی مخالفت

کرے وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے
گا اور وہ اس پر قائم ہوں گے۔“

ایک اور حدیث میں ہے :

ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتين
وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة
كلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا من هی یا
رسول الله؟ قال ما انا علیه واصحابی-

(رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۳۰)

ترجمہ: ”بنو اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے اور میری امت ۷۳
فرقوں میں بٹے گی، یہ سب کے سب سوائے ایک کے جہنم میں
جائیں گے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ نجات پانے والا فرقہ کون سا
ہے؟ فرمایا جو لوگ اس راستہ پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں اور
میرے صحابہ ہیں۔“

ایک اور حدیث میں ہے :

اتبعوا السواد الا عظم فانہ من شد شد فی
النار-

(رواہ الترمذی۔ مشکوٰۃ ص ۳۰)

ترجمہ: ”سواد اعظم کا ساتھ دو کیونکہ جو شخص ان سے الگ ہوا وہ
دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔“

اور نبج البلاغہ جلد دوم ص ۱۱ میں ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا :

سیہلک فی صنفان محب مفرط ینذهب بہ

الحب الى غير الحق ومبغض مفرط يذهب به
 البغض الى غير الحق وخير الناس قى حالا
 النمط الا وسط فالزموه والزموا السواد الاعظم
 فان يد الله على الجماعة واياكم والفرقة فان
 الشاذ من الناس للشيطان كما ان الشاذ من
 الغنم للذئب الا من دعا الى هذا الشعار
 فاقتلوه ولو كان تحت عما متى هزم

(نسخ البلاغ جلد دوم ص ۱۱)

ترجمہ: ”عنقریب میرے متعلق دو قسم کے لوگ ہلاک ہوں گے
 ایک محبت کرنے والا، حد سے بڑھ جانے والا جس کو محبت خلاف حق
 کی طرف لے جائے، دوسرا بغض رکھنے والا، حد سے کم کرنے والا۔
 جس کو بغض خلاف حق کی طرف لے جائے، اور سب سے بہتر حال
 میرے متعلق درمیانے گروہ کا ہے، (جو نہ زیادہ محبت کرے نہ بغض
 رکھے) پس اس درمیانی حالت کو اپنے لئے ضروری سمجھو اور سواد
 اعظم یعنی بڑی جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کا ہاتھ جماعت پر
 ہے اور خبردار جماعت سے علیحدگی نہ اختیار کرنا کیونکہ جو انسان
 جماعت سے الگ ہو جاتا ہے وہ شیطان کے حصہ میں بن جاتا ہے
 جیسے کہ گلہ سے الگ ہونے والی بکری بھیڑیے کا حصہ بنتی ہے، آگاہ
 ہو جاؤ! جو شخص تم کو جماعت سے الگ ہونے کی تعلیم دے اس کو
 قتل کر دینا اگرچہ وہ میرے اس عمامہ کے نیچے ہو۔“

الغرض گمراہ فرقے اپنی اپنی خواہشات و بدعات کو لے کر سواد اعظم سے الگ

ہوتے رہے، لیکن امت کی غالب اکثریت صحابہؓ و تابعینؓ کے عقائد حقہ سے وابستہ رہی اور ”اہل سنت والجماعت“ کے لقب سے ملقب ہوئی، انہی اہل سنت میں ائمہ فقہاء ہوئے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، پس اہل حق اور اہل باطل کو ایک ہی ترازو سے تولنا اور ائمہ مجتہدینؒ اور ان کے متبعین کو بھی باطل فرقوں کی صف میں شامل کر دینا ایک ایسا ظلم ہے جس کی توقع کسی صاحب فہم و انصاف سے نہیں کی جانی چاہئے۔

فرقہ واریت کا مسئلہ

ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کا ذہن جن بہت سے مسائل میں الجھا ہوا ہے ان میں سے ایک ”فرقہ واریت“ کا مسئلہ ہے، ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ اسلام میں فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں، اور چونکہ یہ فرقے ملوکیت کے دور کی پیداوار ہیں اس لئے ہمیں فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر اسلام سے رشتہ جوڑنا چاہئے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا یہ طبقہ تمام جماعتوں اور فرقوں کو یکساں نفرت کا مستحق سمجھتا ہے، مگر یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے، میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں چند نکات لکھ دوں، ممکن ہے کسی صاحب فہم و دانش کی غلط فہمی دور ہو سکے۔ وباللہ التوفیق۔

۱: — اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بہت سی جگہ تفرق و افتراق (فرقہ واریت) کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً :

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا
واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف
بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً۔ الایم۔

(آل عمران - ۱۰۳)

ترجمہ: ”اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی، سب مل کر، اور پھوٹ نہ

ڈالو، اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر، جب کہ تھے تم آپس میں
دشمن، پھر الفت دی تمہارے دلوں میں، اب ہو گئے اس کے فضل
سے بھائی (بھائی)۔“

(ترجمہ شیخ الہند)

ولا تكونوا کا لذين تفرقوا واختلفوا من
بعدهما جاء هم البينات۔
(آل عمران-۱۰۵)

ترجمہ: ”اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے
لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم صاف۔“

ان الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعا لست
منهم في شيء انما امرهم الى الله الخ
(الانعام-۱۵۹)

ترجمہ: ”جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں، اور ہو گئے بہت
سے فرقے، تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا کام اللہ ہی کے
حوالے ہے۔“

ولا تكونوا من المشركين من الذين
فرقوا دينهم وكانوا شيعا، كل حزب بما لديهم
فرحون۔
(الروم-۳۲)

ترجمہ: ”اور مت ہو شرک کرنے والوں میں، جنہوں نے پھوٹ
ڈالی اپنے دین میں، اور ہو گئے ان میں بہت فرقے، ہر فرقہ جو اس
کے پاس ہے اس پر فریفتہ ہے۔“

۲ : _____ لیکن اسی کے ساتھ یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ لوگ ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ اختلاف اور تفرقہ کی بیماری ان میں سرایت کر جائے گی، اور حق تعالیٰ شانہ کی تکوینی حکمت و مشیت ان میں جاری ہو کر رہے گی۔
حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :

لو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة
ولا يزالون مختلفين الا من رحم ربك ولذلك
خلقهم وتمت كلمة ربك لا ملئ جهنم من الجنة
والناس اجمعين۔

(صود۔ ۱۱۸ و ۱۱۹)

ترجمہ: ”اور اگر چاہتا تیرا رب (تو) کر ڈالتا لوگوں کو ایک رستہ پر،
اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں، مگر جن پر رحم کیا تیرے رب نے
اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی بات تیرے رب کی
کہ البتہ بھر دوں گا دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے۔“

(ترجمہ شیخ الہند)

۳ : _____ اور اس اختلاف و تفرق کا منشا، خواہشات کا اختلاف ہے کیونکہ ہر فرقہ
اپنی خواہشات کے رنگ میں دین کو ڈھالنے کا متمنی ہے، حالانکہ دین حق لوگوں کی
نواہشات کا تابع نہیں، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے :

لو اتبع الحق اهواءهم لفسدت السموات
والارض ومن فيهن۔

(المومنون۔ ۷۱)

ترجمہ: ”اور اگر دین حق ان کے خیالات کے تابع ہو جاتا تو تمام

آسمان اور زمین اور جو ان میں آباد ہیں سب تباہ ہو جاتے۔“

(ترجمہ حضرت حکیم الامت تھانوی)

اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے :

فی رواية احمد وابی داود عن معاوية رضى
الله عنه : ثنتان وسبعون فى النار وواحدة فى
الجنة وهى الجماعة وانه سيخرج فى امتى
اقوام تنجارى بهم تلك الالهواء كما يتجارى
الكلب بصاحبه لا يبقى منه عرق ولا مفصل
الا دخله

(مشکوٰۃ - ص ۳۰)

ترجمہ : ”میری امت میں ۷۳ فرقے ہوں گے، ۷۲ دوزخ میں ہوں
گے اور ایک جنت میں اور یہ ”الجماعت“ یعنی برحق جماعت ہے اور
میری امت میں کچھ لوگ نکلیں گے جن میں خواہشات اور غلط
نظریات اس طرح سرایت کر جائیں گے جس طرح باؤلے کتے کے
کالے ہوئے شخص کی بیماری ہوتی ہے کہ اس کا کوئی جوڑ اور کوئی
رگ وریشہ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری سرایت نہ کر جاتی ہو۔“

۴ : — چونکہ ایسے فرقوں کا وجود میں آنا مقدر تھا، اس لئے امت کو ہدایات
دی گئی ہیں کہ ان نئے نئے خوشنما نظریات سے دھوکہ نہ کھائیں، بلکہ ”صحابہؓ کی
جماعت“ جس راستہ پر قائم رہی ہے، شدت کے ساتھ اسی پر قائم رہیں۔ چنانچہ ایک
حدیث میں ہے :

ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم

ياخذ الشاذة والقاصية والناحية واياكم
والشعاب، وعليكم بالجماعة والعامّة

(رواہ احمد۔ مشکوٰۃ ص ۳۱)

ترجمہ: ”شیطان“ انسان کا بھیڑیا ہے، جس طرح بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے، جو بکری ریوڑ سے الگ ہو جائے، دور رہ جائے یا ادھر ادھر ہو جائے بھیڑیا اسے اچک لیتا ہے، اس لئے گھاٹیوں سے بچو اور ”الجماعت“ اور عام امت (کے عقائد) کو لازم پکڑو۔“

ایک اور حدیث میں ہے :

من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة
الاسلام عن عنقه

(رواہ احمد و ابو داؤد۔ مشکوٰۃ ص ۳۱)

ترجمہ: ”جو شخص ”الجماعت“ سے جدا ہو گیا اس نے اسلام کا جوآ
اپنی گردن سے اتار پھینکا۔“

۵ : ----- یہ فرقے جو نئے نئے نظریات تراش کر ”الجماعت“ سے الگ ہو رہے

ہیں یہ لائق احترام نہیں بلکہ لائق سرزنش ہیں، چنانچہ ارشاد نبویؐ ہے :

من وقر صاحب بدعة فقد اعان على هدم
الاسلام

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلہ۔ مشکوٰۃ ص ۳۱)

ترجمہ: ”جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی عزت کی اس نے
دین اسلام کو ڈھالنے میں مدد دی۔“

ان تمام ارشادات کو مجموعی طور پر سامنے رکھنے کے بعد فرقہ واریت کے مسئلہ

میں حق و صداقت کی شاہراہ ہر صاحب فہم کے سامنے کھل جاتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

الف : ----- وہ فرقے تو بلاشبہ مذموم اور لائق نفرت ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ کے جاوہ مستقیم کو چھوڑ کر الگ الگ پگڈنڈیاں پکڑ لیں، لیکن اہل حق ”اہل سنت والجماعت“ جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے صحیح راستے پر قائم ہے، وہ نہ تو مذموم فرقہ بندی کے مجرم ہیں اور نہ ان کو یہ الزام دینا صحیح ہے۔

ب : ----- جب اہل باطل نے اہل حق سے الگ ہو کر فرقے پیدا کر لئے تو محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک سچے امتی کا فرض یہ ہے کہ وہ اہل حق کا ساتھ دے اس اختلاف و تفرقہ کی موجودگی میں یہ نظریہ پیش کرنا کہ ہمیں تمام فرقوں سے بالاتر ہو کر اسلام سے وابستہ ہونا چاہئے۔ قطعاً غلط اور باطل نظریہ ہے، کیونکہ حق و باطل کی جنگ میں جو شخص اہل حق اور اہل باطل دونوں سے علیحدگی اور برأت کا اعلان کرے وہ بھی اہل باطل کی صف میں شامل سمجھا جائے گا، اس لئے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا کہ ”اس نے اپنی گردن سے اسلام کا جو اُتار پھینکا“۔ جو شخص باطل فرقوں کے مقابلہ میں اہل حق کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسکو حق اور اہل حق سے کوئی تعلق نہیں، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا اسلام اور مسلمانی میں کیا حصہ ہوگا؟

ج : ----- جب یہ فرقے جنہوں نے شاہراہ اسلام کو چھوڑ کر ادھر ادھر کی گھاٹیوں میں پھیلنا شروع کر دیا اور جنہوں نے اختلاف و تفرقہ کی آری سے امت اسلامیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، گمراہ اور باطل ہیں تو ان کو مسند احترام پر بٹھانا اور قانون سازی تک میں ان کی رو رعایت کرنا اسلام کو ڈھادینے کے ہم معنی ہے،

کیونکہ جو شخص باطل و گمراہ فرقوں کو لائق احترام سمجھتا ہے وہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کی صلاحیت سے محروم ہے، اس کی مثال چوہڑے کے چہرے کی ہے، جو حلال و حرام کے درمیان تمیز نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ ایسا شخص حق سے غداری اور خدا و رسول سے بے وفائی کا مرتکب ہے۔

ثانیاً: کیا گمراہ فرقے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں؟

جناب گورایہ صاحب کا یہ کہنا بھی مغالطہ انگیز ہے کہ ”فرقے دور ملوکیت کی پیداوار ہیں“۔ کیونکہ اس فقرے کا متبادر مفہوم یہ ہے کہ ملوکیت نے گمراہ فرقوں کو جنم دیا، اور ملوکیت ہی ان فرقوں کو پروان چڑھانے کی ذمہ دار تھی، حالانکہ گمراہ فرقوں کا آغاز خلافت راشدہ میں ہو چکا تھا، جیسا کہ پہلے اوپر بتا چکا ہوں اور اب دور جمہوریت میں بھی گمراہ کن فرقوں کی نشو و نما کچھ کم نہیں ہو رہی، البتہ دور ملوکیت میں اور آج کے نام نہاد دور جمہوریت میں یہ فرق ضرور ہے کہ دور ملوکیت میں سلاطین عادل نے گمراہ فرقوں کا قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں چھوڑا، جس سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں، اور آج کے دور جمہوریت میں دین کے نام پر خواہ کوئی کتنی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا پھرے، اسے کوئی نہیں پوچھتا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ پرستاران جمہوریت کے اقتدار کو ذرا سا خطرہ لاحق ہو جائے تو حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آجاتی ہے، لیکن خدا اور رسول اور اسلام کے خلاف کوئی کیسے ہی باغیانہ افکار و خیالات کا اظہار کرے، ”جمہوریت“ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی، بلکہ ”آزادی خیال ہر فرد کا فطری حق ہے“ کا اصول تسلیم کر کے ہر کفر و الحاد کی کھلی چھٹی دیتی ہے، اکبر الہ آبادی کے بقول :

گورنمنٹ کی یارو خیر مناؤ
انا الحق کہو اور سولی نہ پاؤ

کاش گورایہ صاحب نے دور ملوکیت کو فرقہ بندی کا طعنہ دینے سے پہلے بی
جمہوریت کا دامن فرقہ بندی کی لعنت سے پاک کر دیا ہوتا۔

مثلاً: کیا تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے؟

گورایہ صاحب کے استدلال کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انہی کے بقول:

”اسلام میں اختیار تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے، خدا

نے یہ اختیار کسی فرد یا طبقے کو تفویض نہیں کیا، بلکہ اس کا اختیار

پوری قوم کو دیا ہے۔“

یہ تو موصوف کا دعویٰ ہوا، ذرا اس دعویٰ کی دلیل بھی ملاحظہ فرمائیے اور

موصوف کی فہم و ذکا اور ان کے علم و فضل کی داد دیجئے، فرماتے ہیں:

”عہد رسالت میں رسول اکرم ﷺ ریاستی امور“

حکومتی معاملات اور معاشرتی اداروں کی تشکیل میں عوام کی رائے

معلوم فرماتے تھے، ”و مشاور ہم فی الامر“ (قرآن-۳-۱۹۵)

(امور حکومت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مشورہ

لیں) کا یہی مفہوم ہے۔ ”وامر ہم شوریٰ بینہم“

(۳۸-۳۲) ان کے امور حکومت باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں)

سے یہی مراد ہے، یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے۔“

ذرا گورایہ صاحب کی استدلالی منطق ملاحظہ فرمائیے۔ آپ دعویٰ تو یہ فرما رہے

ہیں کہ ”تعبیر شریعت کا اختیار کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بلکہ پوری قوم کو دیا گیا ہے۔“

اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ بحکم خداوندی فلاں فلاں امور میں

مشورہ فرمایا کرتے تھے، کیا گورایہ صاحب اپنے ”اَن پڑھ“ قارئین کو یہ سمجھانے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ عہد رسالت میں بھی تعبیر شریعت کا حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں، بلکہ یہ اختیار پوری قوم کو حاصل تھا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تعبیر شریعت کے لئے ”پوری قوم کی رائے“ کے محتاج اور اس کے پابند تھے؟ قارئین کرام ہی فرمائیں کہ کیا ایسا ”خوبصورت جھوٹ“ انہوں نے پہلے بھی کبھی سنا ہے؟ اور لطف یہ کہ اس سخن سازی کے لئے جناب گورایہ صاحب قرآن کریم کا حوالہ رقم فرما رہے ہیں، کیا اسی دروغ بانی اور سخن سازی کا نام ”اجتہاد مطلق“ ہے جس کی دعوت گورایہ صاحب ”قوم کے نمائندوں“ کو دے رہے ہیں؟

انا لله وانا اليه راجعون

اور پھر اس نکتہ پر بھی غور فرمائیے کہ دعویٰ تو یہ کیا جا رہا ہے کہ تعبیر شریعت کا حق اہل علم کو نہیں، بلکہ پوری قوم کو ہے، اور دلیل میں یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ بعض انتظامی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے، میں پوچھتا ہوں، کہ بعض ریاستی امور اور حکومتی معاملات میں مشورہ لینا یا دینا آپ کے نزدیک ”تعبیر شریعت“ ہے؟ کچھ تو غور فرمائیے کہ آپ دعویٰ کیا ہولناک فرما رہے ہیں اور اس کی دلیل کیا دے رہے ہیں؟ یہ خالص مغالطہ اور سفسطہ نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر کیا آپ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ”ریاستی امور“ حکومتی معاملات اور معاشرتی اداروں کی تشکیل کے دائرے میں بھی تمام امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ”پوری قوم“ سے رائے طلب فرماتے تھے؟ نہیں، بلکہ کیا آپ عہد نبوت کا ایک واقعہ بھی پیش فرما سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری قوم کے ایک ایک فرد سے رائے طلب فرمائی ہو؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف ایک غلط بات منسوب کرتے ہوئے آپ کو کچھ تو خدا کا خوف ہونا چاہئے۔ کیا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا :

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من

النار۔

(مشکوٰۃ۔ ص ۳۲)

ترجمہ: ”جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ فرمانے کی نوعیت

آنحضرت ﷺ بعض اہم امور میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ بھی فرماتے تھے لیکن یہ مشورہ ”تعبیر شریعت“ میں نہیں ہوتا تھا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ”تعبیر شریعت“ کا اختیار ”پوری قوم“ کو تھا، جیسا کہ گورایہ صاحب اپنے اجتہاد کے زور سے ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں، یہ مشورہ کبھی تو بعض ایسے انتظامی امور میں ہوتا تھا، جن میں صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی، اور کبھی ایسے اجتہادی امور میں ہوتا تھا، جن میں وحی کے ذریعہ کوئی خاص صورت معین نہیں کر دی جاتی تھی، یہ مباحثات کا دائرہ ہے کہ جس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ حکومت اس دائرے میں قانون سازی کر سکتی ہے، اور اس کے لئے اہل الرائے سے صلاح و مشورہ بھی کر سکتی ہے، لیکن ایسے امور میں مشورہ کرنے کا ”تعبیر شریعت“ سے کوئی تعلق نہیں، جس کے اختیارات گورایہ صاحب قومی اسمبلی کو تفویض فرما رہے ہیں۔

پھر اہل فہم جانتے ہیں کہ مشورہ اہل مشورہ سے لیا جاتا ہے، قوم کا ایک ایک فرد ایک ایک معاملے میں مشورہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ”لکل فن رجال“ تمام دنیا کا مسلمہ اصول ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ”پوری قوم“ سے مشورہ نہیں فرماتے تھے اور نہ قوم کو شریک مشورہ کرنے کے لئے اسے انتخابات کی بھٹی میں جھونکا جاتا تھا، بلکہ جو حضرات، جن امور میں بصیرت رکھتے تھے ان ہی سے مشورہ فرمایا جاتا تھا، ان میں حضرات شیخین ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تو آنحضرت ﷺ کے گویا مستقل وزیر و مشیر تھے، اور اہل مشورہ میں سرفہرست انہی کے اسمائے گرامی تھے، چنانچہ متدرک حاکم میں بسند حضرت ابن عباس ”ترجمان القرآن“ سے مروی ہے کہ آیت کریمہ ”وشاورہم فی الامر“ (آل عمران-۱۵۹) کی تفسیر میں فرمایا :

قال ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما :-

(ابن کثیر ص ۴۲۰ ج ۱)

ترجمہ :- ”اس سے مراد ابو بکر و عمر ہیں، رضی اللہ عنہما“۔

اور مسند احمد کی روایت میں ہے :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا بی

بکر وعمر لو اجتمعتما فی مشورۃ ما

خالفتما۔

(ایضاً حوالہ بالا)

ترجمہ :- ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات ابو بکر و عمر رضی

اللہ عنہما سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں جمع ہو جاؤ تو میں

تمہاری رائے کے خلاف نہیں کروں گا“۔

اسی طرح دیگر اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی بعض اہم امور میں مشورہ فرمانا ثابت ہے، بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے مبارک کے خلاف بھی صحابہؓ کے مشورہ کو قبول فرمایا۔ مثلاً جنگ احد میں آنحضرت ﷺ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر نہ لڑا جائے اور بعض صحابہؓ کی رائے تھی کہ ہمیں باہر نکلتا چاہئے، آپؐ نے اسی رائے کی موافقت فرمائی اس نوعیت کے بہت سے واقعات ہیں۔

اس میں علما کے دو قول ہیں کہ کیا مشورہ کرنا آپؐ پر لازم تھا یا نہیں؟ بہر حال لازم نہ ہو تب بھی آنحضرت ﷺ مشورے کا اہتمام ہمیشہ فرماتے تھے اور مشورہ کے بعد جو رائے اولیٰ و انسب ہوتی اسے اختیار فرمالیتے اور چونکہ آپؐ پر وحی الہی کا پہرہ تھا اس لئے اگر اختیار کردہ رائے لائق اصلاح ہوتی تو وحی الہی سے فوراً اس کی اصلاح کردی جاتی۔ آیت کریمہ ”وشاورہم فی الامر“ کا جناب گورایہ کے ہولناک دعوے سے کوئی تعلق نہیں ہے، قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ایسے لغو دعوے کرنا نہایت افسوس ناک ہے۔

وامرہم شوریٰ بینہم :

اسی طرح آیت کریمہ ” : وامرہم شوریٰ بینہم“ (الشوریٰ) کے حوالے سے یہ ثابت کرنا کہ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں بھی ”تعبیر شریعت کا اختیار پوری قوم کا حق تھا“ بالکل مہمل بات ہے، اس آیت کریمہ کا تعلق بھی اہم انتظامی امور سے ہے، جن میں سرفہرست خلیفہ کا انتخاب ہے کہ اس میں اہل مشورہ اور اہل حل و عقد سے مشورہ ضروری ہے۔

جہاں تک ”تعبیر شریعت“ کا تعلق ہے، اس میں حضرات خلفائے راشدینؓ کا

یہ دستور العمل تھا کہ سب سے پہلے کسی مسئلہ کا حکم کتاب و سنت سے تلاش کیا جاتا اور جب کوئی ایسا واقعہ پیش آتا جس کا حکم کتاب و سنت میں صراحۃً موجود نہ ہوتا تو فقہائے صحابہؓ کو جمع کر کے انہیں غور و فکر کی دعوت دی جاتی اور ان کے اجتماعی اجتہاد پر عمل کیا جاتا۔

حافظ ابن قیمؒ امام ابو عبید کی کتاب ”القضا“ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ :

وقال ابو عبید فی کتاب القضا : ثنا

کثیر بن ہشام عن جعفر بن برقان عن میمون

بن مهران قال : کان ابوبکر الصدیق اذا ورد

علیہ حکم نظر فی کتاب اللہ تعالیٰ فان وجد

فیہ ما یقضى به قضی به وان لم یجد فی کتاب

اللہ نظر فی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فان وجد فیہا ما یقضى به قضی به فان اعیاه

ذلک سال الناس : هل علمتم ان رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم قضی فیہ بقضاء؟ فربما

قام الیہ القوم فیقولون : قضی فیہ بكذا وكذا

فان لم یجد سنة سنہا النبی صلی اللہ علیہ

وسلم جمع رؤساء الناس فاستشارہم فاذا

اجتمع رایہم علی شیء قضی به وكان عمر

یفعل ذلک فاذا اعیاه ان یجد ذلک فی

الکتاب والسنة سال : هل کان ابو بکر قضی

فیہ بقضاء؟ فان کان لا بی بکر قضاء --- قضی

به، والا جمع علماء الناس واستشارهم، فاذا
اجتمع رأيهم على شيء قضى به۔

(اعلام الموقنین ص ۶۲ ج ۱)

ترجمہ: ”حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جب
ان کے سامنے کوئی قضیہ آتا اللہ تعالیٰ کی کتاب میں غور فرماتے، اگر
کتاب اللہ میں اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے
اور اگر کتاب اللہ میں نہ ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت
میں غور فرماتے، پس اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں
اس کا حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے اور اگر اس بارے
میں انہیں کسی سنت کا علم نہ ہوتا تو باہر نکل کر لوگوں سے دریافت
فرماتے کہ کیا آپ حضرات کو اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے کسی فیصلہ کا علم ہے؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کچھ حضرات
اٹھ کر بتاتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ فیصلہ
فرمایا تھا، پھر اگر کوئی سنت نہ ملتی تو ”رؤسا الناس“ کو جمع کر کے ان
سے مشورہ فرماتے، پس جب ان کی رائے کسی فیصلہ پر متفق ہو جاتی
تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا
دستور بھی یہی تھا (کہ پہلے کتاب اللہ میں حکم تلاش کرتے، پھر سنت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں) پس اگر کتاب و سنت میں اس کا
حکم نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ کیا ابو بکر رضی اللہ عنہ
نے اس بارے میں کوئی فیصلہ فرمایا تھا؟ پس اگر حضرت ابو بکر صدیق
رضی اللہ عنہ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے،

ورنہ لوگوں کے علما کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب ان کی رائے کسی فیصلہ پر متفق ہو جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔“

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرات خلفائے راشدینؓ کے دور میں ”پوری قوم“ کو ”تعبیر شریعت“ کا اختیار دینے کا دور دور بھی کہیں سراغ نظر نہیں آتا، اور نہ قوم کے منتخب نمائندوں کو قانون سازی کے اختیار کا کوئی سراغ ملتا ہے، اس دور میں امر منصوص میں کسی اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور غیر منصوص مسائل میں غور و فکر کرنے کے لئے رؤسا الناس کو جمع کیا جاتا تھا، جب کہ جناب گورایہ صاحب کی شریعت میں ”علما الناس“ کو اجتہاد کا اور دینی مسائل میں غور و فکر کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں، نہ وہ اجتہاد کے اہل ہیں :

ع بہ بین تفاوت راہ از کجا است تا کجا

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کی مقدس جماعت میں بھی ”صاحب فتویٰ“ معدودے چند حضرات ہی تھے، تمام صحابہؓ دینی مسائل میں انہی سے رجوع فرماتے تھے اور پیش آمدہ دینی مسائل میں انہی کی رائے طلب کی جاتی تھی، حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :

والذین حفظت عنہم الفتوی من اصحاب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مائة ونیف
وثلاثون نفسا، ما بین رجل وامراة وکان
المکثرون منهم سبعة : عمر بن الخطاب، وعلی
بن ابی طالب، وعبد اللہ بن مسعود، وعائشة ام
المومنین وزید بن ثابت، وعبد اللہ بن عباس
وعبد اللہ بن عمر۔

قال ابو محمد بن حزم : ويمكن ان يجمع
من فتوى كل واحد منهم سفر ضخم-

قال ابو محمد : والمتوسطون منهم فيما
روى عنهم من الفتيا : ابو بكر الصديق وام
سلمة و انس بن مالك و ابو سعيد الخدری و ابو
هريرة و عثمان بن عفان و عبد الله بن عمرو بن
العاص و عبد الله بن الزبير و ابو موسى
الاشعري و سعد ابن ابی وقاص و سلمان
الفارسي و جابر بن عبد الله و معاذ بن جبل
فهؤلاء ثلاثة عشر يمكن ان يجمع من فتيا كل
واحد منهم جزء صغير جدا و يضاف اليهم :
طلحة و الزبير و عبد الرحمن بن عوف و عمران
بن حصين و ابو بكرة و عبادة بن الصامت
ومعاوية بن ابی سفيان-

والباقون منهم مقلون في الفتيا لا يروى
عن الواحد منهم الا المسالة والمسالتان
والزيادة اليسيرة على ذلك يمكن ان يجمع
من فتيا جميعهم جزء صغير فقط بعد التقصي
والبحث وهم --- الخ (اعلام الموقنين ص ۱۲ ج ۱)

ترجمہ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے جن
حضرات کے فتاویٰ محفوظ ہیں ان کی کل تعداد مرد و عورت ملا کر ایک

سو تمیں سے زیادہ ہے، ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات بہ کثرت فتوے دیتے تھے :

عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبد اللہ بن مسعود، ام المومنین عائشہ صدیقہ، زید بن ثابت، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم۔ حافظ ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

اور مندرجہ ذیل حضرات فتویٰ میں متوسط تھے :

ابو بکر صدیق، ام سلمہ، انس بن مالک، ابو سعید خدری، ابو ہریرہ، عثمان بن عفان، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، عبد اللہ بن زبیر، ابو موسیٰ اشعری، سعد بن ابی وقاص، سلمان فارسی، جابر بن عبد اللہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم۔ یہ تیرہ حضرات تھے جن سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک چھوٹا سا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے، ان حضرات کی فہرست میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے مبارکہ کا اضافہ کیا جاسکتا ہے :

طلحہ، زبیر، عبد الرحمن بن عوف، عمران بن حصین، ابو بکرہ، عبادہ بن صامت، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم۔

اور باقی حضرات بہت کم فتویٰ دیتے تھے، ان حضرات میں سے صرف ایک دو مسئلے یا اس سے کچھ ہی زیادہ منقول ہیں اور تتبع تلاش کے بعد ان تمام حضرات کے فتاویٰ ایک چھوٹی کتاب میں جمع کئے جاسکتے ہیں اور ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (آگے ان کے ناموں کی فہرست درج کی ہے)۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ مقدس جماعت جن کے فضائل و مناقب قرآن و حدیث میں مذکور ہیں اور جن کی شان قیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نظر میں یہ تھی :

اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کانوا فضل هذه الامة ابرها قلوبا واعمقها
علما، واولها تکلفا اختارهم اللہ لصحبة نبیه
ولا قامۃ دینہ فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم علی
اثرهم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقهم
وسیرهم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم۔

(رواہ رزین مشکوٰۃ ص ۳۲)

ترجمہ: ”یہ محمد ﷺ کے صحابہ تھے جو اس پوری امت سے افضل تھے، ان کے دل سب سے پاک اور ان کا علم سب سے گہرا تھا، وہ تکلف میں سب سے کم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کی اقامت کے لئے چن لیا تھا پس ان کی فضیلت کو پہچانو، ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور جہاں تک ممکن ہو ان کے اخلاق و سیرت کو مضبوط تھام لو، کیونکہ وہ ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے۔“

یہ مقدس جماعت جو سراپا خیر اور مجسم ہدایت تھی ان میں بھی مجتہد معدودے چند حضرات ہی تھے، دینی مسائل میں انہی سے رجوع کیا جاتا تھا اور باقی تمام حضرات انہی کے فتاویٰ پر عمل فرماتے تھے، کسی کو کبھی وسوسہ بھی نہ آیا ہو گا کہ تعبیر شریعت چند افراد کا حق نہیں بلکہ یہ پوری قوم کا حق ہے، لیکن حیف! صد حیف!! کہ آج

پندرہویں صدی کے بگڑے ہوئے ماحول میں جو سرپا شرو ضلالت کا ماحول ہے، جناب گورایہ صاحب یہ ”درس اجتہاد“ دے رہے ہیں کہ اہل علم کے فتوؤں کی ضرورت نہیں، بلکہ تعبیر شریعت پوری قوم کا حق ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ سخن سازی کے زور سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہی سنت خلفائے راشدینؓ ہے۔ ”فیما لغربة الاسلام ولضیعة المسلمین۔“

کیا امت پارلیمنٹ کا نام ہے؟

ڈاکٹر گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

”قوم کو اللہ تعالیٰ نے تعبیر شریعت کا جو اختیار دیا ہے وہ اسے آزادانہ رائے سے ہی استعمال کر سکتی ہے جس کی عملی صورت یہ ہے کہ وہ آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخاب میں اپنے نمائندے منتخب کرے جو ان کی نمائندگی میں تعبیر نو کا فریضہ انجام دیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ان اللہ لا یجمع امتی علی الضلالة“ اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔“ (ترمذی، فتن، لزوم الجماعہ) تعبیر شریعت میں ایک فرد یا طبقہ گمراہی اختیار کر سکتا ہے، مگر پوری قوم گمراہ نہیں ہو سکتی۔“

گورایہ صاحب کا یہ ارشاد تو بالکل غلط بلکہ خالص جھوٹ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے تعبیر شریعت کا اختیار پوری قوم کو دیا ہے“ جیسا کہ اوپر تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں موصوف نے ایک نیا نکتہ ارشاد فرمایا ہے جو ان کے فہم

رسا کی منہ بولتی تصویر ہے وہ نکتہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ ”اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا“ اس میں امت سے مراد پارلیمنٹ ہے۔

موصوف کا استدلال یہ ہے کہ ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، مالکؒ اور ابن حنبلؒ کے فقہی مسائل تو ان کی ذاتی و انفرادی رائے ہیں اور فرد گمراہ بھی ہو سکتا ہے، پس چونکہ ان انفرادی آراء میں گمراہی کا احتمال ہے تو وہ لائق اعتبار نہ ہوں گے۔
چنانچہ گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

” فقہی مذاہب اپنی جامعیت کے باوجود، بہر حال انفرادی

تعبیرات ہیں اور حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔“

ادھر علمائے امت جو کچھ فرماتے ہیں وہ ایک طبقہ کی رائے ہے اور طبقہ گمراہ بھی ہو سکتا ہے لہذا علما بھی تعبیر شریعت کے اہل نہ ہوئے، کیونکہ اندیشہ گمراہی کی بنا پر وہ قابل اعتبار نہیں۔ چنانچہ گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

”فقہی مسلکوں کے افراد تعبیر شریعت کے اہل نہیں۔“

ہاں! پارلیمنٹ چونکہ پوری قوم کا نمائندہ ادارہ ہے لہذا وہ اس حدیث نبوی کا مصداق ہے کہ ”اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا“۔ یہ پارلیمنٹ کے افراد پر مشتمل امت چونکہ گمراہی سے قطعی محفوظ ہے لہذا شریعت کی تعبیر نو اسی کا حق ہے، یہ معصوم عن الخطا ادارہ جو اجتہاد بھی کر لے، جو فیصلہ صادر کرے، جو قانون بھی نافذ کرے، اور شریعت کی جیسی بھی ”تعبیر نو“ کرے وہ عین حق و صواب ہے، سرِ اہدایت ہے، اس میں نہ گمراہی کا احتمال ہے اور نہ غلطی کا شائبہ۔

گورایہ صاحب کے اس استدلال پر ہمیں داناؤں کا قول یاد آیا وہ فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے تصورات کا حدود اربعہ اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ چیونٹی

کے انڈے میں جو ننھا سا بچہ محبوس ہے وہ مسکین اپنی ذہنی سطح کے مطابق انڈے کے خول ہی کو زمین و آسمان سمجھتا ہے اگر اسے عقل و شعور ہو اور وہاں اسے بتایا جائے کہ یہ خول تو بہت ہی تنگ و تاریک جگہ ہے۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو تو معلوم ہو کہ تمہارے ہزاروں آسمان و زمین تو ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں سما سکتے ہیں تو وہ اس کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ اس کے ذہن میں انڈے کے خول سے ماوراء کسی زمین و آسمان کا تصور نہیں۔ ٹھیک یہی مثال گورایہ صاحب کے استدلال کی ہے، ان کے خیال میں حضرت محمد ﷺ کی ساری امت بس قومی اسمبلی کے ارکان میں متشکل ہو گئی ہے، اس کے ماوراء ان کے ذہن میں کسی امت کا تصور نہیں، نہ پاکستان میں ارکان قومی اسمبلی کے علاوہ امت کے کسی فرد کا وجود ہے، نہ پاکستان سے باہر امت کا کوئی حصہ آباد ہے، اور نہ قیام پاکستان سے پہلے کبھی دنیا میں امت مسلمہ کا وجود تھا، پس کل کی کل امت ممبران قومی اسمبلی ہیں، چونکہ پوری کی پوری امت گمراہ نہیں ہو سکتی، لہذا معلوم ہوا کہ پاکستان کی قومی اسمبلی معصوم عن الخطا ہے۔ اگر انڈے سے بند چیونٹی کے بچے کا وہ نظریہ صحیح ہے کہ انڈے کے خول کے ماوراء زمین و آسمان کا کوئی وجود نہیں تو کوئی شبہ نہیں کہ گورایہ صاحب کا یہ استدلال بھی صحیح ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ ہی امت ہے اور امت کبھی گمراہ نہیں ہو سکتی، لہذا پاکستانی پارلیمنٹ معصوم عن الخطا ہے۔ قارئین کو گورایہ صاحب کے نظریات پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے، کیونکہ دنیا خود ایک عجائب خانہ ہے اور گورایہ صاحب کے یہ افکار و نظریات اس عجائب خانہ دنیا میں گر انقدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی ہے

جناب گورایہ صاحب نے جس حدیث کے حوالے سے پاکستان پارلیمنٹ کو

تقدس و عصمت کا منصب عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حدیث شریف کا پورا متن یہ ہے :

ان الله لا يجمع امتي، او قال امة محمد
صلى الله عليه وسلم على الضلالة ويد الله على
الجماعة ومن شذ شذ في النار۔

(مشکوٰۃ۔ ص ۳۰)

ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو (یا یہ فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو) گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ”الجماعت“ پر ہے اور جو شخص علیحدہ ہوگا اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ میں ٹھونس دے گا۔“

قال المظهر : في الحديث دليل حقية
اجماع الامة اے لا يجتمعون على معصية او
خطاء غير الكفر، بدليل لا تقوم الساعة الا
على الكفار، لكن لم يبق الامة امة والمراد
اجماع العلماء منهم ولا عبرة باجماع العوام
وفي اضافة الامة الى اسمه الشريف اشارة الى
ان هذه الامة هي التي امتازت بهذه الفضيلة

(حاشیہ مشکوٰۃ)

ترجمہ: ”مظہر کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اجماع امت کے برحق ہونے کی دلیل ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے کسی معصیت یا خطا پر اجماع نہیں کر سکتے، ہاں سبھی کافر ہو جائیں تو دوسری بات ہے، اس

صورت میں امت امت ہی نہ رہے گی، چنانچہ قرب قیامت میں سب کافر ہو جائیں گے اور کافروں ہی پر قیامت قائم ہوگی، اور ”اجماع امت“ سے مراد امت کے اہل علم کا اجماع ہے، عوام کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں، اور امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کی طرف منسوب کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہی وہ امت ہے جو اس فضیلت کے ساتھ ممتاز ہے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجماع امت (جس کا اولین مصداق اجماع صحابہؓ ہے) حجت قطعیہ ہے اور یہ کہ وہ اجماعی مسائل جو صحابہ کرامؓ کے دور سے آج تک متفق علیہ چلے آتے ہیں اور جن پر مشرق و مغرب کے علما متفق ہیں ان سے انحراف کسی کے لئے ممکن نہیں، لیکن جناب گورایہ صاحب پارلیمنٹ کی شریعت کی تعبیر نو کا مشورہ دے کر ان کو، حدیث نبوی کے علی الرغم ”شدوذنی النار“ (دوزخ میں گھسنے) کی دعوت دے رہے ہیں۔

گورایہ صاحب کے مجتہدین کا انتخاب

گورایہ صاحب یہ تو طے فرما چکے کہ شریعت کی ”تعبیر نو“ کا اختیار پارلیمنٹ کے ارکان کو حاصل ہے، اب صرف یہ مرحلہ باقی رہا کہ پارلیمنٹ کے لئے کن صفات کے نمائندے چنے جائیں؟ جو اجتہاد کا کارنامہ انجام دیں اور شریعت کی نئی نئی تعبیریں کر کے دین و شریعت کا حلیہ بگاڑیں؟ اس کی تشریح کرتے ہوئے گورایہ صاحب لکھتے ہیں :

”تعبیر شریعت کی صلاحیت رکھنے والا، اچھی شہرت کا مالک، ہر

بالغ مسلمان مرد وزن قانون ساز ادارے کی رکنیت کا اہل ہے، یہ

صلاحیت قرآن و سنت کی تعلیمات، جدید علوم و تجربات اور درپیش قومی اور بین الاقوامی مسائل و حالات کی مہارت پر مشتمل ہے۔

یہ تو اجتہاد کی مثبت شرائط ہوئیں اور منفی شرائط یہ کہ :

”البتہ مالی ذرائع یا مذہبی حیثیت یا نسبی عصیت یا علاقائی

تعصب کا استحصال کرنے والا اس کی رکنیت کا اہل نہیں، کیونکہ مال

یا مذہب یا علاقے کا استحصال قرآنی شرائط اخلاص اور تقویٰ کے منافی

ہیں۔“

ان شرائط میں پہلی شرط یہ ذکر کی گئی ہے کہ وہ ”تعبیر شریعت“ کی صلاحیت رکھنے والا ہو، لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ ”تعبیر شریعت“ کی صلاحیت کا معیار کیا ہے؟ وہ کون سی صفات ہیں جن کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاسکے کہ یہ صاحب تعبیر شریعت کی صلاحیت سے آراستہ ہیں؟ میں پہلے بھی شکایت کرچکا ہوں کہ گورایہ صاحب ”اجتہاد“ پر مقالہ لکھنے بیٹھے ہیں مگر نہ تو یہ بتاتے ہیں کہ اجتہاد کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا موقع و محل کونسا ہے؟ اس کے لئے کیا قیود و شرائط ہیں؟ اور نہ یہی بتاتے ہیں کہ مجتہد میں کن اوصاف و لوازم کا پایا جانا ضروری ہے؟ یہاں بھی جب وہ اسمبلی کے لئے مجتہدین کے شرائط انتخاب پر گفتگو کرتے ہیں، یہ نہیں بتاتے کہ تعبیر شریعت کی صلاحیت اور قرآن و سنت کی تعلیمات میں مہارت سے ان کی کیا مراد ہے؟ صدر مملکت جنرل محمد ضیا الحق صاحب نے کئی سال پہلے ایک ”اجتہاد کانفرنس“ بلائی تھی، جس میں بہت سے حضرات نے اجتہاد کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا۔ جناب مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دعوت تھی، مفتی صاحب مرحوم اجتہاد پر کوئی مقالہ لکھ کر نہیں لائے تھے، برجستہ تقریر فرمائی تھی، مفتی صاحب نے فرمایا، اصول فقہ میں اجتہاد کی بہت سی شرطیں لکھیں ہیں، میں ان شرائط

کی تفصیل یہاں ذکر نہیں کرنا چاہتا مگر یہ ضرور عرض کروں گا کہ کم سے کم ”ان حضرات“ کو ناظرہ قرآن تو پڑھالیجئے، مفتی صاحب کے سامنے پہلی صف جج صاحبان کی تھی، مفتی صاحب نے ہاتھ سے پوری صف کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ ”ان حضرات“ کو ناظرہ قرآن تو پڑھالیجئے۔ مفتی صاحب کا یہ ایک فقرہ پورے مقالہ پر بھاری تھا، اس کو سن کر جج صاحبان پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ گفتنی نہیں، دیدنی تھی۔

مفتی صاحب مرحوم کے اس ارشاد کی روشنی میں، میں گورایہ صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ جن حضرات کو مسند اجتہاد پر بٹھا رہے ہیں ان میں کتنے ہیں جو ناظرہ قرآن کریم صحیح پڑھ سکتے ہیں؟ کتنے ایسے ہیں جو قرآن کریم کے ایک رکوع کا ترجمہ، تراجم کی مدد کے بغیر کر سکتے ہیں؟ پھر کتنے ایسے ہیں جو قرآن کریم کی ایک آیت کا بھی صحیح مفہوم ادا کر سکتے ہیں؟ خود گورایہ صاحب سے بڑا مجتہد اس زمانے میں کون ہو گا؟ لیکن ان کی قرآن فہمی اور حدیث میں مہارت کے نمونے اس زیر بحث مقالہ میں قارئین کے سامنے آچکے ہیں۔ اس پر بھی اگر انہیں اپنی سطح کے لوگوں کے بارے میں حسن ظن ہے تو ”فاصنع ما شئت“ کے سوا کیا عرض کیا جاسکتا ہے۔

دراصل جس اجتہاد اور ”شریعت کی تعبیر نو“ کی گورایہ صاحب دعوت دے رہے ہیں اس کی صلاحیت کے لئے علم و فہم کی شاید کوئی شرط نہیں، ایل ایل بی کی ڈگری لے کر آدمی عدالتوں میں اجتہاد کے جوہر دکھا سکتا ہے، کسی مغربی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر کے کسی یونیورسٹی میں ”معلم ملکوت“ بن سکتا ہے اور گورایہ صاحب کی طرح قوم کو اجتہادی تحائف پیش کر سکتا ہے۔ ایم اے اسلامیات بلکہ مولوی فاضل کا کورس کر کے ”مجتہد مطلق“ بن سکتا ہے، قرآن و حدیث کا صحیح تلفظ و ترجمہ آتا ہو یا نہ آتا ہو، بہر حال مجتہد ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسری شرط اجتہاد یہ ذکر فرمائی ہے کہ مجتہد صاحب، اچھی

شہرت کے مالک ہوں، لیکن اچھی شہرت سے کیا مراد ہے؟ اسکی بھی وضاحت نہیں فرمائی آج کل بہت سے ایسے لوگ بھی نیک نام اور اچھی شہرت کے مالک سمجھے جاتے ہیں جو نہ تو نماز روزے کے قائل ہیں، نہ ان کی صورت و سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مطابقت رکھتی ہے، نہ ایمان و اسلام کا ان کے دل و دماغ پر کوئی اثر نمایاں ہے بلکہ وہ درج ذیل حدیث نبویؐ کے مصداق ہیں :

وَيَقَالُ لِلرَّجُلِ مَا اعْقَلَهُ وَمَا اظْفَرَهُ وَمَا
اجْلَدَهُ وَمَا فِي قَلْبِهِ مِثْقَالَ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ -

(متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۴۶۱)

ترجمہ :- ”آدمی کی عقل کی، ظرافت کی، بہادری کی تعریف نہایت تعجب سے کی جائے گی حالانکہ رائی کے دانے کے برابر بھی اس کے دل میں ایمان نہیں ہوگا۔“

گویا گورایہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کے لئے نماز روزے کی بھی شرط نہیں، دینی شعائر کے التزام کی بھی کوئی قید نہیں، بلکہ ایمان صحیح کی بھی ضرورت نہیں، بس اتنا کافی ہے کہ معاشرے میں اس کی اچھی شہرت ہو۔

گورایہ صاحب نے جو دوسری شرائط ذکر کی ہیں ان کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے، البتہ دو سوال مزید رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ گورایہ صاحب کے نزدیک مذہبی راہنما اور علمائے کرام، ”مجتہد اسمبلی“ کی رکنیت کے اہل نہیں، گویا عالم دین ہونا گورایہ صاحب کے نزدیک ایک ایسا عیب یا جرم ہے، جس کی وجہ سے آدمی اسمبلی کی رکنیت اور مسند اجتہاد آراستہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، آخر یہ کیوں؟

گورایہ صاحب اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ حضرات مذہبی استحصال کرتے ہیں اور یہ چیز اخلاص و تقویٰ کے منافی ہے، اس لئے ایسے غیر مخلص اور غیر متقی افراد

ان کی ”مجتہد اسمبلی“ میں جانے کے لائق کب ہو سکتے ہیں؟

لیکن یہاں بھی گورایہ صاحب یہ وضاحت کرنا بھول گئے کہ ”مذہبی استحصال“ سے ان کی کیا مراد ہے؟ یہ استحصال کا لفظ کیونسٹ لغت میں بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور وہ اسی لفظ کے ذریعہ عوام کو اہل علم سے متنفر کیا کرتے ہیں، جناب گورایہ صاحب نے علما کو بدنام کرنے کے لئے اسی اصطلاح کا سہارا لینا ضروری سمجھا ہے۔

”مذہبی استحصال“ جس سے گورایہ صاحب ڈر رہے ہیں یہ ہے کہ علمائے امت، مسلمانوں کو دین و مذہب کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور ہمارے نئے مجتہدین جن تحریفات کو قرآن و حدیث اور اسلامی قانون میں ٹھونسنا چاہتے ہیں علمائے کرام کسی قیمت پر ان کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور وہ اسلامی برادری کو بھی ان تحریفات سے آگاہ کر کے مجتہدین زمانہ کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں اور ہمارے ان نئے مجتہدین کو من مانیوں کا موقع نہیں دیتے۔ یہ گورایہ صاحب کے نزدیک ”مذہبی استحصال“ ہے جس کے علما مجرم ہیں اور اس لئے وہ اسمبلی کی رکنیت کے اہل نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ گورایہ صاحب فرماتے ہیں مجتہد اسمبلی کے لئے انتخابات آزادانہ و منصفانہ ہوں، ان میں مالی ذرائع نسبی تعصب اور علاقائی عصبیت کا شائبہ نہ ہو، لیکن پاکستان کی تاریخ میں ایسا انتخاب تو کبھی ہوا نہیں اور نہ معروضی حالات میں اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے، لہذا ایسی اسمبلی جو مالی ذرائع، نسبی تعصب اور علاقائی عصبیت کے زور سے منتخب ہونے والے افراد پر مشتمل ہو (جیسا کہ عموماً یہی ہوتا ہے) وہ تو گورایہ صاحب کے معیار پر بھی ”پوری قوم“ کی نمائندہ نہیں ہو سکتی، پس جو اسمبلی نہ تو قوم کی صحیح نمائندگی کرتی ہو اور نہ وہ شریعت کے ماہرین پر مشتمل ہو اسکو گورایہ صاحب شریعت کی تعبیر نو کی اجازت کس منطق سے دیتے ہیں؟

اجتہاد جاری ہے:

گورایہ صاحب نے اس نکتہ پر بڑی طویل، مگر قطعاً غیر ضروری اور غیر متعلق بحث کی ہے کہ علمائے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے، مجھے گورایہ صاحب سے اس غیر ضروری بحث میں الجھ کر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، میں ان سے عرض کروں گا کہ اجتہاد بند نہیں، جاری ہے، مگر ازراہ کرم اجتہاد کا پیاناہ متعین کر لیجئے اور پھر اس پیانے سے خود اپنے اور اپنے خود ساختہ مجتہدین کے قد و قامت کی پیمائش کر دیکھئے، خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کون اس پیانے پر پورا اترتا ہے اور کون نہیں؟ اور اگر اجتہاد کے معنی شریعت کو بگاڑنے کے ہیں تو میں بھی گواہی دینے کے لئے حاضر ہوں کہ آپ حضرات اس کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

کیا اسمبلی صحابہؓ کے فیصلوں کو بدل سکتی ہے؟

پہلے گزر چکا ہے کہ مجتہد کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ صحابہ کرام کے فیصلوں سے واقف ہو، تاکہ اجماع امت سے خروج نہ کرے، اور جس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے دو قول ہوں وہاں تیسرا قول ایجاد نہ کرے، تمام ائمہ مجتہدین اس اصول کے شدت سے پابند تھے، لیکن گورایہ صاحب اسمبلی کو مجتہد مطلق کی حیثیت نہیں، بلکہ مطلق العنان یا شتر بے مہار قسم کے مجتہد کی حیثیت دینا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اسمبلی صحابہ کے فیصلے کی پابند ہے؟ اور اس کا جواب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسمبلی صحابہؓ کے کسی قانونی فیصلے کی پابند نہیں، وہ مطلق العنان ہے جو چاہے فیصلے کرے۔

میں قبل ازیں عرض کر چکا ہوں کہ صحابہ کرام کے اجماعی فیصلوں سے انحراف کرنے والا ”سبیل المومنین“ اہل ایمان کے راستہ سے برگشتہ ہے، جس کو قرآن کریم نے ”ونصلہ جہنم“ (اور ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے) کی وعید سنائی

ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو ضلالت و گمراہی قرار دے کر ایسے شخص کو ”شذی النار“ (واصل بہ جہنم) فرمایا ہے ہم تو اس نظریے سے ہر مومن کے حق میں اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، گورایہ صاحب اگر نشہ اجتہاد میں یہی راستہ پسند فرماتے ہیں تو ان کو اختیار ہے جو حضرات ان کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

ائمہ مجتہدین اور ان کا فقہی سرمایہ

جناب گورایہ صاحب نے ائمہ مجتہدین اور ان کے فقہی سرمائے سے بطور خاص بغض و نفرت کا اظہار اور ان کے خلاف استخفاف کا مظاہرہ کیا ہے وہ کبھی ان کو ”دور ملوکیت کی پیداوار“ کہتے ہیں کبھی ”فرسودہ“ اور ”بے جان“ فرماتے ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں :

”کسی قوم کے فرسودہ افکار اس کے احیا و تجدید کا ذریعہ نہیں

بن سکتے۔“

کبھی ارشاد ہوتا ہے :

”گزشتہ اجتہادات اب مفید نہیں رہے، جدید افکار اور

تجربات کی روشنی میں آزادی اجتہاد کو بروئے کار لا کر قانون شریعت

کی از سر نو تشکیل کرنی چاہئے۔“

کبھی فرماتے ہیں :

”اب کوئی چارہ کار ہے تو یہ کہ ہم اس چھلکے کو اتار پھینکیں

جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے اور جس نے متحرک نظریات کو

بالکل جامد بنا کر رکھ دیا ہے۔“

کبھی فرماتے ہیں :

”جو چیز فرسودہ ہو کر بے جان ہو چکی ہو، موجودہ اسمبلیاں اس کی پابند نہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ جھوٹی عقیدت کا اظہار اور مصنوعی ذرائع سے اس کا احیا زوال پذیر قوم کا علاج ہے۔“

جناب گورایہ صاحب ”اجماع صحابہؓ“ اور ان کے متفقہ فیصلوں کو بھی اپنے زور اجتماع سے ٹھکرا دینے کا اعلان کریں تو ظاہر ہے کہ ائمہ اربعہ ان کی نظر میں کیا چیز ہیں؟ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کل قرآن و حدیث کو بھی فرسودہ قرار دے کر ان سے دستکش ہونے کا اعلان نہ فرمادیں، کیونکہ فقہاء کے ارشادات تو قرآن و سنت پر ہی مبنی ہیں اور قرآن و حدیث ائمہ فقہاء کے ارشادات سے پہلے کی چیز ہے، اب اگر ائمہ اربعہ کا فقہی سرمایہ فرسودہ اور بے جان ہو چکا ہے تو (معاذ اللہ) کتاب و سنت کے فیصلے گورایہ صاحب کے فتویٰ فرسودہ کے بدرجہ اولیٰ مستحق ہیں، اور مجھے معلوم ہے کہ آج اونچے سیاسی حلقوں میں یہی نظریہ گشت کر رہا ہے اور گورایہ صاحب بھی اگرچہ صاف صاف خروج از اسلام کا مشورہ لوگوں کو نہیں دیتے مگر جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی ہے۔

امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا
السواد الاعظم ولما اندرست المذہب الحقہ
الا هذه الاربعۃ کان اتباعها اتباعا للسواد
الاعظم والخروج عنها خروجا عن السواد
الاعظم۔

(عقد الجمد مع الانصاف ص ۳۷ مطبوعہ ترکیہ)

ترجمہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”سواد اعظم کی پیروی کرو، چونکہ ائمہ اربعہ کے فقہی مذاہب کے سوا باقی تمام مذاہب حقہ مٹ چکے ہیں اس لئے ان کی پیروی سواد اعظم کی پیروی ہوگی اور ان سے خروج سواد اعظم سے خروج ہوگا۔“

گورایہ صاحب کو سوچنا چاہئے کہ وہ ائمہ اربعہ سے برات کا اعلان کر کے کون سا راستہ اپنا رہے ہیں اور یہ کہ ان کے غیر مقلدانہ غرور و پندار کا آخری انجام کیا ہوگا؟

حرف آخر : پس چہ باید کرو؟

گورایہ صاحب لکھتے ہیں کہ :

”متحارب فرقوں کی موجودگی میں، عہد جدید میں یہی واحد

شکل ممکن ہے۔ (کہ اجتہاد قومی اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے)۔“

یہ تو تفصیل سے عرض کر چکا ہوں کہ گورایہ صاحب جس راستہ کی رہنمائی فرما رہے ہیں وہ ضلالت و گمراہی کا راستہ ہے جو سیدھا ”وادی جہنم“ کی طرف نکلتا ہے، اسکے بجائے صحیح راستہ یہ ہے کہ پاکستان میں اکثریت فقہ حنفی کے عقیدت مندوں کی ہے اسلئے ملک میں فقہ حنفی کو عدالتی قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے، دوسرے فرقوں کے شخصی معاملات ان کی فقہ کے مطابق طے کئے جائیں، جن مسائل و قضایا میں فقہ حنفی کی کوئی صراحت نہ ہو، یا اس میں واقعہ ناقابل تحمل مشکل پیش آتی ہو ان میں اہل علم کے مشورے سے دوسرے ائمہ فقہاء کے مسائل کو اپنایا جائے اور جو مسائل بالکل جدید ہوں ان پر علما اور صلحا و عابدین غور و فکر کریں، جیسا کہ اس سے پہلے ارشاد نبویؐ نقل کر چکا ہوں، اس کے سوا جو راستہ بھی اپنایا جائے گا وہ دنیا و آخرت میں تباہی و بربادی کا راستہ ہوگا، اگر گورایہ صاحب کو اسلام سے کوئی دل چسپی اور

پاکستان سے کچھ ہمدردی ہے تو انہیں اکابر پاکستان کو اس کا مشورہ دینا چاہئے ورنہ :

ع ”مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں“

اللہ تعالیٰ پاکستان کو ہر فتنہ و سازش سے محفوظ فرمائیں اور یہاں کے عوام و خواص کو دینِ قیم سے صحیح وابستگی نصیب فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ صفوة البریة

محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

(بینات رمضان، شوال ۱۴۰۷ھ)

عصر حاضر کا اہم تقاضا قدیم فقہ اسلامی اور جدید مسائل کا حل

(۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى، اما بعد :

یوں تو آئے دن اتنے علمی و عملی فتنے ظاہر ہو رہے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس کس کا جواب دیا جائے اور کس کس کی طرف توجہ کی جائے :

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

فتنوں کا ایک سیلاب ہے کہ امنڈا چلا آ رہا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جا کر رکے گا؟ رسائل ہیں، اخبارات ہیں، ریسرچ کے انسٹی ٹیوٹ ہیں، ثقافت کے ادارے ہیں، کہیں تعمیر نو کے نام پر تخریب دین ہے، کہیں عقائد اسلامیہ پر حملے ہیں، کہیں احکام شرعیہ سے انکار ہے، کہیں انکار سنت کا زور ہے، کہیں تحریف قرآن کا فتنہ ہے کہیں جواز سود و تحلیل خمر کے فتوے ہیں، کہیں رقص و سرود کو جائز کرنے کے لئے تحقیقات ہو رہی ہیں، کہیں تعزیرات و حدود پر ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے، کہیں سلف صالحین سے بدظن کرنے کی مذموم کوشش ہو رہی ہے، کہیں اسلامی نظام کی ناکامی کے دلائل پیش کئے جا رہے ہیں۔ الغرض کہیں مستشرقین مصروف عمل ہیں تو کہیں ملاحدہ

وزناتہ اسلام سے برسرِ پیکار ہیں۔ اندر باہر، عوام و خواص، راعی و رعیت سب ہی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی اس آخری نعمت کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے، مقصد حیات صرف مادی آسائش ہے، نہ آخرت کا تصور، نہ حساب و کتاب کی فکر، سارے نظام کا محور صرف پیٹ ہے اور بس۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ جن حضرات میں ان فتنوں کے دفاع کی صلاحیت و اہلیت ہے وہ یا تو بالکل غافل و خاموش ہیں یا ان کے وسائل اتنے محدود ہیں کہ اگر کچھ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

مصائب شتیٰ جمعت فی مصیبة
ولم یکفها حتیٰ قفتها مصائب

ترجمہ: ”کتنے ہی منتشر مصائب ایک مصیبت میں جمع ہو گئے“

اور اس پر بھی بس نہیں بلکہ روزِ نئی مصیبتیں آرہی ہیں۔“

علماء امت کے ذمہ جہاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہاں عصرِ حاضر کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی بھی ان ہی کے ذمہ ہے کہ موجودہ دور کے تمدن و تہذیب نے جو نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں ان پر غور کر کے انکا حل تلاش کیا جائے آج کل کا نیا طبقہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس خیالِ خام میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اسلام کا قدیم نظام یا قدیم اسلامی فقہ موجودہ معاشرے کی مشکلات کے حل کے لئے کافی نہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے نظام کے دو حصے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جو قرآن و سنت کے صریح نصوص سے ثابت ہے، یہ تمام تر اس علیم و قدیر اور حکیم و خبیر رب العالمین کا ابدی اور دائمی قانون ہے جس کا علم بھی ہر شے کو محیط ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ قیامت تک جو آنے والی نسلیں ہیں ان میں کیا کیا خرابیاں

پیدا ہوں گی، اور اس کی قدرت بھی کامل ہے چنانچہ اس نے اپنے علم محیط اور قدرت کاملہ سے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام امراض روحانی کیلئے ایسا نسخہ شفا اتارا ہے کہ جس میں نہ کسی ترمیم و اصلاح کی گنجائش ہے نہ کسی ادنیٰ سی تبدیلی کی۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو علما امت اور مجتہدین عظام نے قرآن کریم و سنت نبویہ سے استخراج و استنباط کر کے مرتب فرمایا ہے اس کے مختلف مراتب اور مختلف ادوار ہیں، معاملات اور معاشرت میں بہت سے احکام ایسے بھی ہیں کہ جن کا تعلق اس عہد سے تھا۔ مجتہدین امت کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے ہی ایسے اصول و قواعد مرتب فرما گئے کہ قیامت تک آنے والے اہل علم کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا اور انہی اصول و قواعد کی روشنی میں آئندہ ہر قسم کی مشکلات حل ہو سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ جتنا تمدن ترقی کرے گا اتنے ہی جدید مسائل پیدا ہوں گے اور غیر اسلامی ملکوں سے تعلقات و روابط جتنے زیادہ پیدا ہوں گے نئے نئے مسائل سے واسطہ پڑتا رہے گا۔ مسلمانوں میں اب بھی ایک بہت بڑا طبقہ ایسا موجود ہے کہ اگر تجارت و معاملات میں اسلامی اصول کی روشنی میں ان کی مشکلات کو حل کر دیا جائے اور فقہی قوانین سے ان کو ایسی تدابیر بتلا دی جائیں کہ جن کی بنا پر وہ شرعی حدود کے دائرہ سے باہر قدم نہ نکال سکیں تو نہایت خوشی سے اس پر لبیک کہیں گے اور بدل و جان ان تدابیر پر عمل کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت علما امت کے ذمہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے اسلاف نے اپنے اپنے زمانے میں ”اجناس“ ”واقعات“ اور ”نوازل“ کے عنوان سے روزمرہ کے نئے نئے پیش آنے والے مسائل کو یکجا کیا اور پھر قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کو حل کیا۔ ٹھیک اسی طرح موجودہ فقہاء بھی جدید نوازل و واقعات کا حل قدیم فقہ اسلامی کی روشنی میں تلاش کریں۔ جدید تمدن سے بھی فقہ

کے ہر باب میں نماز روزہ سے لے کر معاملات و معاشرت تک جدید سوالات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے علما امت کے ذمہ اب یہ فرض ہے کہ جلد سے جلد ان نئے پیدا ہونے والے مسائل کے مفصل جوابات امت کے سامنے پیش کر کے مسلمانوں کے دیندار طبقہ کو مطمئن فرمائیں اور جدید نسل کو باور کرائیں کہ دین اسلام میں ہر وقت کے صحیح تقاضے کو پورا کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اور ہماری شریعت زمان و مکان کے قیود سے بالاتر ہے ”بینات“ کے آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ ایک اجمالی فہرست پیش کر کے اس سلسلہ میں اہل علم کی خدمت میں چند رہنما اصول بھی پیش کروں گا تاکہ ان کی روشنی میں غور و خوض کر سکیں، بلاشبہ یہ فرض ایک اسلامی حکومت کا تھا کہ وہ وقت کے جامع ترین علما اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے ایسے ماہرین کو جن کا تقویٰ و اخلاص مسلم ہو، جن کے تدین پر امت کو اعتماد ہو، جن کی زندگیاں قال اللہ و قال الرسول میں گزری ہوں، جن کے ذہنوں میں توقد و ذکا ہو، جن کی طبیعتوں میں استقامت و استقلال ہو، جو خواہشات و تاثرات سے بالاتر ہوں، جن کے دلوں میں مخلوق خدا کا درد ہو، جو دنیا کی مشکلات سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہوں اور جن میں موثر تعبیرات اور عام فہم تحریر کا ملکہ ہو، ان کو کسی ایک مرکز میں جمع کرتی، ان کی رفاقت میں عصر حاضر کے دیندار قانون دان طبقہ کو شامل کرتی اور فقہ اسلامی کے شعبہ میں تمام ممالک اسلامیہ میں اب تک جتنا کام ہوا ہے وہ سب ان کے پیش نظر ہوتا خواہ وہ مصر و شام میں ہوا ہو یا مغرب اقصیٰ کے ممالک میں اور پھر اس طرح قدیم و جدید سے فقہ اسلامی کی مہارت و معلومات رکھنے والے حضرات اس کام کو اپنے ہاتھوں انجام دیتے۔ لیکن : اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

افسوس کہ حکومت پاکستان ادارہ اسلامیات کراچی وغیرہ پر سالانہ لاکھوں روپیہ خرچ کر رہی ہے مگر امر پر اس کی توجہ نہیں۔ ان اداروں میں ایک بھی نہ متدین عالم

ہے نہ اسلامی علوم کا ماہر خصوصی۔ بجائے اس کے کہ وہ کچھ کام کرتے ان کا وجود ان کی کوششیں خود دین اسلام کے لئے عظیم الشان فتنے کی صورت اختیار کر چکی ہیں :

”فی الغربة الاسلام ویا خبیة المسلمین!!“

موجودہ صورت حال میں جب حکومت اس طرف متوجہ نہیں تو پھر دیندار مال دار طبقہ کو چاہئے تھا کہ اس خدمت کو بجالانے کے لئے کوئی اقدام کرتا اور علما کے مشورہ سے اس مقصد کے پیش نظر اہل افراد کا انتخاب کر کے فکر معاش سے ان کو ہر طرح مطمئن کر اگر اسی کام کے لئے فارغ کرتا اور اس طرح ایک ”مجلس الفقہاء والعلماء“ کی تشکیل ہوتی کہ جس میں محققین اہل علم باہمی مشاورت اور بحث و تحقیق سے ان مسائل کو حل کرتے۔ شخصی رائے کتنے ہی غور و غوض کے بعد قائم ہو پھر بھی وہ شخصی رائے ہی رہے گی۔

ان مشکلات کے حل کے لئے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے، اکابر صحابہؓ کے بعد حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی پہلی شخصیت ہے جس نے اجتہادی مشکلات کے حل کرنے کیلئے اپنے وقت میں ممتاز ترین چالیس افراد پر مشتمل ایک جماعت کی تشکیل کی اور ایک طویل مدت تک فقہی مسائل کے استنباط اور اجتہادی احکام کی تدوین کی خدمت انجام دیتے رہے، اسی لئے جو پختگی اور قبول عام اس مذہب کو ہوا اور کسی مذہب کو نصیب نہیں ہوا چنانچہ خلافت عباسیہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے اختتام تک جو بارہ سو برس کا طویل زمانہ گزرا ہے اس میں یہی مذہب حنفی تھا جس کی روشنی میں خدا کی مخلوق کے مشکلات حل ہوتے رہے اور ان خلافتوں میں بھی فقہ حنفی ملک کا قانون بنا رہا۔

لیکن جب کہ ہماری حکومت اور ہمارے ملک کے مسلمانوں کا مالدار طبقہ بھی اس فرض سے غافل ہے تو اب خالصۃً یہ فریضہ علماء امت کے ذمہ آجاتا ہے خصوصاً

ان مدارس کے ارباب اہتمام کے ذمے جو کہ اپنے مدرسوں میں ہزارہا روپے سالانہ خرچ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مناسب مشاہرات پر اچھے اچھے فضلا رکھ سکتے ہیں اگر ان عربی مدارس میں سے ہر مدرسہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کرے اور پھر اپنا ایک نمائندہ منتخب کرے تو کیا اچھا ہو جو کام ارباب حکومت لاکھوں روپے کے صرفے سے بھی انجام نہیں دے رہی، وہ علما کا یہ غریب و مفلس اور نادار طبقہ تھوڑے سے خرچ پر بآسانی کر سکتا ہے۔ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی، دارالعلوم کراچی، دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار، خیر المدارس ملتان، جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدنیہ لاہور، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ، جامعہ امدادیہ کشور گنج ڈھاکہ، مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہراری چانگام، مدرسہ اسلامیہ جیری چانگام، جامعہ اسلامیہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ مدارس اس مقصد پر متفق ہو جائیں تو یہ عظیم الشان کام ان شاء اللہ بہت جلد انجام پذیر ہو سکے گا اور بآسانی یہ مشکل حل ہو جائے گی۔

آخر میں اپنی یہ مختصر گزارش حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پر ختم کرتا ہوں جس سے ان مشکلات کے حل کرنے میں پوری رہنمائی ملتی ہے :

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تامرنی قال شاوروا فیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رای خاصہ رواہ الطبرانی فی الاوسط ورجالہ موثقون من اہل الصحیح۔

(تبع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸)

ترجمہ: ”حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول

اللہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں آپ کا کوئی بیان کرنے یا نہ کرنے کا نہ ملتا ہو تو آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا کیا جائے؟
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فقہاء و علما سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کریں شخصی رائے کو دخل نہ دیں۔“

اس حدیث کرم سے جہاں اجتماعی شورائی فیصلوں کی نہ صرف اہمیت بلکہ فرضیت ثابت ہوئی ساتھ ساتھ اس جماعت کی اہلیت کے شرائط بھی معلوم ہو گئے :

۱ : ----- ایسے اہل علم ہوں کہ تنفقہ فی الدین ان کو حاصل ہو۔

۲ : ----- صالح و متقی اور عبادت گزار ہوں۔ واللہ سبحانہ ہو الموفق۔

(۲)

چند راہ نما اصول

گزشتہ سطور میں علما امت کی خدمت میں عصر حاضر کا اہم تقاضا کے تحت چند ضروری گزارشات کی گئی تھیں اس سلسلہ میں چند راہ نما اصول تحریر کئے جاتے ہیں :

۱ : ----- ایہ تو ظاہر ہے کہ ”اسلام“ وہ آخری پیغام حیات و پیغام نجات ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے قانون ہدایت ہے، اور ہر دور، ہر ملک، ہر قوم کے لئے اس میں ہدایت کے سرچشمے موجود ہیں۔ مادی و روحانی شخصی و اجتماعی، اقتصادی و معاشی، ملکی و سیاسی غرض ہر ضرورت کی حاجت روائی کا سامان اس میں موجود ہے اور اس کا دامن ایسے بیش قیمت جواہرات سے پر ہے کہ سارے عالم کے افلاس کا علاج اس کے خزانہ عامرہ سے ہو سکتا ہے۔ یہی ایک ایسا صالح ترین و اعلیٰ

ترین نظام ہے جو نسل آدم میں عدل و انصاف سے ہر مشکل کو آسان کر سکتا ہے۔

۳: ————— قرآن و حدیث ”یا کتاب و سنت“ اس کا بنیادی سرمایہ ہیں، خلافت راشدہ بالخصوص عہد صدیقی، عہد فاروقی اور اس کے بعد عہد اموی اور عہد عباسی میں صحابہؓ و تابعینؓ اور پھر ائمہ اجتہاد، ائمہ اربعہ ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد رضی اللہ عنہم اور ان کے اقران میں سفیان ثوریؒ، اوزاعیؒ وغیرہ مجتہدین امت و فقہا اسلام کی مساعی جلیلہ و مبارکہ سے دین اسلام کی تعمیر و تعبیر کا عجیب و غریب نقشہ کامل ترین خوشنما صورت میں محفوظ ہو گیا۔ ان اکابر امت اور فقہا ملت میں اللہ تعالیٰ نے عظیم ترین اخلاص، اعلیٰ درجہ کا تقویٰ و خشیت الہی، علوم دینی میں تبحر، دقت نظر، توقد و ذکا کے جو کمالات جمع کئے تھے اس وقت کی نسل اس کا اور اک بھی نہیں کر سکتی، قرآن و حدیث کا علم صحیح اور دین اسلام کی مزاج شناسی کا ذوق جو ان کو نصیب تھا آج اس کا احساس بھی مشکل ہے اور انہی کمالات کا نتیجہ ہے کہ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزرا لیکن ان کا فیض برابر جاری ہے اور قلوب میں ان کی عظمت اور قدر و قیمت ہنوز موجود ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے ان کی منت پذیری سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اور نہ اس عظیم سرمایہ سے امت کسی وقت مستغنی ہو سکتی ہے۔

۴: ————— فقہ اسلامی کا یہ ذخیرہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے، اور جہاں اس کی حفاظت کی ضرورت ہے ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنا اور اس سے منتفع ہونا بھی ہمارا فرض ہے۔ منتفع ہونے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جدید تمدن نے جو بہت سے جدید مسائل پیدا کر دیئے ہیں اب اسی فقہ اسلامی کی روشنی میں اس کا حل تلاش کرنا چاہئے۔ اس سرمایہ کے ہوتے ہوئے امت کو نہ جدید مستقل اجتہاد کی ضرورت

ہے اور نہ اس کا امکان۔ اس عظیم الشان ذخیرہ میں بحث و تلاش اور غور و خوض کے بعد جدید مسائل کے حل کرنے کا بہت سلمان مل جائے گا۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ بعض جزوی مسائل میں علما امت کو ان ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر جدید اجتہاد کی ضرورت ہوگی۔

۴: _____ گزشتہ شمارے میں جو مجمع طبرانی کی حدیث پیش کی تھی اس سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں :

الف : _____ جدید مسائل ایسے ضرور پیدا ہوں گے جن میں قرآن و حدیث کا صاف و صریح فیصلہ نہ ہوگا۔

ب : _____ علما امت کے ذمہ یہ فرض عائد ہے کہ اس کا حل کریں۔

ج : _____ علما انفرادی رائے اور شخص رائے سے اجتناب کریں اور باہمی مشورہ سے اس کا فیصلہ کریں۔

د : _____ ان علما میں دو شرطیں ضروری ہیں، ان کے دلوں میں خوف خدا ہو، اور تفقہ فی الدین ان کو حاصل ہو۔

اس حدیث نبوی نے ان علما امت کو جدید مسائل کے فیصلہ کرنے کا مکلف بنایا ہے جن میں اخلاص و تقویٰ اور عبادت گزاری کی روح موجود ہو، اور غور و خوض و باہمی مشورہ کرنے کی اہلیت ہو۔

۵ : _____ اس میں شک نہیں کہ حضرت امام انظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو بقول امام شمس الدین ذہبی ”فقیہ ملت ہیں اور بقول صفی الدین خزرچی ”فقیہ امت“ ہیں

(ملاحظہ ہو کتاب العبر للذہبی والخصاص للخرزجی) ان کی فقہ جامع ترین فقہ بلکہ فقہ اسلامی کی روح ہے کہ جس کی روشنی میں بقیہ ائمہ نے اپنی اپنی فقہ کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے جو مسائل اپنے انتخاب و تلامذہ کو املا کروائے ہیں، ان کی تعداد صاحب عنایہ شارح ہدایہ نے چوتھی صدی کے ایک محقق کے قول کے مطابق بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد بتلائی ہے۔ اگر امت کو یہ سارے مسائل پہنچ جاتے تو شاید بہت سے جدید مسائل حل ہو جاتے، فقہ حنفی کی اسی ہمہ گیری کو دیکھ کر مشہور محقق مورخ ابن خلدون باوجود مالکی المذہب ہونے کے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقہ کی سرزمین، اسلامی تہذیب و تمدن کا گوارہ تھی اس لئے جو پختگی حنفی فقہ کو نصیب ہوئی وہ فقہ المالکی کو نصیب نہ ہو سکی اور شاید یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی شافعی اپنی کتاب ”المیزان“ میں اپنے اس کشف کا ذکر کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب سب مذاہب سے آخر تک رہے گا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس مذہب میں اس کی زیادہ اہلیت ہے کہ جدید نظام کے مسائل پوری طرح حل کر سکے۔ تاہم بہت سے مسائل ایسے ملیں گے اور ہیں جن کا ذکر موجودہ فقہ حنفی کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں نہیں ملتا ہے اور فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں مل جاتا ہے اس لئے اس سلسلہ میں جو بات فکر ناقص میں آئی ہے وہ مرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں اور علما امت کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ اگر وہ صحیح نہ ہو تو ضرور اپنی مخلصانہ تنقید سے سرفراز فرمائیں۔ واللہ یقول الحق وهو یہدی السبیل۔

۶ : _____ مبسوط، بدائع، قاضی خاں سے لے کر ٹھٹھوی، رد المختار اور التحریر المختار تک کتب فقہ حنفی کی ورق گردانی کرنے کے بعد بھی اگر مسئلہ ہاتھ نہ آئے تو اہمات کتب مذاہب ثلاثہ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ فقہ مالکی میں مدونہ کبریٰ سے لے کر خطاب تک اور فقہ شافعی میں کتاب الام سے لے کر تحفۃ المحتاج تک کی مراجعت

کرنی ہوگی۔ حکومت سعودی کی عنایت توجہ سے فقہ حنبلی کا عظیم الشان ذخیرہ طبع ہو کر امت کے سامنے آگیا ہے اس کے لئے مغنی ابن قدامہ، المحرر اور الانصاف کی ورق گردانی کافی ہوگی، الغرض اگر مسئلہ و مطلوبہ مسئلہ ان کتب میں مل جائے تو اس پر فتویٰ دیدیا جائے جدید اجتہاد کی ہرگز ضرورت نہیں اور اگر مسئلہ صراحة نہ ملے تو ان مسائل مصرحہ پر قیاس کرنے میں مضائقہ نہ ہوگا۔ بشرطیکہ قیاس مع الفارق نہ ہو جس کا فیصلہ خود علما کرام فرمائیں گے کہ قیاس کس درجہ میں ہے۔

۷ : — اگر مسئلہ مطلوبہ سب فقہاء کے ہاں ملتا ہے لیکن حنفی مذہب میں دشواری ہے اور بقیہ مذاہب میں نسبتاً سہولت ہے اور عوام کا ابتلا عام ہے تو اخلاص کے ساتھ جماعت اہل علم غور کرے اگر ان کو یقین ہو جائے کہ عموم بلوئی کے پیش نظر عصر حاضر میں دینی تقاضا سہولت و آسانی کا مقتضی ہے تو پھر مذہب مالک، مذہب شافعی، مذہب احمد بن حنبل کو علی الترتیب اختیار کر کے اور اس پر فتویٰ دے کر فیصلہ کیا جائے۔

ہمارے عصر حاضر کے اکابر نے فسخ نکاح کی مشکلات کو اسی طرح حل کیا ہے اور متاخرین نے مسئلہ مفقود الخبر میں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ البتہ تلفیق سے احتراز کرنا ضروری ہوگا اور تتبع رخص کو مقصد نہ بنایا جائے گا۔ مثلاً مسائل معاملات میں بیع قبل القبض ہے کہ آج کل تمام تاجر طبقہ اس میں مبتلا ہے، اب اس کی صورت حال پر غور کر کے پوری طرح جائزہ لیا جائے کہ اگر یہ ابتلا واقعی ہے اور موجودہ معاشرہ مضطر ہے اور بغیر اس کے چارہ کار نہیں تو مذہب مالکی پر فتویٰ دیدیا جائے کہ عدم جواز بیع قبل القبض مطعومات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس مسئلہ میں مذہب حنبلی بھی، مالکی جیسا ہے اور حدیث میں صراحة طعام ہی کا ذکر ہے: ”نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الطعام قبل ان یستوفیہ۔“ (سنن) امام ابو حنیفہ، امام

شافعیؒ نے طعام پر بقیہ چیزوں کو قیاس کر کے منع کر دیا ہے۔

۸ : _____ خلافتِ ائمہ میں اس پر غور کرنا ہوگا کہ اختلاف کا منشا نصوص کا تعارض ہے یا قواعد فقہیہ کا اختلاف یا یہ محض اجتہادی وجوہ کی وجہ سے ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کی جو الہامی رائے فیوض الحرمین میں منقول ہے کہ ائمہ احناف کے اختلافات میں ترجیح کا معیار کیسے قائم کیا جائے اس کو پیش نظر رکھنے سے موجودہ خلافت میں رہنمائی مل سکے گی نیز اختیارات علما کا سلسلہ جو مختلف ادوار میں جاری رہا، اس کو نظیر بنایا جاسکے گا۔ عرف و حالات کے اختلاف سے جو اثرات ہوں گے ان کو بھی ضرور پیش نظر رکھنا ہوگا مثلاً تعلیم القرآن، پھر اذان و اقامت پھر تدریس حدیث و علوم دینیہ پر معاوضہ یا مشاہرہ لینے میں قدامت و متاخرین کے زمانوں کے اختلاف کی وجہ سے جو اختلاف رہا، یہ سب باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔

۹ : _____ جن مطلوبہ احکام کا فیصلہ کرنا ہوگا ان میں طبقات و مراتب قائم کرنے ہوں گے اور یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ مسائل موجودہ معاشرے کے لئے کس درجہ میں مطلوب ہیں کیا ان کے بغیر نظام چل نہیں سکتا؟ یا چل تو سکتا ہے لیکن کسی قدر دقت پیدا ہوگی پھر اس دقت پر غور کرنا ہوگا کہ وہ دقت کس درجہ کی ہے؟

۱۰ : _____ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے موجودہ ملک کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا کہ فقہی اصطلاح کے اعتبار سے یہ ملک دارالاسلام ہے یا دارالامان، یا دارالحرب ہے؟ دارالاسلام کا اصلی مدار ”فصل خصوصیات“ پر ہے کہ پورا قانون تعزیرات و حدود، محاکم شرعیہ عدلیہ قائم ہوں اور معاملات و عقوبات کا قانون مکمل اسلامی ہو، تعزیرات و حدود، قانون اسلامی کے مطابق جاری ہوں، اسی طرح

موجودہ نظام حکومت کا جائزہ لینا اور اس پر غور کرنا ہو گا کہ یہ کس قسم کی حکومت ہے، اسلامی قانون کے نفاذ پر صرف قدرت ہی کافی ہے، یا عملی طور پر اس کی تنفیذ بھی ضروری ہے، عرصہ دراز تک باوجود قدرت قانون اسلام جاری نہیں کیا گیا تو اس کے عوامل و اسباب کیا ہیں اور سابقہ دارالحرب یعنی عہد برطانوی کا دارالحرب تقسیم ہو کر دو حصے بنے ایک حصہ یقیناً اب بھی دارالحرب ہے دو سراسر حصہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی سے کیا دارالاسلام بن جائے گا؟ یعنی قانون تو نہیں بدلا مگر قانون کے چلانے والے بدل گئے تو کیا اس لئے حکم بدل جائے گا؟ پھر جب کہ عہد حاضر میں ”عائلی قانون“ کے نام سے صراحة کتاب و سنت کے خلاف قانون بنایا گیا تو کیا صریح خلاف قرآن قانون بننے کے بعد بھی فقہا اسلام کے مسائل کے مطابق یہ دارالاسلام ہی رہے گا؟ الغرض اس امر کے فیصلہ کرنے کے بعد معاملات کا شرعی فیصلہ ممکن ہو سکے گا۔ عقود فاسدہ، ربوا، بیمہ ان سب مسائل کے صحیح حل کرنے کے لئے اس ملک و حکومت کے متعلق شرعی و فقہی فیصلہ کرنا ہو گا اور یہ غور کرنا ہو گا کہ موجودہ حزب اقتدار آخر اسلامی قانون کے نافذ کرنے سے گریز کیوں کرتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں یہ قانون حائل ہے؟ یا وہ عقیدتاً اسلامی قانون کو موجودہ زمانے کے لئے غیر صالح اور ناکافی سمجھتا ہے ان سب گوشوں پر غور کرنا اور ان سب حالات کا جائزہ لینا ہو گا جب جا کر صحیح فیصلہ ہو سکے گا اور جب اس حکومت یا اس ملک کی فقہی و شرعی حیثیت متعین ہو جائے گی تو پھر ان معاملات کے احکام کا صحیح فتویٰ دیا جاسکے گا جن کا حکم اختلاف دار سے مختلف ہو سکتا ہے۔

یہ چند مختصر اشارے ہیں جن کی حیثیت ایک مختصر ”متن“ کی ہے اور اس کی تشریح ایک مفصل مضمون کی محتاج ہے لیکن چونکہ اصلی مخاطب علما کرام ہیں ان کی خدمت میں یہ اشارات بھی کافی ہوں گے۔

میری خواہش ہے کہ علما کی خدمت میں ان موضوعات کو آئندہ بھی پیش کیا جائے جن پر ان کو غور کرنا ہوگا اور جب تک اجتماعی فیصلہ کا موقع نہ آئے اس سے پہلے انفرادی طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش انہی اصول کے پیش نظر کریں مقصود تین باتیں ہیں :

الف : ----- اللہ کا یہ دین کامل اور ہر معاشرے کے لئے صالح و موزون ہے۔

ب : ----- اسلام کو مشکل سمجھ کر اور ناممکن العمل خیال کر کے اسلام کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ج : ----- جو فریضہ علماء امت کے ذمہ ایسے حالات میں عائد ہوتا ہے ان سے سبکدوش ہو جائیں، نہ جدید اجتہاد کا دروازہ کھولنا ہے نہ تنقیح رخص پر قوم کو آمادہ کرنا ہے نہ ترک تقلید کی بنیاد رکھنا ہے بلکہ یہ سمجھنا ہے کہ قرآن و سنت اور اس کے بعد فقہ اسلامی اور تفقہ فی الدین کے ذریعہ سارے مشکلات حل ہو سکتے ہیں اور فقہاء اسلام اور فقہ اسلامی سے بے نیاز ہو کر دین اسلام کی حفاظت کی تدبیر طفلانہ خیال ہے۔ فقہاء کرام نے دین کی بڑی خدمت کی ہے ایک ہزار برس کے بعد بھی دنیا ان کی جلیل القدر حیرت انگیز خدمات سے مستغنی نہیں ہو سکتی بلکہ قیامت تک ان کی منت پذیر رہے گی۔

الدین النصیحة لله ولکتابه ولرسوله ولائمة المسلمين وعامتهم۔

(مسلم عن تیم الداری)

(بینات ر متعین ۸۳ ۱۳ھ)

اسلامی قوانین میں اجتہاد و عقل کا مقام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ کا عربی مقالہ ”موقف التشريع الاسلامی من الاجتهاد ومنصب العقل فی الدین“ کے عنوان سے ادارہ تحقیقات اسلامی راولپنڈی کی بین الاقوامی کانفرنس ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی القعدہ ۱۳۸۷ھ کے لئے لکھا گیا تھا، مقالہ چونکہ تاخیر سے تیار ہوا تھا اس لئے وہاں نہیں پڑھا گیا، البتہ اس کا خلاصہ زبانی بیان کر دیا گیا تھا، اس لئے اس کا ترجمہ ہدیہ قارئین ہے :

یہ ”اجتہاد“ کے موضوع پر مختصر سا مقالہ ہے، میں (اس وقت) موضوع سے متعلقہ تمام مباحث پر مفصل بحث کا ارادہ نہیں رکھتا مثلاً ”اجتہاد“ کی لغوی تحقیق، اجتہاد کے معانی، حکم، ارکان، شرائط، اقسام، حیثیت اجتہاد پر دلائل اور اس قسم کی اور طویل بحثیں جن سے تمام ائمہ مذاہب کے اصول فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں، چنانچہ ان اکابر نے کسی

چھوٹی بڑی بحث کو نہیں چھوڑا جس کی کما حقہ تحقیق و تنقیح نہ کر ڈالی ہو، یہ سلسلہ اسلام کے قدیم دور سے لے کر علمی دور کے آخری سرے تک جاری رہا ہے، بلاشبہ یہ امت اسلامیہ کی مایہ نخر دولت ہے، جس سے نہ بحث و تنقہ کا طالب علم مستغنی ہے، نہ عصری مسائل کے حل کا مدعی اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلمیذ رشید قاضی القضاۃ ابو یوسفؒ کے دور سے پھر امام شافعیؒ، امام طحاویؒ، جصاصؒ، رازیؒ، ابو زیدؒ، دبوسیؒ، فخرؒ، بزدویؒ، امام غزالیؒ کے دور سے امام رازیؒ اور امام آمدیؒ کے دور تک، اور ان کے دور سے امیر کاتب اتقائیؒ اور ابن ہمامؒ حنفی کے دور تک اسلامی کتب خانے میں (اصول فقہ پر) اتنا بڑا ذخیرہ وجود پذیر ہوا جس سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آج کی فرصت میں میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ محققین اہل علم کی توجہ ”مسائل حاضرہ اور جدید مشکلات میں اجتہاد کے اہم اصولوں“ کی طرف مبذول کراؤں، کیونکہ نئے تمدن نے نئے مسائل کو جنم دیا ہے، اور ان میں بہت سی چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جنہیں قواعد شرعیہ اور فقہ اسلامی کے مطابق ڈھالنا ہماری پہلی ضرورت ہے، ہمارا ایمان ہے کہ دین اسلام، تمام ادیان کے لئے خاتم، اور قیامت تک کی ضرورتوں کا کفیل ہے، چنانچہ کتاب و سنت اور ان سے متعلقہ علوم وہ فیاض چشمے ہیں جن سے حل مسائل کے سوتے ابلتے ہیں پھر صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کا طریق کار ہمارے لئے روشنی کا مینار ہے ان حضرات نے اجتہاد کیا، اور جن ”اصول“ کے احکام نص سے ثابت تھے ان پر (غیر منصوص) کو قیاس کیا، اور نصوص

کے حکم کو فروع و حوادث کی طرف متعدی کرنے کے لئے اجتہاد سے کام لیا، اس طرح اجتہاد و قیاس اصول شرعیہ میں سے ایک اصول قرار پایا، جس سے تفقہ فی الدین کا دائرہ وسیع ہوا، ہم اس حق میں نہیں کہ اس دائرے کو تنگ کر دیا جائے، یا دین خداوندی کے ان فیاض چشموں کو بند کر دیا جائے، کیونکہ کتاب و سنت اور عقل کے دلائل سے ثابت ہے کہ یہ دائرہ ہر دور میں وسیع رہے گا۔

چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ”پس تم عبرت لو! اے عقلمندو!“۔

نیز ارشاد ہے: ”بے شک اس میں عبرت ہے بصیرت والوں کے لیے“۔

اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے حکم کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانے کا نام ”اعتبار“ ہے، اسی لئے جس اصل کی طرف نظائر کو لوٹایا جائے اسے ”عبرة“ کہا جاتا ہے۔

نیز ارشاد ہے: ”اور اگر یہ لوگ اس کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالے کر دیتے تو ان میں جو لوگ اس کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس کو خود ہی جان لیتے“۔

اور استنباط کے معنی ہیں جیسا کہ سرخسی (اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۲۸ طبع جدید حیدرآباد دکن) نے لکھا ہے ”اجتہاد کے ذریعہ حکم منصوص کی علت دریافت کرنا۔“

نیز ارشاد ہے ”پس اگر تم کسی امر میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ“۔

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں :

”یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اللہ و رسول کی طرف

لوٹانے سے مراد کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ہے، کیونکہ یہاں رد کو منازعت پر معلق کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ کتاب و سنت پر عمل کرنا اس شرط پر معلق نہیں، نیز جن احکام شرعیہ پر کتاب و سنت کے نصوص موجود ہوں ان میں اہل ایمان کے نزاع کی صورت مشکل ہی سے پیش آسکتی ہے، اس سے واضح ہوا کہ یہاں مراد وہ منازعت ہے جو ایسے واقعہ میں پیش آئے جس کے لئے کتاب و سنت کا صریح حکم موجود نہ ہو۔ اور ”رد“ سے مراد یہ ہے کہ جس حادثہ میں نزاع واقع ہو غور و فکر سے کتاب و سنت کے منصوص احکام میں اس کی نظیر تلاش کی جائے، اور یہ مماثلت، اجتہاد کے ذریعہ علت حکم کی دریافت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔“

(اصول الفرائض ج ۲ ص ۱۲۹)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی احادیث، اجتہاد، قیاس اور اعتبار کے سلسلہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں ان کی ایک اچھی مقدار، امام سرخسیؒ نے ”اصول“ میں، امام ابن عبدالبرؒ نے ”جامع بیان العلم“ میں اور حافظ ابن قیمؒ نے ”اعلام الموقعین“ میں اور دوسرے اکابر نے جمع کردی ہے، ہم یہاں ”حدیث معاذ“ کے ذکر پر کفایت کرتے ہیں، جو ”سنن“ میں موجود ہے، ائمہ حدیث نے اسے روایت کیا ہے اور تمام امت نے اسے قبول کیا ہے۔

امام غزالیؒ ”المستصفیٰ“ میں لکھتے ہیں :

”اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے، اور کسی نے اس میں طعن یا انکار کا اظہار نہیں کیا، اس لئے اس کا مرسل ہونا قادح نہیں، بلکہ اس کی سند کی تفتیش بھی ضروری نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جن پر پوری امت عمل پیرا ہے مثلاً ”وارث کے لئے وصیت نہیں“ ”کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر نکاح نہ کیا جائے“ ”دو ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے“ وغیرہ (کہ اس عملی توازن کے بعد ان کی اسناد کی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے) البتہ یہ حدیث معاذ اصل اجتہاد میں نص ہے، اور شاید یہ ”تحقیق مناط“ اور ”تعیین مصلحت کے بارے میں ہے“ جہاں کہ اصل کا حکم مصلحت پر معلق ہو، اس لئے یہ قیاس کو صرف اپنے عموم کی بنا پر شامل ہوگی۔“

مگر چونکہ بعض لوگوں نے اسے طویل بحث کا نشانہ بنایا، اور اس کی اسناد کا سوال اٹھایا ہے اس لئے ہم یہاں امام کوثری (مقالات کوثری ص ۶۰ تا ۶۳) کی تحقیق کا خلاصہ اور لب لباب پیش کرتے ہیں، جو اصول حدیث کے قواعد کے مطابق انہوں نے اس کی قوت سند کے بارے میں فرمائی ہے۔

اس حدیث کو امام ابو داؤد، ترمذی اور دارمی نے مختلف الفاظ میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ :

”جب حضرت معاذؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ

و سلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو فرمایا : فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا : کتاب اللہ کے مطابق! فرمایا اگر اس کا صریح حکم کتاب اللہ میں نہ ہو؟ عرض کیا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق! فرمایا : اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی نہ ہو؟ عرض کیا پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور غور و فکر میں کوتاہی نہیں کروں گا! یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اس نے فرستادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ”رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پسندیدہ طریق کی توفیق دی۔“

اس حدیث کو اصحاب معاذ سے حارث بن عمرو ثقفی نے روایت کیا ہے، اور حارث نہ تو مجہول العین ہے، چنانچہ امام شعبہؒ فرماتے ہیں کہ وہ مغیرہ بن شعبہؒ کے بھتیجے ہیں، اور نہ وہ مجہول الوصف ہیں، کیونکہ وہ کبار تابعین میں، ابو عون ثقفی (م ۱۱۶ھ) کے طبقہ شیوخ میں ہیں، اور ان کے بارے میں کوئی ”جرح مفسر“ ثابت نہیں، اس لئے ان کی ثقاہت اور قبول روایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے، اس کے بعد ان کے اہل طبقہ سے نقل توثیق کی حاجت نہیں رہ جاتی، اور تمام تابعین کے حق میں خیر کی شہادت دی گئی ہے وہ سب ثقہ اور عادل ہیں، جب تک کہ ان میں جرح مؤثر اور جرح مفسر ثابت نہ ہو، اور صحابہؓ سب عادل ہیں، ان میں کسی قسم کی جرح بھی مؤثر نہیں، علاوہ بریں حارث کو ابن حبان نے ”ثقاۃ“ میں ذکر کیا ہے۔ اور یہ حدیث اس وجہ سے بھی ضعیف نہیں قرار دی جاسکتی کہ ابن عون

حارث سے اس کی روایت میں متفرد ہیں، اس لئے کہ ثقہ راوی کے تفرد کی وجہ سے حدیث کو رد کردینا اہل حق کا اصول نہیں، اور ابن عون، امام اعمش، ابو اسحاق، مسعر، شعبہ، ثوری اور ابو حنیفہ جیسے اکابر کے استاذ، صحیحین کے راوی، اور باتفاق اہل نقد ثقہ ہیں۔

ابن عون سے اس حدیث کو ابو اسحاق شیبانی اور شعبہ بن حجاج نے روایت کیا ہے، اور ابو اسحاق سے ابو معاویہ، ضریر نے، اور شعبہ سے یحییٰ بن سعید قطان، عثمان بن عمر عبدی، علی بن جعد، محمد بن جعفر، عبد الرحمان بن مہدی اور ابو داؤد طیالسی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور ان حضرات سے بے شمار لوگوں نے روایت کیا، یہاں تک کہ فقہا تابعین نے اس حدیث کو بالاتفاق قبول کیا۔

اور اس حدیث کو اس وجہ سے رد کردینا کہ یہ اصحاب معاذ سے مروی ہے اور وہ مجہول ہیں، چند وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً : اس لئے کہ اصحاب معاذ، دین و ثقاہت میں معروف ہیں، اور ناممکن ہے کہ کوئی شخص اصحاب معاذ میں سے کسی ایک کے حق میں بھی جرح ثابت کر سکے، (اور ثقہ کا مبہم ہونا مضر نہیں)۔

ثانیاً : اس لئے کہ اصحاب معاذ کا بلا تعین ذکر، اس امر کی دلیل ہے کہ روایت کے اعتبار سے یہ حدیث حد شہرت کو پہنچی ہوئی تھی، جیسا کہ قاضی ابوبکر ابن عربی نے کہا ہے، چنانچہ امام بخاری نے عروہ باری کی حدیث کی سند اس طرح نقل کی ہے! ”میں نے قبیلہ کے لوگوں کو عروہ سے روایت کرتے سنا ہے۔“ اس کے باوجود یہ روایت درجہ صحت سے نہیں گری، اور امام مالک نے ”قسامہ“ میں سند یوں بیان کی ہے ”اسے اس کی قوم

کے بڑے لوگوں میں چند مردوں نے خبر دی۔“ نیز صحیح مسلم (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۷۰ طبع رشیدیہ دہلی) میں زہری سے یوں روایت ہے کہ ”مجھ سے چند مردوں نے بروایت ابو ہریرہؓ یہ حدیث بیان کی ہے کہ جس نے جنازہ کی نماز پڑھی اس کے لئے ایک قیراط ہے۔“

مثلاً : اس لئے کہ تاریخ ابن ابی خیشمہ (بحوالہ مقالات کوثری ص ۶۳) میں بروایت شعبہؒ یہ لفظ ہیں ”میں نے مغیرہ بن شعبہؒ کے بھتیجے حارث بن عمروؒ سے سنا وہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ کی یہ حدیث بیان کرتے تھے۔“ حافظ ابن عبد البر (جامع بیان العلم وفضله و ماینبغی فی روایتہ و حملہ لابن عبد البر ج ۲ ص ۵۵ طبع منیریہ مصر) نے بھی ”جامع بیان العلم“ میں اسی طرح روایت کی ہے، اندریں صورت اصحاب معاذ رضی اللہ عنہم سے مراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ سب عادل ہیں۔

رابعاً : اس لیے کہ خطیب بغدادی ”الفقیہ والمتفقہ“ میں لکھتے ہیں :

”حارث بن عمرو کا ”عن اناس من اصحاب

معاذ“ کہنا شہرت حدیث اور کثرت رواۃ کی دلیل ہے،

اور حضرت معاذؓ کا فضل وزہد معروف ہے (ان کے

اصحاب بھی معمولی درجہ کے لوگ نہیں ہوں گے) اور

کہا گیا ہے کہ عبادہ بن نسی نے اسے بروایت عبد الرحمن

بن غنم حضرت معاذؓ سے روایت کیا ہے، اور یہ سند

متصل ہے اور اس کے راوی سب ثقہ ہیں، علاوہ بریں

اہل علم نے اسے بالاتفاق قبول کیا ہے، اور اس سے

استدلال کیا ہے، جس سے واضح ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک درجہ صحت رکھتی ہے۔“

حاصل یہ کہ فقہاء و محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح اور ثابت ہے، اگر اس کے ساتھ خارجی قرائن اور تائیدی روایات کو بھی ملا لیا جائے تو یہ قریباً تواتر معنوی کا درجہ رکھتی ہے امام کوثریؒ کی تحقیق کا خلاصہ ختم ہوا۔ اور جدید مسائل میں حجیت اجتہاد کی عمدہ ترین دلیل وہ حدیث ہے جسے امام نسائیؒ نے سنن میں ”باب الحکم باتفاق اہل العلم“ کے ذیل میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے طویل اثر میں روایت کیا ہے کہ :

”پس اگر ایسا معاملہ پیش آئے جس کا صریح حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرمایا ہو تو وہ فیصلہ کرے جو سلف صالحین نے کیا ہو، اور اگر ایسا معاملہ درپیش ہو جو نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ کیا ہو، نہ سلف نے، تو اپنی بصیرت سے اجتہاد کرے، اور یہ نہ کہے کہ میں ڈرتا ہوں، میں ڈرتا ہوں، کیونکہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ اور حلال و حرام کے مابین بعض چیزیں مشتبہ ہیں، اس لئے اس پہلو کو چھوڑ دو جو کھٹک پیدا کرے اور وہ پہلو اختیار کرو جس میں کھٹک نہ ہو۔“

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ”یہ حدیث بہت عمدہ ہے“ اور اسی کی مثل حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔
(سنن نسائی ج ۲ ص ۲۶۴، سنن دارمی ص ۳۴)

اور عقلی حیثیت سے اجتہاد کی ضرورت بالکل واضح ہے، امام سرخسیؒ فرماتے ہیں :

”کوئی حادثہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے، حلت یا حرمت، وجوب یا عدم وجوب کا حکم نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ ہر حادثہ میں نص صریح نہیں ہوگی کیونکہ نصوص محدود و متناہی ہیں، جب کہ قیامت تک کے حوادث غیر متناہی اور حادثہ کا نام ”حادثہ“ رکھنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس میں نص نہیں ہوگی، ورنہ جس پر نص صریح موجود ہو وہ ”اصل معمود ہوا“۔

(اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۳۹)

حاصل یہ کہ زندگی رواں دواں ہے، اور وہ اپنے جلو میں بہت سے نئے مسائل کو لاتی ہے، اس لئے ہمارا فرض یہ ہونا چاہئے کہ ہم کتاب و سنت، اجماع امت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کا حل، اس طرح تلاش کریں کہ نہ تو کج روی اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکیں نہ بزدلی سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔

تشریع اسلامی کی تاریخ، فقہی دور کی تکمیل اور ہر زمانے میں جدید مسائل پر کتابوں کی تصنیف اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جن مسائل میں کتاب و سنت کے نصوص موجود نہیں، ان میں اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، چنانچہ امت اسی اصول پر کاربند رہی ہے، اس لئے جواز اجتہاد پر مزید بحث کی ضرورت نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے عقل پیدا کی ہے، انسان میں امانت

الہیہ کی برداشت کا مدار اسی پر رکھا ہے اور ”بصائر و عبر“ میں غور و تدبر کی بار بار دعوت دی ہے۔

امام فخر الاسلام بزدویؒ فرماتے ہیں :

”عقل بدن انسان میں ایک نور ہے جیسا کہ زمینی عالم میں آفتاب، اس سے وہ راہیں کھلتی ہیں جہاں حواس ظاہری کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے، پھر یہ بذات خود رہنما نہیں، بلکہ اس کا کام صرف راستے کا اجاگر کر دینا ہے، راستہ واضح ہو جانے کے بعد اس کا ادراک، قلب اپنے نور فہم سے کرے گا، جس طرح طلوع آفتاب سے راستہ کھل جاتا ہے، مگر راستہ نظر آنے کے لئے تنہا سورج کی روشنی کافی نہیں بلکہ چشم بینا کی بھی ضرورت ہے۔“

بہر حال عقل، ایک نور ہے، ایسا نور! جس سے اوہام کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں، ایسا نور! جس سے علل احکام کی راہیں اجاگر ہو جاتی ہیں، حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں عقل کی مدح و توصیف فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے :

”ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں۔“

”ان کے لئے دل ہوتے ہیں جن سے سمجھتے ہیں۔“

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

”یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم نشانیاں ان

لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں۔“

”بہرے، گونگے اور اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے۔“

”اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر جو نہیں سوچتے۔“
 ”اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے۔“
 ”کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل۔“

”سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے۔“

”شاید وہ سوچے یا ڈرے۔“

”اور سوچ وہی کرے جو رجوع رہتا ہو۔“

”اور ناکہ سمجھیں عقل والے۔“

”اور بیان کرتا ہے اللہ، مثالیں لوگوں کے واسطے

ناکہ وہ فکر کریں۔“

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ بلاشبہ عقل، نور فروزاں ہے مگر اس کے لئے ایک خاص دائرہ ہے جس سے آگے قدم بڑھانا اس کے لئے ممکن نہیں، اور جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے وہاں سے عقل سے بالاتر ایک دائرہ شروع ہوتا ہے، اور وہ وحی الہی اور نبوت الہیہ کا دائرہ ہے، لاریب کہ عقل ان امور کا ادراک نہیں کر سکتی جو وحی کی آنکھ سے نظر آتے ہیں، عقل کے لئے یہی فخر کیا کم ہے کہ وہ، وحی کے بیان کردہ حقائق کا ٹھیک ٹھیک ادراک کر لے، اور اپنے نور خداداد سے ان حقائق کی بلند حکمتوں، گہری مصلحتوں اور باریک اسرار و علل کا سراغ لگانے میں وہ کامیاب ہو جائے۔ اس سے واضح ہوا کہ کتاب و سنت، شرائع الہیہ اور

احکام منصوصہ کے سامنے سر جھکانے اور ادب و وقار اور تسلیم و انقیاد کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا ہونے کے سوا عقل کو کوئی چارہ نہیں، اور اگر حقائق وحی تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو اسے اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ نصوص وحی کے ہوتے ہوئے بھی عقل کو ہر چیز میں مقدم رکھنا بڑی گھناؤنی جسارت ہے، اور نصوص وحی کے نہ ہونے کی صورت میں بھی اس سے کام نہ لینا نری حماقت اور کوتاہی ہے، صحیح راستہ ان دونوں کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے، اور وہی صراط مستقیم ہے۔

البتہ یہاں چند اہم نکات کی طرف اشارہ ہمارے لئے بے حد ضروری ہے جن سے موضوع کھل کر روشن ہو جائے۔

اول : اجتہاد کے لئے قرآن و حدیث اور اجماع امت کا علم، فقہ اسلامی کی کتابوں سے واقفیت، اور فہم کتاب و سنت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے، ان میں مہارت از بس ضروری ہے خصوصاً ”علم اصول فقہ“ میں کامل بصیرت ہونی چاہیے کہ اس کے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں چل سکتے۔

دوم : بالغ نظری اور دقیقہ رسی کے ساتھ تقویٰ، خشیت الہیہ اور دین خداوندی کے ساتھ کامل اخلاص۔

سوم : شورائی اجتہاد کا اہتمام چونکہ ایسے یکتا اشخاص کا وجود، جو ان مجتہدانہ صفات میں کامل ہوں، بیحد مشکل ہے، اس لئے ”شخصی رائے“ کی کمی کو ایسی جماعت کی آراء سے پورا کیا جانا چاہئے، جن میں، فرداً فرداً نہ سہی، مگر مجموعی حیثیت سے یہ تمام صفات کامل طور سے جمع ہوں، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ

جدید مسائل میں انفرادی رائے کے بجائے ”فقہاء عابدین“ سے مشورہ کیا جائے۔ امام طبرانی نے یہ حدیث، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے، فقیہ الامت ہونے کے باوجود، انفرادی اجتہاد نہیں کیا، بلکہ اس مقصد کے لئے ایسے چالیس افراد کی جماعت تشکیل کی جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ یکتائے زمانہ تھا جیسا کہ الموفق نے ”مناقب ابی حنیفہؒ“ میں ذکر کیا ہے۔

چہارم : جب کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل، مذاہب اربعہ میں سے کسی میں موجود ہو، بشرطیکہ وہ رائے شاذ اور اجماع امت کے خلاف نہ ہو، تو ہمیں اسی کو اختیار کرنا ہوگا تاکہ اجتہاد جدید اور مذاہب مجتہدین سے خروج کی ضرورت نہ رہے۔

پنجم : چونکہ ہمارے ملک میں حنفی مسلک رائج ہے، اس لئے بدون شدید اضطراب کے بلاوجہ اس سے ٹکنا اور ”رائے عامہ“ کو خوا مخواہ پریشان کرنا، غیر معقول ہوگا۔

ششم : جن مسائل میں نصوص قطعیہ موجود ہوں وہ ہر دور میں دائرہ اجتہاد سے خارج ہیں، اجتہاد صرف ان مسائل تک محدود ہے جو نہ منصوص ہوں نہ اجماعی، اس لئے اس کی گنجائش نہیں کہ کسی حکم کی علت، مصلحت یا حکمت تراش کر اسے ایسے طور پر مدار حکم قرار دے لیا جائے کہ اس سے نص کا غیر معمول بہ ہونا یا اجماع امت کا باطل ہونا لازم آئے یہ طرز عمل تقریباً الحاد و تحریف سے جا ملتا ہے اور بہت سے لوگ جہل یا عناد کی بنا پر اس کے مرتکب ہیں۔

(حجتہ اللہ البالغہ باب الفرق بین المصالح والضرر)

ہفتم : مسائل جدیدہ میں اجتہاد کے لئے، خلافت راشدہ خصوصاً خلافت شیعین حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما، کو نظیر بنانا، ناممکن ہے، کیونکہ خلافت راشدہ کا مقام، منصب اجتہاد سے بالاتر ہے، اور خلافت راشدہ کے فیصلوں کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم، شارع علیہ السلام کی طرف سے امت کو دیا گیا ہے۔

ہشتم : مذاہب مختلفہ کو ملانے (تلفیق) اور اضطراری حالت کے بغیر، مذاہب فقہاء سے چھانٹ چھانٹ کر رخصتوں کو تلاش کرنے سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ یہ دین ہی سے نکل جانے کے مرادف ہے۔

نہم : جدید تمدن کی بدولت غیر اسلامی ممالک میں بیشتر ایسے قوانین رائج ہیں، جو روح اسلام کے منافی، اور قطعیات اسلامیہ سے ٹکراتے ہیں، انہیں ”اضطرار“ کے بہانے سے اسلامی معاشرے میں جوں کا توں فٹ نہ کیا جائے، بلکہ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اسلام میں اس کا جو ”بدل“ موجود ہے اسے اختیار کیا جائے، مثلاً ”بینک کاسود“ ”بیمہ“ اور ”کمیشن ایجنسی“ کا مسئلہ ہے، کہ اسلام میں اس کا بدل ”شرکت“ ”قراض“ اور ”کفالت“ وغیرہ کی صورت میں موجود ہے، جس کے ہوتے ہوئے ان حرام امور کے ارتکاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

اشکال کی جڑ ”بنیاد“ یہ ہے کہ ہم غیر اسلامی قوانین کو، ان میں رتی بھر تبدیلی کئے بغیر، اسلامی اصول پر منطبق کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور جب وہ فٹ نہیں ہوتے تو گمان کر لیا جاتا ہے کہ اسلام۔ معاذ اللہ۔ جدید دور کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

یہ یاد رہے! کہ اصول اسلامیہ کا سرچشمہ ذات خداوندی ہے جس کا علم صحیح قیامت تک کے حوادث کو محیط ہے اور جس کی قدرت ازلیہ کاملہ کسی چیز سے عاجز نہیں، کیونکہ یہ شریعت اس ذات کی طرف سے آئی ہے جو علیم وخبیر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی۔

دہم : الجاء واضطرار کے درمیان اور عیش پرستی، زرا ندوزی اور امیر سے امیر تر بننے کی حرص کے درمیان جو نمایاں فرق ہے، اسے ملحوظ رکھنا چاہئے ایک بھوکا نگافاقہ کش ہے، جسے قوت لایموت بھی میسر نہیں، اور ایک وہ امیر کبیر ہے، جس کا گھر طرح طرح کے اسباب تنعم سے بھرا پڑا ہے، مگر اس کی حرص کی، جنم کو صبر نہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہو گا کہ دونوں کا حکم یکساں قرار دیا جائے، پہلی صورت اضطرار کی ہے (جس میں سد رمق تک مردار کھانے کی اجازت ہے) اور دوسری اسراف و تبذیر کی۔ (جس کے لئے مجبوری کا بہانہ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے)۔ اور بد فہمی (اسی طرح کے) مضحکہ خیز لطیفوں بلکہ ماتم انگیز حادثوں کو جنم دیا کرتی ہے، حق تعالیٰ رحم فرمائے اس پر جو انصاف سے کام لے۔

”اسلامی قوانین میں اجتہاد کا مقام“ پر یہ چند مختصر اشارے عرض کئے گئے ہیں، جن میں تنگی وقت کے پیش نظر تفصیلات کے بجائے اجمال سے کام لیا ہے، اس میں شک نہیں کہ موضوع کی اہمیت شرح و بسط کی متقاضی تھی، تاہم جس چیز کا پورا ادراک ممکن نہ ہو، اسے بالکل کیلئے چھوڑ دینا بھی زیبا نہیں، کافی آنکھ کا رونا بھی صد غنیمت ہے، اور نادار کی کل کائنات اس کے چند آنسو ہوتے ہیں، میرا حال وہی ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے :

عاشق کی پونجی وہ سوزدروں ہے جس کی غمازی
رخسار پر بہتے ہوئے چند آنسو کیا کرتے ہیں

الاجتهاد فی الاسلام

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى،

اللهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه، وارنا

الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه، اما بعد:

اسلام کی تعمیر نو کے عنوان سے جدت پسندوں کی طرف سے جن مختلف نظریات کا اظہار کیا جاتا ہے، ان کا قدر مشترک یہ ہوتا ہے کہ موجودہ اسلام اپنے اصول و فروع، کلیات و جزئیات، عقائد و اعمال، عبادات و اخلاق، معاملات و سیاسیات الغرض اپنے انفرادی و اجتماعی نظام کی ہر جہت سے عہد جدید میں ناقابل عمل ہے، اس سلسلہ میں بعض حضرات تو اسلام سے بدظن کرنے کے لئے ”غلط منطق“ کا استعمال کرتے ہیں، بعض شرعی اصطلاحات کے ”بگاڑنے“ میں مصروف ہیں، بعض اسلام کو ملازم اور قدامت پرستی کا خطاب دے کر اپنی خوش طبعی کا مظاہرہ فرماتے ہیں، لیکن بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو اسلام کی بعض بنیادی اصطلاحات سے ناواقف، یا پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں، انہی اصطلاحات میں سے ایک ”مسئلہ اجتہاد“ ہے، بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ ”اسلام میں اپنی ضروریات کے موافق کتر بیونت یا ترمیم و اضافہ کرتے رہنے کا نام ”اجتہاد“ ہے۔ انہیں علمائے کرام سے یہ

شکایت رہتی ہے کہ وہ ایسے اجتہاد کی اجازت کیوں نہیں دیتے، ایک صاحب بڑے درد سے لکھتے ہیں :

”خود اسلامی دنیا کے اندر کی موجودہ صورت حال بڑی افسوس ناک ہے، روایت پسند علما کے نزدیک کئی صدیاں پہلے ”اسلامی تخلیقی فکر“ ایک مقام پر آکر رک گیا ہے، علماء زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کرتے ہیں، ان کے نزدیک اس تمام مدت میں نہ تو کوئی انقلابات ہوئے ہیں اور نہ اسلام کی نئی تعمیر کی کبھی ضرورت پیدا ہوئی ہے، دوسری طرف جدید صاحب علم میں صبر و ضبط نہیں، وہ یہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ آخر روایت پسند علما کا کیا موقف ہے؟ چنانچہ ان دو فریقوں میں جو کہ ”کٹر پن“ اور ”آزادی فکر“ کے دو نقطہ ہائے نظر کے حامل ہیں، کسی قسم کے باہمی تعاون کا بہت ہی کم امکان نظر آتا ہے۔“ (ماہنامہ ”فکر و نظر“ ص ۶۶۲، اپریل ۱۹۶۷ء)

اس تحریر میں علما کرام کی طرف جو چار دعوے منفی نوعیت کے منسوب ہوئے ہیں، اسے تو صرف ”صبر و ضبط“ کی کمی کی بنا پر ”غلط فہمی“ کہا جاسکتا ہے مگر یہ غلط فہمی بعض ایسے حضرات کے یہاں بھی پائی جاتی ہے جن کے علم و فضل کے پیش نظر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ معاملہ کی نوعیت کو بہتر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چنانچہ ایک اونچے درجے کے قابل احترام بزرگ فرماتے ہیں :

”ایک طرف تو روایت پرست علما کا طبقہ ہے جو اپنے ائمہ کے اقوال میں شوشہ بھر تبدیلی روا نہیں رکھتے اور ان کی آرا کو پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں، ان کی دانست میں دین اپنی تمام جزئیات کے ساتھ مدت مدید سے اپنی آخری صورت اختیار کر چکا ہے، اور اس میں مزید تفکر و تفقہ کی گنجائش نہیں، یہ طبقہ عموماً علوم جدیدہ کی مبادیات سے بھی نا آشنا ہے، اور عصر جدید کے تقاضوں سے بے خبر، اسلاف کے صحیفوں سے سرمو اختلاف ان کی نظر میں کفر کے مترادف ہے، دوسری طرف وہ جدت پسند طبقہ ہے جو مغرب کی خیرہ کن مادی ترقی سے مرعوب ہے، اور دبستان جمود کے خلاف رد عمل میں دین سے بیزار کی حد تک پہنچ چکا ہے، یہ طبقہ اشتراکی کوچہ گردوں کا ہمنوا بن کر مذہب کو فطری ارتقا کے راستے کا روڑا سمجھتا ہے، اس کے نزدیک لادینی مملکت ہی ہمارے تمام دکھوں کا مداوا ہے۔“

(پیش لفظ مجموعہ قوانین اسلام از عالی جناب جسٹس ایس اے رحمن صاحب)

حالانکہ علما کرام سرے سے اجتہاد کے منکر نہیں، نہ کسی صاحب بصیرت کو اس سے انکار ہو سکتا ہے نہ کسی قابل اعتماد عالم نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کرنا گناہ ہے، البتہ علمائے کرام ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے موجب اجتہاد کے لئے موقع و محل اور اہلیت کا لحاظ

رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، وہ اپنے جدت پسند بھائیوں سے صرف اتنی درخواست کرتے ہیں کہ بسم اللہ! اجتہاد کیجئے، لیکن خدا را پہلے اجتہاد کی اہلیت پیدا کر لیجئے، اور اتنی تحقیق فرمائیجئے کہ جہاں ہم اجتہاد کا شوق فرماتے ہیں وہ اجتہاد کا محل بھی ہے یا نہیں؟ اس صورت حال کے پیش نظر مناسب معلوم ہوا، کہ محل اجتہاد اور اہلیت اجتہاد پر چند حروف لکھے جائیں کیا بعید ہے کہ کسی انصاف پسند بزرگ کو صحیح فہم کی توفیق نصیب ہو جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

الف: محل اجتہاد: ”ہمارے سامنے جب کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جس کے بارے میں خدا اور رسول کا صریح حکم موجود نہ ہو، وہاں اپنے علم و فہم اور وسعت و طاقت کی امکانی حد تک یہ معلوم کرنا کہ شرعی نصوص کی روشنی میں اس کا حکم کیا ہے؟“ اسے شرعی اصطلاح میں اجتہاد کہا جاتا ہے۔

(ملاحظہ ہوں کتب اصول فقہ بحث اجتہاد)

چنانچہ:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر اور قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت فرمایا کہ معاذ! جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو گا تو فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا: اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا، فرمایا: اگر اس کا حکم کتاب اللہ میں تمہیں نہ ملے؟ عرض کیا: اس صورت میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروں گا، فرمایا: اگر اس کا حکم تمہیں سنت

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا اس صورت میں اجتہاد کی پوری قوت استعمال کروں گا، اور حکم الہی کی دریافت میں ذرا کوتاہی نہیں کروں گا۔“ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”الحمد لله الذى وفق رسول الله صلى الله عليه وسلم لما يرضى به رسول الله -“ (اس اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے رسول اللہ کے فرستادہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ طریقہ کی توفیق عطا فرمائی۔“
(مشکوٰۃ الصالح ص ۳۲۳)

آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد امت کی رشد و ہدایت اور کامل راہنمائی کے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول دو چیزیں موجود تھیں، لیکن ایک ایسی امت جسے قیامت تک رہنا اور مختلف اقوام و ملل پر حاوی ہونا تھا جس کی ترکیب مختلف قسم کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے افراد سے ہونی تھی، اس کے بارے میں یہ خطرہ بہر حال موجود تھا کہ ان کے درمیان کسی وقت کتاب و سنت کی تعبیر و تشریح میں ایسا اختلاف پیدا نہ ہو جائے جس سے ایک طرف امت کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور دوسری طرف کتاب و سنت کے نام پر ایسے نظریات پیش کئے جانے لگیں جو ”پیغمبرانہ دعوت“ اور ”اسلامی مزاج“ ہی سے متصادم ہوں اور حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے، اس لئے ضرورت تھی کہ آنے والی امت کے لئے کتاب و سنت کی تشریح و تعبیر میں حق و باطل اور صحیح و سقیم کے جانچنے کا ایک

معیار مشخص کر دیا جائے، تاکہ جس طرح کتاب و سنت صراط مستقیم کے لئے
 مینارۂ نور ہیں، جن کی روشنی میں امت قیامت تک صراط مستقیم پر چلتی رہے گی،
 اسی طرح کتاب و سنت کی تشریح و تعبیر کے لئے بھی ایک شاہراہ مقرر کر دی
 جائے، جس سے امت تحریف اور فکری انتشار کی مختلف وادیوں میں بھٹکنے سے
 ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے، اس شاہراہ کا سنگ میل ”اجماع امت“ قرار
 دیا گیا، جسے قرآن حکیم نے ”سبیل المومنین“ کے موجز لفظ میں بیان فرمایا
 ہے:

”ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى
 ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى و نصله
 جهنم و ساءت مصيرا“

ترجمہ: اور جو شخص رسولؐ کی مخالفت کرے گا،
 بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور ”مسلمانوں کا
 رستہ“ چھوڑ کر دوسرے راستے ہو لیا، ہم اس کو جہنم میں داخل
 کریں گے، اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

یہ ”المؤمنین“ جن کے ”اجماعی“ راستے کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کرنے
 والوں کو قرآن حکیم نے دنیا میں توفیق الہی سے محروم ہونے اور آخرت
 میں واصل جہنم ہونے کی خبر دی ہے، جانتے ہو کون ہیں؟ اول شیخین، پھر
 خلفاء راشدین، پھر جماعت صحابہ، پھر خیر القرون پھر ہر صدی کے وہ ”سلف
 صالحین“ جو پوری احتیاط سے پھونک پھونک کر صحابہؓ کے نقش قدم پر چلے، علی

حسب المراتب ان ہی حضرات کا ”اجماعی راستہ“ سبیل المؤمنین کا مصداق ہے، جسے قرآن حکیم حق و باطل کی میزان قرار دیتا ہے، اور صحابہؓ، تابعینؓ اور سلف صالحینؓ کے اجماعی مسائل کو چھوڑ کر نئی راہ نکالنے والوں کو بے توفیق، باطل پرست اور دنیا و آخرت میں زیاں کار بتلاتا ہے، قرآن کے بیان فرمودہ ”سبیل المؤمنین“ کی تشریح خود صاحب قرآن ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے سنئے :

۱..... ”انی لا ادری ما بقائی فیکم قاقتدوا بالذین

من بعدی ابی بکر و عمر“ — (مشکوۃ المصابیح ص ۵۶۰)

۲..... ”فانه من یعش منکم بعدی فسیری اختلافا

کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين

المهدين تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ،

وایاکم و محدثات الامور، فان کل محدثة بدعة و

کل بدعة ضلالة“ — (مشکوۃ المصابیح ص ۳۰)

ترجمہ: مجھے معلوم نہیں میں تمہارے درمیان

کتنی مدت موجود رہوں گا، اس لئے ان دو بزرگواروں کی

اقتداء کرنا جو میرے بعد یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوں گے

یعنی ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما)۔

ترجمہ: ”تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہا وہ بہت

سا (نظری اور عملی) اختلاف دیکھے گا پس (اندریں حالت)

تم میری سنت کو اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑ لینا،

اسی کو تھامے رکھنا اور دانتوں سے مضبوط پکڑے رکھنا،
 اور (خلاف سنت) نئی نئی من گھڑت باتوں سے بچے رہنا،
 اس لئے کہ ہر نئی من گھڑت چیز بدعت ہے اور ہر بدعت
 گمراہی ہے (اور گمراہی کا انجام جہنم ہے کمافی روایت)۔“

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو بات قرآن حکیم نے ”سبیل المؤمنین“ سے
 ہٹ کر چلنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمائی اسی کی وضاحت اس حدیث پاک
 میں ارشاد فرمائی گئی ہے، اس لئے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اگرچہ خود
 صاحب وحی نہ تھے لیکن فکری و عملی اعتبار سے صاحب شریعت ﷺ کا کامل
 نمونہ، منشائے نبوت کے مزاج شناس اور وحی الہی کے اولین مخاطب تھے، ان کی
 نظر آنحضرت ﷺ کے ایک ایک اشارے پر جمی ہوئی تھی، وہ شریعت کے
 اصول و فروع، کلیات و جزئیات اور دقائق و اسرار کی آخری بلندیوں تک رسائی
 رکھتے تھے، امام الہند حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے لفظوں میں :

”ایام خلافت بقیہ ایام نبوت بودہ است گویا در ایام نبوت
 حضرت پیغامبر ﷺ تصریحا برہان مے فرمود و در ایام
 خلافت ساکت نشسته بدست و سر اشارہ میفرماید۔“

(ازالۃ الخافص ۲۵ ج ۱)

ترجمہ: ”خلافت راشدہ کا دور، دور نبوت کا تتمہ تھا، گویا
 دور نبوت میں آنحضرت ﷺ صراحۃً زبان سے حکم فرماتے
 تھے، اور دور خلافت میں خاموش بیٹھے سر اور ہاتھ کے اشاروں

سے سمجھاتے تھے۔“

پس جس طرح ”نبی“ وحی الہی کا راز دار اور منشائے خداوندی کا مزاج شناس ہوتا ہے، اس کی جانب سے وحی الہی کی جو تفسیر کی جائے گی وہ امت کے لئے قطعی ہوگی، اسی طرح خلفائے راشدین کے دور میں کتاب و سنت کے اشارات کی جو تفسیر و تشریح کی گئی بعد کی امت کے لئے وہ واجب القبول ہوگی، اور تغیر و تبدل سے بالاتر۔

دوسری صدی کے مجدد خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے :

”سن رسول ﷺ وولاء الامر من بعدہ سننا،

الاخذ بها تصدیق لکتاب اللہ واستکمال لطاعته

وقوة على دين الله، ليس لاحد تغييرها ولا

تبديلها ولا النظر فيما خالفها، من اقتدى بها فهو

مهتد ومن استنصر بها، فهو منصور ومن يخالفها اتبع

غير سبيل المؤمنين وولاه الله تولى واصلاه

جهنم وساءت مصيرا۔“ (ازالة الخفاء ص ۱۷۳ ج ۱)

ترجمہ: ”رسول اللہ ﷺ نے اور آپ کے بعد خلفائے

راشدین نے جو سنتیں جاری فرمائیں انہیں اختیار کرنا،

کتاب اللہ کی تصدیق، حق تعالیٰ کی کمال اطاعت، اور دین

خداوندی کی تقویت کا موجب ہے، کسی کو نہ ان کے تغیر

و تبدل کا حق ہے، نہ ان کی مخالف رائے کسی درجہ میں قابل

التفات ہے، جس نے ان کی اقتدا کی وہ ہدایت پر ہے، جس نے ان کے ذریعہ نصرت طلب کی وہ منظور ہے، اور جو شخص ان کی مخالفت کرے گا اس نے مومنین کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے اسی طرف دھکیل دیا جس طرف اس کا منہ ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل کرے گا، اور وہ بہت بری جگہ ہے۔“

خلفائے راشدین کے یہی فیصلے جنہیں جماعت صحابہ نے بالاتفاق قبول کیا آئندہ ”اجماع امت“ کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ”سبیل المومنین“ اور صراط مستقیم کا نشان بن گئے، بعد میں آنے والی امت ان کے نشان قدم کی پیروی میں کسی مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو پر متفق ہو جائے تو یہ خیر کی علامت ہوگی، لیکن ان کی شاہراہ سے ہٹ کر نہ کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، نہ خدا و رسول کے نزدیک اس کی کوئی قیمت ہے، بلکہ ایسا فیصلہ ”اتباع غیر سبیل المومنین“ کا مصداق، ”کل بدعة ضلالة“ کا نشان ”نصلہ جہنم“ اور ”کل ضلالة فی النار“ کا سزاوار ہوگا۔

تیسری صدی کے مجدد امام شافعیؒ کتنی حکیمانہ بات فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اوپر سے نازل ہوئی ہے اس لئے شرعی مسائل میں الاعلیٰ ثم الاعلیٰ کی فطری ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی۔

چنانچہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں :

”العلم طبقات، الاولی: الكتاب و السنة اذا ثبتت

السنة، ثم الثانية: الاجماع فيما ليس فيه كتاب
ولاسنة، والثالثة: ان يقول بعض اصحاب النبي
ﷺ ولانعلم له مخالفا منهم، والرابعة: اختلاف
اصحاب النبي ﷺ - والخامسة: القياس على
بعض هذه الطبقات - ولايصار الى شئ غير
الكتاب و السنة و هما موجودان، وانما يؤخذ
العلم من اعلى - (ازالة الخفا ص ۱۵ ج ۱)

ترجمہ: علم (احکام شرعیہ) کے چند طبقات
ہیں اول، کتاب وسنة ثابتہ، دوم: اجماع امت، جہاں کتاب
وسنت کی تصریح نہ ہو، سوم: آنحضرت ﷺ کے بعض
صحابہ کا قول، جب کہ اس کا خلاف کسی صحابی سے منقول نہ ہو
(یہ اجماع سکوتی کہلاتا ہے) چہارم: صحابہ کرام کا کسی مسئلہ
میں اختلاف ہو (وہاں اجتہاد سے اقرب الی الکتاب والسنة کو
اختیار کیا جائے گا، مگر ان کے تمام اقوال کو چھوڑ کر نئی رائے
کا اختراع جائز نہ ہوگا یہ اجماع مرکب کہلاتا ہے)
پنجم: مذکورہ بالا طبقات میں سے کسی پر قیاس کرنا، اور
صریح کتاب وسنت کے موجود ہوتے ہوئے کسی دوسری چیز
کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا (اور یہ خود شرعاً ممکن ہے
کہ صریح کتاب و سنت کے خلاف اجماع صحابہ قائم

ہو جائے)، علم تو بس اوپر سے لیا جائے گا (اور مذکورہ بالا طبقات میں ’اوپر سے نیچے‘ کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی)

اس سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کی ضرورت صرف اسی موقع پر پیش آتی ہے جس کا صریح حکم نہ تو کتاب اللہ میں موجود ہو، نہ آنحضرت ﷺ کی سنت ثابتہ میں، اور نہ صحابہ کرامؓ اور خیر القرون کے دور میں اس پر کوئی اتفاقی فیصلہ - اجماع - ہو اہو - ورنہ اگر کسی مسئلہ کا حل خود کتاب اللہ میں موجود ہو، یا آنحضرت ﷺ اس کا صاف صاف حکم امت کو بتلا چکے ہوں، یا صحابہ کرامؓ جو قرآن حکیم کے اولین مخاطب اور آنحضرت ﷺ سے براہ راست قرآن و سنت اور دین و شریعت کا فہم حاصل کرنے والے تھے، اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ کر چکے ہوں تو ایسے موقع پر اجتہاد صرف ایک لایعنی فعل ہی نہیں بلکہ ایک ناروا جرأت بھی ہے، کتاب و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کرنے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ اس مجتہد کو نہ خدا کی کتاب پر اعتماد ہے، نہ اس کے نبیؐ پر، اور نہ اس کے خیال میں صحابہ کرامؓ کا مجموعی علم ہی کوئی وزن رکھتا ہے -

حجتہ الاسلام امام غزالیؒ لکھتے ہیں :

”جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ امور عادیہ میں اتباع سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا ہے - ورنہ جن امور کو عبادت سے تعلق ہے اور ان کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے، ان میں بلا عذر اتباع چھوڑ دینے کی سوائے ”کفر خفی یا حماقت جلی“ کے اور کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی -“

سوچنا چاہئے کہ اسلام میں اجتہاد کا مقصد کسی غیر منصوص واقعہ سے متعلق حکم الہی کا دریافت کرنا ہے، یا حق تعالیٰ کے منصوص احکام سے جان چرانا اور انہیں کسی نہ کسی حیلے بہانے سے ٹالنے کی کوشش کرنا؟ اگر مقصد اجتہاد واقعاً حکم الہی کا دریافت کرنا ہے، تو جس صورت میں پہلے ہی سے اللہ و رسول کا صریح اور صاف حکم صریح موجود ہو وہاں اجتہاد کرنا کتنی غیر معقول اور احمقانہ حرکت کہلائے گی؟ اور اگر اجتہاد سے مقصد حکم خداوندی کو درمیان سے ہٹا کر اس کی جگہ ”فرمان قیصری“ کا نفاذ ہے، تو ایسا اجتہاد ہماری بحث ہی سے خارج ہے، اسلام میں ایسے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، اسلام ایسے نام نہاد اجتہاد کو ”تحاکم الی الطاغوت“ اور پرلے درجے کی گمراہی قرار دیتا ہے، جو خالص منافقین کا طرز عمل تو ہو سکتا ہے لیکن کسی مومن سے اس کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

”الم تر الى الذين يزعمون انهم آمنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا به ويريد الشيطان ان يضلهم ضلالا بعيدا، واذا قيل لهم تعالوا الى ما انزل الله والى الرسول رأيت المنافقين يصدون عنك صدودا“ - (النساء: ۶۰)

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف

نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (پھر اس پر یہ حالت ہے کہ) اپنے مقدمے شیطانوں کے پاس لیجانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شرع کی طرف مقدمے لے جانے کے لئے شیطان سکھاتا ہے، پس اس پر عمل کرنا ایسا ہے جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمے لے گئے)، حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان ان کو بھڑکا کر دور لے جانا چاہتا ہے، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور رسول کی طرف، تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ وہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔“ (ترجمہ حکیم الامت تھانوی)

الغرض اس میں شبہ نہیں کہ اجتہاد بھی اسلام کا ایک شرعی حکم اور بنیادی اصول ہے، مگر اسلام میں اس کے حدود بھی متعین ہے، جیسے دوسرے اساسی احکام کے، اس لئے ایسا بے موقع اجتہاد جس سے کتاب و سنت کے نصوص باطل ٹھہریں، صحابہؓ و تابعینؓ کے اجماعی فیصلے غلط قرار پائیں، اور مجموعی طور پر احکام شرعیہ سے اعتماد اٹھ جائے، یہ اجتہاد نہیں بلکہ تلاعب بالبدین (دین کے ساتھ دل لگی) ہے جس کی اجازت نہ قرآن و سنت سے حاصل ہے نہ عقل اس کی تائید کرتی ہے نہ کسی دانشمند نے اسے کبھی اجتہاد کہا ہے، قرآن و حدیث میں تحریف، الحاد، اور تلبیس کے الفاظ اسی قسم کے نام نہاد اجتہاد کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

اجتہاد کے سلسلہ میں خلفاء راشدینؓ اور ائمہ مجتہدینؒ کا طرز عمل کیا تھا؟ ذیل کی تصریحات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ ”اعلام الموقعین“ میں لکھتے ہیں :

”ابو عبیدؒ نے ”کتاب القضا“ میں میمون بن مہران سے روایت کیا ہے، کہ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں جب کوئی مقدمہ لایا جاتا تو کتاب اللہ میں نظر کرتے، اگر اس میں حکم مل جاتا تو فیصلہ کر دیتے، ورنہ سنت رسول اللہ ﷺ میں غور کرتے، اگر اس میں اس مسئلہ کا حل مل جاتا تو فیصلہ کر دیتے، اور اگر انہیں اس بارے میں فیصلہ نبوی کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ فرمایا؟ بسا اوقات لوگ بتلاتے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا تھا، پھر اگر آنحضرت ﷺ کی کوئی سنت بھی نہ ملتی تو علمی اور فقہی اعتبار سے سربر آوردہ لوگوں کو جمع فرما کر ان سے مشورہ کرتے، پھر جب کسی فیصلے پر ان کی رائے متفق ہو جاتی تو اسے نافذ کر دیتے، ورنہ لوگوں کو جمع کرتے اور جب ان کے مشورہ سے کسی فیصلے پر اتفاق ہو جاتا تو اسے نافذ کر دیتے۔“ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۳ و جامع بیان العلم)

اس سے ہمیں خلفائے راشدین کے طرز عمل کے سمجھنے میں مدد ملتی

ہے، گویا یہ طے شدہ اسلامی اصول تھا، کہ پہلے کتاب و سنت کے فیصلوں کو نافذ کیا جائے، اگر کسی معاملہ میں کتاب و سنت کا صریح حکم موجود نہ ہو تو سربر آوردہ اہل علم و دیانت سے مشورہ لیا جائے، اور قرآن و سنت کی روشنی میں جو اتفاقی فیصلہ سامنے آئے اسے نافذ کیا جائے، اور اگر اہل علم کسی فیصلے پر اتفاق نہ کر سکیں تو مجتہد جس فیصلے کو کتاب و سنت سے قریب تر دیکھے اسے اختیار کر لے اور یہی مسئلہ محل اجتہاد قرار پائے گا، اس لئے فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے :

”تم میں سے جو شخص قضاء (فصل خصومات) میں مبتلا ہو جائے، اسے چاہئے کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کرے، اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ ہو تو آنحضرت ﷺ کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرے، اور اگر فیصلہ نبویؐ بھی نہ ہو تو صالحین کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرے، اور اگر ان کا فیصلہ بھی نہ ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔“

(مفتاح الجنۃ للسیوطی ص ۳۲ و اعلام الموقعین)

یہ ”ما قضیٰ بہ الصالحون“ (صالحین کا فیصلہ) ہی ”اجماع امت“ کہلاتا ہے جب کہ سلف صالحین اور ائمہ عدل میں سے کسی نے اس فیصلہ سے اختلاف نہ کیا ہو، چنانچہ امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو لکھا تھا :

”جب تمہیں کوئی حکم کتاب اللہ میں مل جائے تو

اس پر فیصلہ کر دو، پھر کسی اور چیز کی طرف التفات نہ کرو، اور اگر کوئی ایسا قضیہ پیش آئے جس کا (صریح) حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو سنت رسول اللہ ﷺ پر فیصلہ کرو، اور اگر ایسا مقدمہ آئے جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنت رسول اللہ میں، تو صالحین اور ائمہ عدل کے فیصلے کے موافق فیصلہ کرو۔ (اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اجماع الناس (اجماع امت) کے موافق فیصلہ کرو) اور اگر ایسا واقعہ پیش آئے، جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو، نہ سنت رسول اللہ میں، اور نہ تم سے پہلے اس میں کسی نے کلام کیا ہو، اس صورت میں دل چاہے تو اجتہاد کی ہمت کرو یا اس سے باز رہو، اور میرا خیال ہے کہ تمہارے لئے باز رہنا ہی خیر کا باعث ہے۔“

(اعلام المؤمنین ج ۱ ص ۶۲)

خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؓ نے عدی بن ارطاة کو لکھا:

”اما بعد! علیٰ درجہ کا فیصلہ ان احکام کی اتباع ہے جو کتاب اللہ میں پائے جاتے ہیں، پھر سنت رسول اللہ کے موافق فیصلہ کرنا پھر ائمہ ہدیٰ کے فیصلے، پھر اہل علم و اہل رائے سے مشورہ لینا۔“

(اخبار القضاۃ ص ۷۷ ج ۱)

خلفائے راشدین کے بعد ائمہ مجتہدین بھی اسی اصول پر قائم تھے، ائمہ اربعہ سے تواثر کے ساتھ منقول ہے کہ وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کو لیتے تھے،

پھر سنت نبوی کو اختیار کرتے تھے، پھر صحابہ و تابعین کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے اور بالکل ناگزیر اور آخری صورت میں کتاب و سنت کو سامنے رکھ کر مسائل کا استخراج کرتے تھے، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ اپنے ”فقہی منہاج“ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے :

”میں پہلے کتاب اللہ کو لیتا ہوں، اگر مجھے کوئی حکم کتاب اللہ میں نہیں ملتا تو سنت رسول اللہ کو لیتا ہوں، اور اگر کوئی مسئلہ نہ کتاب اللہ میں ہو نہ سنت رسول اللہ میں تو میں قول صحابہ پر عمل کرتا ہوں (اور در صورت اختلاف اپنے اجتہاد سے) اقرب الی الکتاب و السنۃ کو ترجیح دیتا ہوں چنانچہ جس قول کو چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، مگر صحابہ کے اقوال سے باہر نہیں جاتا اور جب معاملہ اقوال تابعین تک پہنچے تو خود اجتہاد کرتا ہوں۔“

(الاستیعاب فی فضائل الثلاۃ الامۃ الاربعۃ لابن عبد البر ص ۱۴۲ نیز ملاحظہ ہو اعلام الموقعین و جامع بیان العلم، میزان کبریٰ للشعری، مفتاح الجنۃ)

امام مالکؒ خاص طور پر تلقین فرمایا کرتے تھے :

”لوگوں کی ادھر ادھر کی رائے سے اجتناب کیا کرو، الایہ کہ ان کا کسی مسئلہ پر اجماع ہو، اور اسی کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور جو تمہارے نبی ﷺ کی جانب سے آیا ہے اور اگر تمہیں کتاب

وسنت کے معنی سمجھ میں نہ آئیں تو اپنے علماء کے سپرد کر دو، اور ان سے جھگڑانہ کرو، کیونکہ دین میں جدال کرنا نفاق کا بقیہ ہے، (امام مالکؒ کے شاگرد) ابن قاسمؒ فرماتے تھے کہ بلکہ پورا نفاق ہے۔ اس لئے کہ حق کے معاملہ میں علماء کے ساتھ بے معنی کٹ جیتی سے پیش آنا خود آنحضرت ﷺ کے ساتھ مجادلہ کرنے کے مشابہ ہے، کیونکہ حق تو آنحضرت ﷺ ہی کا مشروع فرمودہ ہے، اگرچہ علماء سے جھگڑنا نبیؐ سے جھگڑنے کی بہ نسبت کم درجہ کا نفاق کہلائے گا۔“

امام شافعیؒ تو کتاب وسنت کے مقابلہ میں اجتہاد (قیاس) کو بالکل ہی باطل قرار دینے میں اتنی شہرت رکھتے ہیں کہ مستشرقین اور ان کے تلامذہ مجددین بھی اس کی کوئی توجیہ نہیں کر سکے، فرمایا کرتے تھے :

”حدیث رسول اللہ کو لازم پکڑو، اور رائے کو خیر باد کہو“ نیز فرماتے تھے، جو چیز بھی امر نبوی کے خلاف ہو وہ بالکل ساقط ہے، وہ کسی بھی رائے اور قیاس سے سیدھی نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قول نبویؐ سے تمام عذر قطع کر دیئے، آپؐ کے امر و نہی کے بعد کسی کے امر و نہی کی گنجائش نہیں۔“ (میزان کبریٰ ص ۱۵۰ ج ۱)

امام احمدؒ تو اجتہاد کے معاملہ میں اس سے زیادہ نازک ”احساسات“ رکھتے تھے، عصر حاضر کے مصنف شیخ ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں :

”رہا امام احمد کے فقہ کی نزاہت انسانی رائے سے پاکیزگی کا معاملہ۔ پس وہ تو اس کے بے حد حریص تھے کہ سنت سے نکلنے نہ پائیں، وہ اپنے تمام فقہ میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے متبع تھے، جن واضح آراء کی وہ تخریج کرتے ان کی اساس بھی آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ و تابعینؓ سے روایت شدہ احادیث و آثار پر ہوتی تھی، ان کو اس امر کا شدید اہتمام رہتا تھا، کہ آنحضرت ﷺ کی کسی حدیث کو رد نہ کریں، الا یہ کہ اس سے قوی تر اس کی معارض ہو، اور فرمایا کرتے تھے ”جس نے آنحضرت ﷺ کی حدیث کو رد کر دیا وہ تباہی کے کنارے پر کھڑا ہو گیا ہے“ نیز فرماتے تھے: ”میں نے آنحضرت ﷺ کی جتنی احادیث لکھی ہیں ان سب پر عمل کیا ہے“ اور جب انہیں کسی مسئلہ میں نہ حدیث ملتی نہ صحابہ کرامؓ کی سنت تو ائمہ سابقین کے منہاج پر مسئلہ کی تخریج میں اجتہاد فرماتے، اور اجتہاد میں بھی ائمہ سابقین کی راہ کو چھوڑ کر کوئی نئی راہ نہ نکالتے، جس مسئلہ میں یا اس کے منہاج میں کسی نے اب تک کلام نہ کیا ہو، اس میں اجتہاد سے منع فرماتے (اور توقف کرتے) اسی لئے اپنے خاص شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے، ایسے مسئلہ میں لب کشائی سے بچو! جس میں کوئی امام نہ ہو (یعنی اس سے پہلے کسی نے

’اس میں بحث نہ کی ہو!“ (امین خلیل حیاتہ و فقہہ و آرائہ ص ۷۹)

خلفائے راشدین اور ائمہ ہدیٰ کی ان تصریحات سے واضح ہوا کہ کتاب و سنت اور اجماع امت کے مقابلے میں اجتہاد کی گنجائش نہیں، اجتہاد کی ضرورت صرف اسی صورت میں پیش آتی ہے جبکہ کسی حادثہ کا حکم کتاب و سنت کے نصوص اور صحابہؓ و تابعینؓ کے متفقہ فیصلے سے ثابت نہ ہو۔ ورنہ اجتہاد بمقابلہ نص، قطعاً حرام، باطل اور مردود ہے، اور اس اصول میں بجز اہل ضلالت کے کسی کا اختلاف ہمیں معلوم نہیں۔

شیخ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اجتہاد کی چار قسمیں ہیں۔ واجب علی العین۔ واجب کفایہ، مباح اور حرام۔ اور آخری قسم کے بارے میں ان کی تصریح یہ ہے :

”والی حرام و هو الاجتهاد فی مقابلة دلیل قاطع
من نص کتاب و سنة او اجماع“۔
ترجمہ : اور اجتہاد حرام وہ ہے جو کسی دلیل قطعی یعنی کتاب و سنت کی نص صریح یا اجماع کے مقابلہ میں ہو“

(تیسرے شرح تحریر لابن امیر حاج ص ۸۰ ج ۴)

جہ الاسلام امام غزالیؒ فرماتے ہیں :

”محل اجتہاد صرف وہی حکم شرعی ہے جس میں
دلیل قطعی موجود نہ ہو۔ اور نماز پہنکانہ، زکوٰۃ کی فرضیت
اور شریعت کے وہ روشن اور واضح مسائل جن پر امت کا اتفاق

ہے، ان پر دلائل قطعیہ موجود ہیں، ان میں مخالفت کرنے والا مجرم ہے اس لئے کہ یہ امور محل اجتہاد نہیں۔“

(المستغنی من علم الاصول ص ۱۰۳ ج ۲)

شارح مجلہ شیخ محمد خالد اتاسی لکھتے ہیں، :

”دفعہ ۱۴- مورد نص میں اجتہاد کی گنجائش

نہیں۔ احکام شرعیہ بعض تو ایسے ہیں، جو کتاب سنت میں

منصوص ہیں، سنت خواہ متواتر ہو، یا مشہور، یا خبر واحد، اور

بعض وہ ہیں جو منصوص نہیں، بلکہ اولہ شرعیہ سے قیاس کے

ذریعہ معلوم کئے گئے ہیں، پس ہر وہ اجتہاد جو منصوص کے

معارض ہو وہ باطل ہے۔“ (شرح مجلہ ص ۴۰ ج ۱)

اجتہاد کا محل قرآن و سنت اور صحابہ کرامؓ و ائمہ عظام کے ارشادات کی

روشنی میں متعین ہو گیا، اب ذرا مجددین کے اجتہادی دعوؤں کو اس ”میزان

عدل“ میں تولیئے، کیا آپ انہیں دعوائے اجتہاد میں حق بجانب پائیں گے؟ کیا

اجتہادی نشہ میں قرآن کریم کے قطعی مسائل، سنت نبوی کی تصریحات اور

اجماع امت کے مصدقہ امور کو تحریفی اجتہاد کا نشانہ نہیں بنایا جاتا؟ اسلام کے

اصول و کلیات سے لیکر فروع و جزئیات تک ایک ایک میں کیڑے نہیں نکالے

جاتے۔؟

کاش! ہمارے تجدید پسند احباب صحیح اسلامی تخلیقی فکر کی صلاحیت رکھتے

توانکی ذہانت ملک و ملت کے مفید کاموں پر صرف ہوتی اور وہ ملت اسلامیہ کی ان

مشکلات کے حل کی طرف توجہ فرماتے، جو اغیار کی ذہنی غلامی، اندھی تقلید، اور مکمل سپردگی کی وجہ سے رونما ہوئی ہیں، وہ بلند نظری سے کام لیتے تو اپنی صلاحیتیں قوم کے ذہن و فکر کو غلط نظام ہائے زندگی سے موڑ کر اسلام کی طرف لانے اور مغرب سے کاٹ کر محمد ﷺ سے ان کا رشتہ جوڑنے میں صرف کرتے، وہ دور جدید کی جاہلیت پر ایسی کاری ضرب لگاتے جو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ثابت ہوتی، وہ مادیت میں سراپا غرق ”انسانیت“ کو اس بھور سے نکال کر رو حانیت کے آب طہور میں غوطہ دیتے، وہ ہندوں کے دروازے پر جھکی ہوئی انسانیت کو پھر سے رب العالمین کے در پر سر بسجود ہونے کی دعوت دیتے، وہ دنیوی زندگی کے فانی لحات پر قناعت کرنے والی بھٹی ہوئی انسانیت کو ”وان الدار الاخرة لہی الحيوان لو كانوا يعلمون“ (اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے کاش وہ جانتے) کی حقیقت سے رمز آشنا کراتے، انہیں چشم بصیرت نصیب ہوتی تو موجودہ دور کی حرمان نصیبی کا اصل راز ان پر کھلتا، وہ یہ جان لیتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کن بنیادوں پر اٹھائی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہو جاتا کہ اسلام دنیا میں کس انقلاب کا داعی ہے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا، بقول علامہ اقبال:

خرمانتوان یافت ازاں خار کشتیم

دیبا نتوان بافت ازاں پشم کہ رشتیم

جس ”اسلامی تخلیقی فکر“ اور اجتہاد کا بڑے خوش کن عنوان سے اعلان

ہو تا رہا۔ اب تک بجز ملت اسلامیہ کو ذہنی انار کی یا آوارگی میں مبتلا کرنے، اسلام

سے بدظن کرنے، اسلامی احکام کا مذاق اڑانے، کتاب و سنت کی تصریحات کو جھٹلانے، اور اسلاف امت کی تحمیق کے سوا اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

ب : اہلیت اجتہاد : محل اجتہاد کے بعد اہلیت اجتہاد کا مسئلہ بھی

معمولی اہمیت کا حامل نہیں، جب ہم دنیا کے کسی معمولی کام کو بھی نااہل کے ہاتھوں میں دینے کے لئے تیار نہیں، تو ”اجتہاد فی الدین“ کا منصب جلیل نااہلوں کو تفویض کر دینا قرین عقل ہو سکتا ہے؟ جب میں ان تجد و پسند احباب کی جانب سے اجتہاد کے بلند بانگ دعوے سنتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے، کہ گویا الیکشن کے موقع پر صدارتی انتخاب لڑنے کے لئے ایک پرلے درجہ کا نادان، تہی دامن، اور سیاست کی اجڈ سے کورا شخص میدان میں اتر آیا ہے، اور وہ اپنی خوش فہمی یا کم ظرفی کی وجہ سے یہ گمان کئے بیٹھا ہے، کہ چونکہ ملکی دستور ہر شہری کو اس انتخاب میں حصہ لینے کا حق دیتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ پوری قوم میرا ساتھ نہ دے، اور بڑے بڑے اہل علم و صلاحیت کے مقابلہ میں مجھے کامیابی حاصل نہ ہو، میں جب ابنائے زمانہ کی اجتہادی خوش فہمی کو ان کی تہی دامن کی ترازو میں تولتا ہوں تو مجھے پساختہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی یاد آ جاتا ہے :

”اذا وسد الامر الى غير اهله فانتظر الساعة۔“

ترجمہ : ”جب معاملہ نااہلوں کے سپرد ہو جائے تو قیامت کا

انتظار کرو“

اہلیت اجتہاد کی تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں، وہ اصول کی کتابوں

میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، میں یہاں صرف اجمالی اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ

سطور میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، عمر بن عبد العزیزؓ اور امام مالکؒ کے بیانات آپ پڑھ چکے ہیں، جن میں بسلسلہ اجتہاد رؤس الناس صالحین، ائمہ عدل، ائمہ ہدیٰ، اہل العلم اور اہل الرائے کے الفاظ آتے ہیں، ان تمام الفاظ سے اہلیت اجتہاد کا حدود دربعہ متعین ہو جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے، کہ اہل اجتہاد صرف وہ حضرات ہیں جو علم و عمل صلاح و تقویٰ، اور فہم و بصیرت میں ممتاز ہوں، ایک طرف ان کی علمی صلاحیت لائق اعتماد ہو، اور دوسری طرف ایمان و تقویٰ اور خشیت و للہیت میں اس قدر راسخ ہوں کہ ان کے ضمیر و وجدان اور دین و ایمان کو خریدانہ جاسکے، ”وہ آجلہ پر“ عاجلہ کو ترجیح نہ دیتے ہوں، اور وہ وقتی مفاد کی خاطر ہوئی کو ہدیٰ پر غالب نہ کر دیں، ایک صحیح حدیث میں یہ مضمون صراحتاً آیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جس میں کوئی واضح حکم امر و نہی موجود نہ ہو، اس صورت میں آپ کا کیا ارشاد ہے؟ فرمایا:

”شاورافیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوافیہ رأی

خاصۃ۔“ (طبرانی فی الاوسط)

ترجمہ: ایسے مسائل میں فقہاء و عابدین سے مشورہ کیا کرو اور

ان میں شخصی رائے نافذ نہ کرو۔“

”فقہاء و عابدین“! نبوت کے انہی دو الفاظ میں اصول فقہ کی بیان کردہ

طویل الذیل اجتہادی صفات سمٹ کر جمع ہو گئی ہیں، یعنی جو حضرات اعلیٰ درجہ

کے فقیہ اور اونچے درجے کے عبادت گزار ہوں اہل اجتہاد اہل مشورہ اور اہل

رائے تصور کئے جائیں گے اور اس کے برعکس جو لوگ فقہ و عبادت، علم و عمل اور تقویٰ و صلاح کے جامع نہ ہوں، وہ اور سب کچھ ہو سکتے ہوں گے، باشارۂ نبوت اجتہاد کی اہلیت سے محروم ہیں۔

آج امام ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کے اجتہاد کو چیلنج کرنا بڑا آسان کام سمجھا جاتا ہے، لیکن مدعیان اجتہاد یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ کن ظاہری اور معنوی خصوصیات کی بنا پر قدرت فیاض نے ان حضرات کو شریعت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف سلام) کی ترجمانی کے لئے منتخب فرمایا تھا، اور کن حکمتوں کی بنا پر اساطین امت کو ان کی اتباع پر جمع کر دیا گیا؟ جو لوگ اپنی ذات پر قیاس کرتے ہوئے ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح محض ذاتی آراء اور قومی رسم و رواج ہی کو اجتہاد کے نام پر اسلام کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ انہیں امام ربانی مجدد الف ثانی (قدس سرہ) کا یہ ارشاد بار بار پڑھنا چاہیے:

”جماعہ کہ ایں اکابر دین را اصحاب رائے میدانند اگر اعتقاد دارند کہ ایشان را خود حکم میکردند و متابعت کتاب و سنت نمی نمودند پس سواد اعظم از اہل اسلام بزعیم فاسد ایشان ضال و مبتدع باشند بلکہ از جرگہ اہل اسلام بیرون بودند، ایں اعتقاد بخند مگر جاہلے کہ از جہل خود بے خبر است یا ز ندیقے کہ مقصودش ابطال شطر دین است۔“

(مکتوبات مجددیہ دفتر دوم مکتوب ۵۵)

ترجمہ: ”جو لوگ ان اکابر دین (ائمہ مجتہدین) کو صاحب

رائے جانتے ہیں اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی رائے سے حکم کیا کرتے تھے اور کتاب و سنت کی پیروی نہیں کرتے تھے تو ان کے خیال فاسد کے مطابق اہل اسلام کا سواد اعظم، گمراہ بدعتی بلکہ گروہ اہل اسلام سے خارج قرار پائے گا اس قسم کا اعتقاد وہی بے وقوف جاہل کر سکتا ہے جو اپنی جہالت سے بے خبر ہے، یا پھر ایسا زندقہ جس کا مقصود یہ ہے کہ دین کا ایک بڑا حصہ باطل ہو جائے۔“

ائمہ دین کے اجتہاد پر محض ذاتی رائے، آزادانہ غور و فکر، سوچی سمجھی رائے اور شخصی رائے کی تہمت دھرنے والوں کے خلاف ”جمل مرکب یازندیقیت“ کا یہ فتویٰ کسی آج کے عالم دین کا نہیں، جسے ”سیاسی ملازم“ کی خوش گپی سے اڑا دیا جائے، بلکہ اس شیخ مجدد کا فتویٰ ہے جس کی لحد پر علامہ اقبالؒ احترام و عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں اور پھر پورے اعتماد، وثوق اور یقین کے ساتھ دنیا والوں کو بتلاتے ہیں :

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

”وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباز

اللہ نے ہر وقت کیا جس کو خبر دار“

(بال جبریل)

”سرمایہ ملت کا نگہبان جسے اللہ نے ہر وقت خبردار کیا تھا“ اسی کے قلم

خارا شگاف سے ذرا مقام اجتہاد کی بلندی کا احوال سنئے :

”وائے ہزار وائے از تھبہائے بارو ایشاں

واز نظر ہائے فاسد ایشاں، بانی فقہ ابو حنیفہؒ است

وسہ حصہ از فقہ اورا مسلم داشته اند و در ربع باقی

ہمہ شرکت دارند باوے، در فقہ صاحب خانہ لواست

و دیگر اں ہمہ عیال وے اند۔“

ترجمہ: ”حیف! صد حیف! ان لوگوں کے بے ہودہ تعصب

اور غلط بیینی پر! بانی فقہ ابو حنیفہؒ ہیں، فقہ کے تین حصے انکو

مسلم ہیں اور باقی چوتھائی میں سب حضرات ان کے شریک

ہیں، فقہ میں صاحب خانہ وہ ہیں، اور دوسرے سب ان کے

عیال ہیں۔“

امام شافعی کا ارشاد ہے :

”من اراد الفقه فهو عيال على ابي حنيفة۔“

(الانتقاء ص ۱۳۶)

”باوجود التزام اس مذہب مر بلا امام شافعی گویا محبت

ذاتی است و بزرگ میدانم، لہذا در بعضی اعمال نافلہ تقلید مذہب او سے نمایم، اما چہ کنم کہ دیگر اہل ربا و جود و نور علم و کمال تقویٰ در جنب امام اہل حنیفہ در رنگ طفلان سے یا کم۔“
(مکتوبات مجددیہ دفتر دوم مکتوب ۵۵)

ترجمہ: ”اس مذہب کے التزام کے باوجود مجھے امام شافعی سے گویا ذاتی محبت ہے، میں انھیں بزرگ جانتا ہوں اس لئے بعض نفلی اعمال میں ان کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں، لیکن کیا کروں ابو حنیفہ کے سامنے بچوں جیسا پاتا ہوں۔“

نیز:-

”ذوالنون و بسطامی و جنید و شبلی بازید و عمرو و بحر و خالد کہ از عوام مو منانند در تقلید مجتہدان ذرا حکام اجتہادیہ مساوی اند، آری مزیت ایں بزرگواراں در امور دیگر است۔“
(مکتوبات مجددیہ مکتوب ۵۵ دفتر دوم)

ترجمہ: ”ذوالنون مصری، بازید بسطامی، جنید بغدادی اور شبلی اجتہادی احکام میں ائمہ مجتہدین کی اتباع میں زید و عمرو و بحر و خالد عامہ مومنین کی صف میں ہیں، ہاں ان مقبولان الہی کی فضیلت دوسری چیزوں میں ہے۔“

یہ ہے مقام اجتہاد! جس کے سامنے جبال علم و تقویٰ ”در رنگ طفلان“ نظر آتے ہیں اور جس کی پیروی میں شیخ جیلاں، ذوالنون مصری، جنید بغدادی، جیسے اقلیائے امت، اور فخر الدین رازی، حجت الاسلام غزالی، مجدد الف ثانی، شاہ

ولی اللہ دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور مولانا انور شاہ کشمیری (قدس اللہ اسرارہم) جیسے اساطین امت عامہ مومنین کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ دور حاضر کے غلط پندار متجددین کو اگر ائمہ ہدیٰ کی اتباع سے عار آتی ہے، تو آتی رہے، لیکن اقبال کی اصطلاح میں ”سرمایہ ملت کا نگہبان“ شیخ مجدد ان کی تقلید پر فخر کرتا ہے ”باوجود التزام اس مذہب، در بعض اعمال نافلہ تقلید مذہب اومے نمایم“۔ منصب اجتہاد اتنا ارزاں نہیں کہ صرف مغربی یونیورسٹی کی سند فضیلت کے عوض اسے فروخت کر دیا جائے، اور کسی اسلامی موضوع پر التاسیدھا انگریزی مقالہ لکھنے والوں کو یہ منصب تفویض کر دیا جائے، اور پھر انہیں کھلی چھٹی دیدی جائے کہ وہ اسلام کے جس مسئلہ پر چاہیں حرف زنی کرتے رہیں، بقول شیخ :

کس نیاید بزر سایہ بوم
ور شود ہماز جہاں معدوم

ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند میں اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ مولانا محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ) کی جلالت شان سے جو لوگ ناواقف ہوں وہ علامہ اقبال سے دریافت کریں کہ انور شاہ کون تھے؟ بقول حکیم الامت تھانویؒ اسلام کا زندہ معجزہ، اسلامی علوم کا دائرۃ المعارف، اپنے وقت کا متحرک کتب خانہ، علوم نبوت کا حافظ جن کے حفظ و ذکاوت، اور تبحر علمی کا ذکر چھیڑیئے تو آج کے بے یقینوں کو مشکل ہی سے اس کا یقین آئے۔ جن کے علم و عمل، زہد و تقویٰ، اور اخلاص

و خدا پرستی کی نظیر اسلامی تاریخ کی کئی صدیوں میں بھی خال خال ہی نظر آئے گی،
یہی علامہ انور شاہ فرمایا کرتے تھے :-

”واعلم انه ما من فنّ الاولى فيه رأى غيرالفقه،
فانى فيه مقلد صرف، ولا أرى فيه حقا الا لمن
حصل له الاجتهاد“ - (فيض الباری ج ۳ ص ۱۷)

ترجمہ: ”میں ہر علم میں اپنی مجتہدانہ رائے رکھتا ہوں، مگر علم
فقہ میں میں مقلد محض ہوں۔ اور میرے نزدیک اس میں
دخل دینے کا حق صرف ان حضرات کو ہے جنہیں اجتہاد
نصیب ہو (جو فقیر کو نصیب نہیں)۔“

واحسرتا و اندامتاہ! آج جہل مطلق کا نام علم اور تحریف کا نام
اجتہاد رکھا جاتا ہے، اور یہ بے علم مجتہد نہ صرف ائمہ سے دست و گریباں ہوتے
ہیں، بلکہ ارشادات نبوت سے بھی الجھتے ہیں۔ فرمودات نبویہ کو بڑی نادانی سے
انمل اور بے جوڑ بتلاتے ہیں۔ علوم نبوت کو اپنے ذہنی پیمانوں سے ناپتے ہیں، اور
اگر فیصلہ نبوت، انکی خواہشات سے ٹکرائے تو ”اسلام کی تعمیر نو“، کے نام پر
اسے بے باکی سے ٹھکرا دیتے ہیں، کس ذات ﷺ کے فیصلوں کو؟

ادب گاہ پرست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ مے آید جنید و بایزید ایں جا

اور کیا صرف ایک جنید و بایزید؟ ادب گاہ محمدی ﷺ پر حضرت موسیٰ

و عیسیٰ (علیہم السلام) جیسے اولوالعزم مرسلین اور جبرئیل جیسے کروہیں، سبھی کو

”نفس گم کردہ مے آید“ دیکھا گیا، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئے، ”ہم یہود سے کچھ باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی لگتی ہیں، آپ ﷺ فرمائیں تو ہم انہیں لکھ لیا کریں؟“ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:-

”امتھوکون انتم کما تھوکت الیہود والنصارى لقد

جئکم بها بیضاء نقیة ولو کان موسیٰ حیا لما

وسعه الا اتباعی۔“ (مشکوۃ المصابیح ص ۳۰)

ترجمہ: ”کیا تم بھی (اپنے دین کے بارے میں) متحیر ہو جاؤ

گے جس طرح یہود و نصاریٰ متحیر ہوئے؟ (فراست نبوت

کا معجزہ دیکھئے کہ آج مسلمانوں کو دین سے برگشتہ اور متحیر

کرنے کے لئے یورپ کے تحیر ہی کو بطور سند لیا جاتا ہے۔

ناقل) بخدا میں تمہارے پاس صاف اور روشن شریعت

لے کر آیا ہوں۔ اور اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں بھی

میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔“ (اس کے برعکس آج

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوتے تو

ہمارے ذہن سے سوچتے۔ معاذ اللہ، ناقل)

میں دور جدید کی تخلیقی فکر اور اجتہادی مہم کے پرستاروں سے مؤدبانہ

گزارش کروں گا کہ وہ اپنے خوش کن نعروں سے کتاب و سنت کے نصوص، امت

کے اجماعی قطعات اور ائمہ ہدیٰ کے علوم کو معاف رکھیں، کتاب اللہ کی تحریف،

سنت نبوی کی تکذیب، اور امت مرحومہ کی تغلیط کی غلطی نہ کریں، اس ثقیل غذا کے استعمال کا تجربہ جن لوگوں نے کیا وہ اسے ہضم نہیں کر سکے، بالآخر ذہنی بد ہضمی اور دماغی تخمہ کا شکار ہو کر رہ گئے اور ملت اسلامیہ کے حساس معدہ نے انہیں مردہ مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا، خوارج سے لیکر اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی تک کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں :

”بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق“
(بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں پس وہ حق اس باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے، وہ باطل دفعۃً مٹ جاتا ہے۔) (الانبیاء: ۱۸) کا ”خدائی قانون“ ہمیشہ جاری رہا ہے اور رہے گا۔

انہیں یہ خوش فہمی دور کر دینی چاہیے کہ کتاب اللہ کے نصوص کی جگہ ان کی ہزلیات کو مل جائے گی، یا امت مسلمہ ان کی جدت طرازیوں کو ”حدیث پیغمبر ﷺ“ کی جگہ قبول کرے گی، یا وہ اپنے اجتہادی نعروں سے ابو حنیفہؒ و شافعیؒ کا مقام حاصل کر لیں گے، اس خیال است و محال است و جنون، اگر ان میں اجتہاد کی واقعی صلاحیت ہے تو غیر منصوص مسائل کا شرعی حکم دریافت کریں، ورنہ اپنی ذہانت تخریب اسلام کے بجائے ملک و ملت کے کسی اور مفید کام میں کھپائیں۔ یہ ملک پر بھی ان کا احسان ہو گا اور خود اپنی ذات پر بھی۔

سبحانک اللہم وبحمدک

اشہد أن لا اله إلا انت استغفرک واتوب إلیک —

(بینات کراچی ربیع الاول / ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ)

ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار

ڈاکٹر فضل الرحمن کی بے جا حمایت

محترم مدیر ماہنامہ ”بینات“ نیوٹاؤن کراچی..... السلام علیکم،

ماہنامہ ”میشاق“ لاہور اکتوبر ۱۹۶۸ء میں مدیر میثاق کی طرف سے ایک ادارہ شائع ہوا ہے، یہ ادارہ جتنے مسلمانوں کی نظر سے گزرا ہوگا، جن کا دین کے ساتھ پورا لگاؤ ہے، ان کے دلوں کو بہت مجروح کیا ہوگا، ہم چاہتے ہیں کہ ”بینات“ کی طرف سے ایسے گمراہ کن ادارے پر تنقید کی جائے، جس سے اس کے گمراہ کن پہلو پر روشنی پڑے۔

والسلام

محمد حنیف لطیف آباد: ۶ (حیدر آباد)

ج:..... مدیر ”میشاق“ نے اکتوبر کے شمارے میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب بالقلابہ کی مظلومیت کا جو مرثیہ لکھا ہے، اس سلسلہ میں اپنے موقف کی تضحیح نومبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں انہوں نے فرمائی ہے:

”ڈاکٹر فضل الرحمن کے نظریات سے ہمیں بھی شدید اختلاف

ہے..... چنانچہ ان کے نظریہ وحی کو ہم شدید قسم کی غلطی اور ”ایمان

بالملائکہ“ سے اعراض پر مبنی سمجھتے ہیں، اور اس پر انشاء اللہ مفصل

تقدید بھی اپنے علم کی حد تک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں..... لیکن اس کا مطلب یہ بہر حال نہیں ہے کہ ہم کسی معاملے میں عدل و انصاف کے تمام تقاضوں سے صرف نظر کر لیں اور جس سے بھی ہمیں اختلاف ہو اسے لازماً صرف جاہل بلکہ کافر، زندیق، دشمن اسلام اور اعداء دین کا ایجنٹ ہی قرار دیں.....“

گویا ڈاکٹر صاحب کی نظریہ وحی میں شدید قسم کی غلطی اور ”ایمان بالملائکہ“ سے اعراض کے باوجود مدیر ”میثاق“ کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کو دین سے ناواقف، ضروریات دین کا منکر، طریق سلف سے منحرف اور اعداء دین کا ہمنوا کہنا صحیح نہیں بلکہ ان کو اگر ایک عالم ربانی، ایک مومن مخلص، ایک محب اسلام اور ترجمان سلف صالحین کی حیثیت سے تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے عدل و انصاف کے تمام تقاضے پامال ہو جاتے ہیں..... ٹھیک یہی موقف ”مسلمہ پنجاب“ کی نصرت و حمایت میں ایک ”ہندی بزرگ“ کا ہے کہ ان کا دعویٰ نبوت غلط آیات و احادیث کی تحریف مسلم! امت اسلامیہ کی تکفیر و تفسیق ہے جا! وغیرہ وغیرہ، لیکن بایں ہمہ وہ پکے سچے مسلمان بھی ہیں، محب اسلام و مسلمین بھی۔ اور ان کے لئے کفر و زندق، نفاق و ارتداد اور ”نبوت محمدیہ کے خلاف ایک سازش“ کے الفاظ زبان پر لاتے ہی عدل و انصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ ”پیر ہندی“ تمام اکابر علماء بلکہ خود اپنے پیرو مرشد کی تصریحات و توضیحات کے علی الرغم اپنے اس موقف پر خوب ڈٹے ہوئے ہیں:

”ہر کسے را بہر کارے ساختند“

کیا ہم ”میثاق“ کے مدیر محترم سے دریافت کر سکتے ہیں کہ: جو شخص یہ تصریح کرے کہ ”قرآن پورے کا پورا کلام اللہ ہے اور عام معنوں میں یہ اسی طرح پورے کا پورا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی ہے۔“ جس کے نزدیک ”قرآنی قصص اور واقعات

کی تاریخی..... صحت کا سوال دلچسپ ضرور ہے لیکن مشکلات سے لبریز بھی۔“ جو خارج سے نزول وحی کا منکر ہو، فرشتہ وحی کا مذاق اڑاتا ہو، اور اسلامی عقائد اور ان تمام احادیث طیبہ کو جن میں جبریل امین علیہ السلام کا ذکر ہے، قرون وسطیٰ کی ناپختہ عقلوں کی گھڑی ہوئی داستان کتا ہو، جس کے نزدیک ”قرآن کے تمام احکام اسی وقت کے لئے تھے“ اور ”ابدیت“ قرآن کے احکام کو نہیں بلکہ صرف علل و غایت کو حاصل ہے“ جو شخص نسخ احکام کا حق اسی طرح مانگتا ہو جس طرح کہ نسخ کا سلسلہ دور نبوت میں جاری تھا، جس کے زعم میں قرآن کی قانون سازی خود قرآن کے نزدیک اپنے ظاہری لفظی معنی میں ابدی نہیں ہو سکتی، کیا اس کا ”ایمان بالقرآن“ قابل تسلیم ہے؟ اور کیا ایک مسلمان کا ”ایمان بالقرآن“ اسی نوعیت کا ہوتا ہے؟

جس شخص کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شارع (صاحب شریعت) نہیں تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اساسی حیثیت (معاذ اللہ) صرف ”اخلاقی مصلح“ کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ میں بس وہی پیشگوئی کر سکتے تھے جو قرآن و احوال کے پیش نظر ایک عام آدمی کر سکتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کوئی دائمی شریعت نہیں دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین اور قضایا امت کے لئے واجب الطاعت نہیں بلکہ محض ”ایک گونہ نظیر“ ہیں، جس کے نزدیک ”وحی ہو یا نبی کا عمل وہ تاریخ کے ان واقعات سے بے نیاز نہیں ہو سکتے جو فوری طور پر انہیں پیش آئے۔“ کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بحیثیت رسول کے سمجھا اور مانا ہے اور وہ ”ایمان بالرسول“ کے دعویٰ میں مخلص ہے؟

جس کے نزدیک ”اسلام نام ہے چند (مہم) مثالی معیاروں اور نصب العینوں کا“ جن کو مختلف معاشرتی مظاہر اور ظروف و احوال میں ترقی پسندانہ انداز میں عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔“ (ڈاکٹر صاحب نے اسلام کی یہ تعریف پروفیسر جی فان گرومیون سے

اخذ کی ہے) ملاحظہ ہو ”فکر و نظر“ مئی اور جون ۱۹۶۵ء (ص ۷۹) اور یہ اسلام ہمیشہ
نوبہ نو صورتیں تازہ بہ تازہ شکلیں بدلنے کا متلاشی ہو، جس کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کے لائے ہوئے اسلام کی اصل روح پہلی صدی ہی میں ختم ہو گئی تھی، جو اسلام کا
مذاق اس مصرعہ سے اڑاتا ہو :

”خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود“

جس کے نزدیک وہ اسلام جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان متواتر
چلا آتا ہے، مردہ کا ورثہ، زندگی کی حرارت سے محروم، جسد بے روح، محض پوست، مغز
سے خالی، ظاہری رسمی ڈھانچہ، خود فریبی میں مبتلا، قانون مبرم کا زخم خوردہ، غلو کی چکی
میں پسا ہوا، نقصان رسیدہ، زوال پذیر صرف تعزیروں اور پابندیوں کا مجموعہ، قدامت
پرستی کے اطوار کا شاہکار، روشن ضمیری سے محروم، ہر تمدنی ڈھانچہ کے لئے تباہ کن،
بد قسمتی کا شکار، جیسے القاب کا مستحق ہو، جو شخص اسلام کو روایتی اسلام، راسخ العقیدہ گروہ
کا اسلام، تشکیلی دور کا اسلام، قرون وسطیٰ کا ساختہ پرداختہ اسلام، جیسے ناموں سے یاد
کرے، کیا عقل مانتی ہے کہ اس نے اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر دل کی گہرائیوں سے
اسے قبول کیا ہوگا؟ کیا اس پر باخلاص مسلمان اور مؤمن قانت کا لقب چسپاں کیا جاسکتا
ہے؟

جو شخص عقیدہ تقدیر، عقیدہ معراج، عقیدہ شفاعت اور تمام اسلامی عقائد کا
مذاق اڑاتا ہو، اکابر دین، ائمہ مجتہدین، فقہاء و محدثین اور تمام امت اسلامیہ کا مضحکہ اڑاتا
ہو، تمام ذخیرہ حدیث اور علم دیانات کو مسلمانوں کی من گھڑت کہتا ہو، احادیث رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انمئل، بے جوڑ قرار دیتا ہو، پنج گانہ نمازوں کا منکر ہو، نماز کے
اوقات و ادا کام کو بعد کی پیداوار کہتا ہو، زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دے کر اس کے رد و بدل اور
اضافہ و نسخ کو ضروری سمجھتا ہو، اسلامی حدود کا منکر ہو، دو چند سہ چند سے کم سود کو حلال

کہتا ہو، اسلام کے پورے نظام عقائد و اعمال کو ناپختہ عقلوں کو بناوٹ کہتا ہو، جس کے نزدیک مستشرقین کے انداز میں اسلام پر عمل جراحی ناگزیر ہو، کیا وہ مثبت اسلام ہے یا اعداء دین کا آلہ کار؟ :

اند کے پیش تو گفتم حال دل و ترسیدم

کہ آزرده شوی و گر نہ سخن بسیار است

ستم ظریفی کی حد ہے کہ ایک شخص اسلام کی ایک ایک بات سے ٹھسھول کرتا ہے، قرآن کی ”آیات بینات“ کے قطعی مفہوم کو ٹھکراتا ہے خدا اور سول کو: انما کنا نخوض و نلعب (ہم تو بس یوں ہی ہنسی دل لگی کرتے تھے) کا نشانہ بناتا ہے، پوری امت اسلامیہ کے ایمان و عقائد سے کھیلتا ہے، اسلام کو مذہب گالیوں سے نوازتا ہے، مگر ”میثاق“ کے مدیر محترم اپنی شفقت و رافت کا سارا زور اس کی مظلومیت و معصومیت کی وکالت پر صرف فرماتے ہیں، کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ مدیر میثاق نے نہ تو ڈاکٹر صاحب کے خیالات کا کافی مطالعہ کیا ہے، نہ ان کی گہرائی میں اترنے کو ضروری سمجھا ہے، نہ ان کے سامنے یہ اصول ہے کہ اسلام اور کفر کے مابین حد فاصل کچھ ہے، اگر ہمارا یہ قیاس صحیح نہیں تو وہ خود ہی بتائیں کہ قرآن و حدیث اور اصول کفر و ایمان کی روشنی میں مندرجہ بالا نظریات کا شخص کس لقب کا مستحق ہے؟ شفقت و رحم بڑا اچھا وصف ہے لیکن کسی اچھی چیز کا بے موقع اور بے ڈھنگا استعمال تو اچھا نہیں۔ غلط کار کی پیٹھ تھپکنا اس پر شفقت نہیں، سر اسر ظلم ہے، اس کے ساتھ شفقت یہی ہے کہ اسے اس کی غلط کاری پر سر او جہراٹو کا جائے، اور اگر وہ باز نہ آئے اور ایسے امور کا ارتکاب کرے جن سے ایمان ہی کے غارت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا جائے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کی صف اول میں سمجھا جاتا ہے، مگر ڈاکٹر صاحب

جانتے ہیں کہ ہم نے مہینوں نجی مجالس میں ہمال اخلاص و ہمدردی سے 'شفقت و محبت کا حق سر ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' اور جب معاملہ خلوت سے جلوت میں آیا اور سر سے جہر تک پہنچا تو جس قدر تک سے ڈاکٹر صاحب اسلام اور اسلامیات کے بارے میں "لسانی ارتقاء" فرماتے گئے اسی نسبت سے ہماری شفقت کا رنگ بدلتا گیا، ہم نے! صرف ڈاکٹر صاحب کی تحریروں ہی کا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا بھی عمیق اور بھرپور مطالعہ کیا اور آج بھی ہم خدا کو شاہد بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ: ہمیں مدیر میثاق سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے شفقت و محبت ہے، لیکن اس کا کیا کیجئے شفقت کا ایک انداز "پدری شفقت" بھی ہے جو غلط کار فرزند کی آفتوں پر ٹسوںے بہانے کی صورت میں نہیں بلکہ اسے سرخ آنکھیں دکھانے میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

مدیر میثاق کو بقول ان کے ایک دینی رسالے میں یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا ہے کہ: "ڈاکٹر صاحب تو بس وہی کچھ لکھتے ہیں جس کا اشارہ انہیں اوپر سے ملے (ان ہوا والا وحی یوحی) لیکن کیا وہ اس حقیقت سے انکار کریں گے کہ ڈاکٹر صاحب جس استخراقی مدرسہ فکر کے "مجتہد فی الذہب" ہیں جس نے اسلام کا مطالعہ اسی ذہن سے کیا ہے اور گولڈنیزر سے ڈاکٹر اسمتھ تک کے ائمہ استخراق سے اسلام 'اسلامی عقائد' اسلامی قانون، رجال اسلام بلکہ الوہیت و نبوت اور وحی رسالت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ان کے اصول و مبادیات و بیان اور ذہن و فکر میں ڈھل کر لکھا ہے، وہ کسی بحث پر قلم اٹھانے سے پہلے مدرسہ استخراق کا از سر نو مطالعہ کرتے ہیں اور بقدر ضرورت مسائل و مباحث ہی نہیں بلکہ طرز ادا، انداز نگارش تعبیرات میں بھی ان کا تتبع کرتے ہیں ماہنامہ فکر و نظر کے مقالہ نگار کے بقول:

"یہ امر بالکل فطرتی ہے اور آج بھی بالعموم یہی ہوتا ہے کہ

شاگرد اکثر امور میں اپنے استاد کا ہم خیال ہوتا ہے۔" (فکر و نظر ج ۳، ش ۷، ص ۵۶۷)

اور خود مدیر میثاق بھی معترف ہیں کہ :

”ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بناء پر ان کا (ڈاکٹر فضل الرحمن) کا نظریہ ایک خاص رخ پر ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فکر و فلسفے اور مادہ پرستانہ ظرف و فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے، چنانچہ ان کی تصنیف میں جہاں بہت قیمتی علمی مواد بھی موجود اور بعض نکات بڑے دقیق اور وقیع ہیں، وہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ مادہ پرستانہ نقد و نظر اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور ”اسلام“ کا یہ پورا مطالعہ مغربی فکر و نظر کی روشنی میں گویا ہے۔ (یہ ”بہت قیمتی علمی مواد“ اور ”بڑے دقیق و وقیع نکات“ جو مدیر میثاق کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب ”اسلام“ سے دستیاب ہیں، استثنائی مارکیٹ میں یہ جنس نہایت ارزاں ہے اگر نہیں تو ایمان و یقین، عدل و انصاف اور فہم و بصیرت نہیں، یہی جنس کم یاب ڈاکٹر صاحب کے یہاں مفقود ہے) (افراہیت من اتخذ الہد ہواہ واضلہ اللہ علی علم..... ناقل)۔“

اسی بات کو اگر کسی نے ”اوپر کے اشارے“ سے تعبیر کر دیا تو کیا حقیقت واقعہ کی غلط ترجمانی کی؟ میثاق کے مدیر محترم کو شکایت ہے کہ: ”ان کے (ڈاکٹر صاحب) کے ساتھ انصاف بھی نہیں کیا گیا چنانچہ بعض باتیں ان کی جانب غلط بھی منسوب کی گئیں اور ان کے بعض ایسے فقرہوں کا جو ایک عدد زیادہ مفہوموں کے متحمل ہو سکتے تھے، ایک خاص متعین مفہوم بھی ان کے سر تھوپا گیا اور ہنگامے کے شور و شغب میں ان کی تمام وضاحتوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔“

کسی کی جانب غلط بات کو منسوب کرنا یا کھینچ تان کر ایسے مفہوم کو، جو متکلم کی مراد

نہ ہو، اس کے منہ تھوپنا ہمارے نزدیک پتے درجے کا کمینہ پن ہے، کسی بات کو ڈاکٹر صاحب کی طرف منسوب کرنے سے پہلے ان کے سیاق و سباق کو (بلا مبالغہ) دسیوں بار پڑھا ہے اور ان کے مجموعی ذہن و فکر کو سامنے رکھ کر ان کی مراد سمجھنے کی کوشش کی ہے اور حزم و احتیاط کے تمام پہلوؤں کو اپنے امکان کی حد تک ملحوظ رکھ کر ان پر گرفت کی ہے، تاہم اگر مدیر میثاق کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اردو عبارتوں کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک مفہوم متعین کرنے میں ہم سے فروگزاشت ہوئی ہے، تو وہ ان مقامات کی نشاندہی فرمائیں، ہم نہ صرف ان کے مشکور ہوں گے بلکہ ڈاکٹر صاحب سے بھی علانیہ معذرت خواہ ہوں گے، رہا ان کی اخباری وضاحتوں کو نظر انداز کر دینے کا قصہ..... اس کی ایک مثال عرض کی جاتی ہے :

ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری کتاب ”اسلام“ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ”محمد محمد“ سے تعبیر کیا ہے اور کسی جگہ اسم گرامی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافہ کی یا کم از کم (ص) کا نشان دینے کی زحمت نہیں کی، جب اس پر گرفت کی گئی تو وضاحتی ارشاد ہوا کہ : ”چونکہ میں نے یہ کتاب غیر مسلموں (انگریزوں) کے لئے لکھی ہے اور چونکہ ان کے یہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا رواج نہیں ہے، چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ (حالانکہ یہ قطعاً جھوٹ ہے کتاب کا پیش لفظ اس کی تکذیب کرتا ہے ملاحظہ فرمائیے کتابچہ ”نیا اسلام“..... ناقل)۔“

(بالمعنی) مدیر میثاق انصاف فرمائیں کہ کیا یہ ”چونکہ چنانچہ“ کی منطق کسی التفات کی مستحق ہے؟ کیا یہ یکسر نظر انداز کر دینے کے لائق نہیں؟ کیا کسی غیر مسلم ذوق کی تسکین کے لئے مسلمان سے تعظیم نبوی (بآبائنا ہو وامہاتنا صلی اللہ علیہ وسلم) اور صلوٰۃ و سلام کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے؟ اور جو شخص سینکڑوں صفحات میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو ”خشک“ ذکر کرتا چلا جائے اور ساری

کتاب میں صلوٰۃ و سلام سے محروم رہے کیا اسے انوار نبوت اور فہم اسلام سے کچھ حصہ مل سکتا ہے؟ (ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون) عجیب بات ہے کہ یہی بزرگ، صحیح بخاری کی حدیث وحی کو بعد کی پیداوار فرماتے ہیں جس کی ہر حدیث کے لئے وضو اور دو گانہ کا، اور ہر باب کے لئے غسل اور طواف بیت اللہ کا اہتمام امام بخاریؒ نے فرمایا: (فاین الثریٰ من الثریا؟) یہی حال ڈاکٹر صاحب کی دوسری وضاحتوں کا ہے، جنہیں بقول مدیر ”میثاق“ نظر انداز کر دیا گیا۔

آخر میں مدیر میثاق سے گزارش ہے کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی ذات سے نہیں، نظریات سے اختلاف ہے، ان کے مناصب سے نہیں، مقاصد سے ضد ہے، ہم ان کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ ان کے وسیع معلومات کے بھی معترف ہیں (نہ کہ علم کے) اگر حق تعالیٰ انہیں توفیق دے اور وہ اپنے نظریات میں اعتدال پیدا کر لیں اور ان کی تحریروں سے جو نقصان اسلام اور ملت اسلامیہ کو پہنچا ہے، انہیں اس کا احساس ہو جائے اور وہ اس کی تلافی کر لیں تو نہ صرف یہ کہ امت اسلامیہ انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گی، بلکہ ان کے قابل احترام والد بزرگوار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک بھی ان سے خوش ہو جائے گی، اور ان کی ذہانت و فطانت یوں رائیگاں نہ جائے گی، ہماری یہی گزارش ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ کے ان رفقاء کے بارے میں بھی ہے جو اب تک ڈاکٹر صاحب سے ذہناً متفق اور عملاً ان کے نقش قدم پر رواں دواں رہے ہیں۔

وفقنا للہ لما یحبہ ویرضاه بحرمة نبیہ و صفوة خلقہ

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ وبارک وسلم۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت میں!

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہنامہ ”میشاق“ لاہور بابت اکتوبر ۱۹۶۸ء میں تذکرہ و تبصرہ کے عنوان سے ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمن بالقبابہ کی ”معصومیت“ و ”مظلومیت“ کی دہائی دیتے ہوئے انہیں جس طرح پاک صاف باور کرانے کی کوشش کی ہے وہ اگرچہ باعث تعجب نہیں، مگر قابل افسوس ضرور ہے۔ انہیں کم از کم ایک ایسے شخص کے دکیل صفائی کا کردار نہیں ادا کرنا چاہئے تھا جو نہ صرف دور حاضر کے تمام علماء اور صلحا کو یکسر غلط کہتا ہے بلکہ پورے دین اور قرآن و سنت کو وقتی اور عارضی چیز اور قابل اصلاح گردانتا ہے۔ مگر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہیں کہ اسے دین و دیانت کی سند عطا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف نشوز پایا جاتا ہے۔“ اور ”نہ ہی وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین و ایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔“

اس سلسلہ میں مدیر بینات کو حیدر آباد سندھ کے ایک دینی حمیت اور غیرت کے حامل نہایت نیک دل قاری کا جناب ڈاکٹر اسرار

احمد صاحب کے نام اصلاحی مکتوب موصول ہوا۔ جو بینات کراچی بابت رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ میں مندرجہ بالا مضمون کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع ہو چکا ہے، مناسب معلوم ہوا کہ اس کی افادیت کے پیش نظر اب بھی اسے بطور ضمیمہ شامل اشاعت کیا جائے۔
(سعید احمد جلال پوری)

محترم اسرار احمد صاحب، مدیر ماہنامہ میثاق لاہور، السلام علیکم!
آپ کا مضمون بعنوان ”تذکرہ و تبصرہ“ ماہنامہ میثاق شمارہ اکتوبر ۱۹۶۸ء نظر سے گزرا، اس ”تذکرہ و تبصرہ“ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے:
۱:..... یہ متضاد چیزوں سے بھرا ہوا ہے، یہ گمراہ کن ہے، بہت سی جگہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کارناموں کو سراہا ہے اور سچ یہ ہے کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کے لئے وکالت کا حق ادا کر دیا ہے۔

۲:..... آپ نے کئی جگہ ڈاکٹر صاحب سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے مثلاً:
”اس معاملہ میں سب سے زیادہ نقصان ڈاکٹر فضل الرحمن کی ذات کو پہنچا ہے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان پر کسی قدر زیادتی بھی ہوئی ہے۔“

۳:..... آپ کو ڈاکٹر صاحب کے نقائص کی تو بڑی فکر ہے لیکن آپ کو امت مسلمہ کے ایمان کھو جانے کا تو شاید ذرہ بھر بھی احساس نہیں۔
۴:..... ایک جگہ آپ نے لکھا ہے:

”اس کے بالکل برعکس معاملہ ”اسلام“ کا ہے کہ بظاہر یہ مختصر کتاب ایک متعین فکر پر مبنی ہے اور اس نے اسلام کے

اساسی اعتقادات سے لے کر نظام شریعت کی تفصیل و تشکیل تک پورے مسئلے کو ایک خاص نقطہ نظر کے ساتھ مربوط شکل میں پیش کیا ہے اور اپنی طرز فکر کی تائید و تقویت کے لئے ایک ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ بھی اسی نقطہ نظر سے کر دکھایا ہے اور اس کی عقلی توجیہ بھی پیش کر دی ہے۔“

کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس ”خاص نقطہ“ نظر کی وضاحت بھی کرتے کہ وہ نقطہ نظر..... اسلامی اساسی اعتقادات سے لے کر نظام شریعت کی تفصیل و تشکیل تک کیسے فٹ بیٹھتا ہے، جس نقطہ نظر میں مستشرقین کا زہر بھرا ہوا ہے کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان کے نقطہ نظر سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت، قرآن کے کلام اللہ ہونے کی عظمت کے اوپر بہت بڑی آنچ آتی ہے؟ جس کی جسارت اس سے پہلے شاید ہی کسی مسلمان کھلوانے والے نے کی ہوگی۔ اگر کسی نے کی تو امت مسلمہ نے اسے کبھی (حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی) معاف نہیں کیا، اور وہ امت مسلمہ کی نظر میں ہمیشہ ہمیشہ ذلیل اور رسوا ہے۔

۵:..... ایک اور جگہ آپ نے فرمایا ہے :

”ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالب علم ہے، ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف ”نشوز“ پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین ایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہے۔“

کہیں آپ ان کو ایک سنجیدہ طالب علم مانتے ہیں اور کہیں ماہر فن مؤرخ کی طرح اسلام کی پوری تاریخ کا تجزیہ کرنے والا۔ اب ان دونوں القاب میں سے کونسا لقب

ڈاکٹر موصوف کے لئے موزوں ہے خود فیصلہ کر لیں۔

آپ کا یہ کہنا کہ :

”ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف

نشوز پایا جاتا ہے۔“

سے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا سارا کارنامہ بعینہ اسلام کے مطابق ہے اور اس سے اسلام کو بڑی تقویت پہنچی ہے جس پر ڈاکٹر صاحب کو داد دینی چاہئے اور علما دین نے سالہا سال ان کے کارناموں کے خلاف اپنے ماہناموں اور تقاریر میں جو احتجاج کیا ہے اور ابھی تک کر رہے ہیں وہ سب لغو ہے۔ جب آپ کی نظر میں مندرجہ ذیل اعتقادات رکھنے والے اور اشاعت کرنے والے آدمی کی طبیعت میں بھی اسلام کے خلاف نشوز نہیں پایا جاتا تو آخر وہ کونسی چیز ہوگی جس کو آپ کی غیرت و حمیت اسلام کے خلاف تصور کرے گی؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ : پورا قرآن کلام الہی بھی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی..... قرآنی قوانین ابدی نہیں..... قرآن میں صرف تین نمازوں کا ذکر ہے۔ باقی دو زائد نمازیں بعد کی اختراع ہیں، معراج کا عقیدہ ایک افسانہ ہے، زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے، احادیث کے سارے صحیفے ساقط الاعتبار ہیں وغیرہ وغیرہ (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ)

ہمارے خیال میں ڈاکٹر صاحب کے کارنامے کی تائید میں یہ الفاظ کافی ہیں اور اس سے زیادہ انہیں کیا سرٹیفکیٹ چاہئے کہ ایک ایسے دینی رسالے میں جس کی سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب جیسی شخصیت کو حاصل ہے اس میں یہ لکھا ہوا ملے کہ :

”ہمارے اندازے کے مطابق وہ ایک سنجیدہ طالب علم

ہیں، ہماری رائے میں نہ تو ان کی طبیعت میں اسلام کے خلاف

نشوز پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ خیال درست ہے کہ وہ محض پیٹ پالنے کے لئے دین و ایمان کا سودا کرنے والے لوگوں میں سے ہیں۔“

اگر ہم سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تصنیف ”خلافت و ملوکیت“ کے بارے میں یہ کہتے رہتے ہیں کہ ایک شیعہ عالم کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے کہ وہ اپنے مذہب کی تائید میں ایک سنی عالم کی یہ تصنیف پیش کر دے، تو ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے گروہ مغرب پرست اور الحاد پسند کو تجدد کی تائید میں اس سے زیادہ اور کونسی چیز درکار ہو سکتی ہے جو آپ نے اپنے ادارے میں پیش کر دی؟

۶:..... اگر کہیں آپ نے ڈاکٹر صاحب کے کارنامے سے کچھ اختلاف کی جھلک دکھائی ہے تو اس کو اس طرح ہاکا کر کے دکھایا ہے مثلاً:

”یہ دوسری بات ہے کہ ایک مخصوص تعلیم و تربیت کی بناء پر ان کا نقطہ نظر ایک خاص رخ پر ڈھلتا چلا گیا ہے اور ان کے ذہن پر مغرب کے فلسفہ اور مادہ پرستانہ طرز فکر کی چھاپ پڑتی چلی گئی ہے۔“

”ہم نے سر سید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے یہ چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے یا فضل الرحمانیت کی شکل میں، درحقیقت فکر سر سید ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔“

اس بارے میں آپ کو ایک اصولی بات یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے اعتقادات کی اشاعت جس سے کہ اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو مجروح کیا

جار ہا ہو خواہ سر سید سے ہو، پرویز سے، فضل الرحمن سے ہو یا کسی اور سے ہو، مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ ان کا مقابلہ ڈٹ کر کیا جائے۔ خواہ اس میں جان کی بازی لگانی پڑے۔ اور یہ مسلمان خدا کے فضل سے ہر وقت کرتے چلے آئے ہیں البتہ ڈاکٹر فضل الرحمن کی ذات اس بارے میں خاص امتیازی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ وہ ایک اسلامی مملکت کی مشنری کے جزو کی حیثیت سے ایک ایسی چیز کو تشکیل دے رہے تھے جو مسلمانوں کے بنیادی اعتقادات اور شریعت اسلامی کے صریح خلاف تھی، جس نے مسلمانوں کے خواص و عوام میں زبردست تشویش اور غم و غصہ کی لہر دوڑادی اور بالآخر حکومت کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے منصب سے الگ کر دے یا ڈاکٹر صاحب نے خود مجبور ہو کر اپنے کو اس عہدے سے الگ کر دیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے گروہ کی کوششوں کے خلاف مسلمانوں میں جتنا غم و غصہ پھیلا ہے آپ کی مذکورہ کالت نے ”میثاق“ کے خلاف بھی اسی قسم کے غصہ کی لہر دوڑادی ہے۔

تاہم میرا خیال ہے کہ آپ کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے وہ ایک فکری سہو کا نتیجہ ہے اور آپ کی دینی غیرت و حمیت سے پوری توقع رکھتا ہوں کہ آپ کی توجہ اس طرح مبذول کرانے پر آپ اب ”سبدہ سہو“ کے طور پر مذکورہ خیالات سے علی الاعلان رجوع اور برأت کا اظہار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ (آمین)

عبید اللہ ہاشمی (حیدر آباد)

کیا تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء سیاسی تھی

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى، اما بعد :

ماہنامہ ”میشاق“ لاہور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف ”مولانا مودودی مرحوم اور میں“ کے عنوان سے اپنی سرگزشت قلمبند کر رہے ہیں، اس کی دوسری قسط میں، جو ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں :

”۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹری سے اتار کر رکھ دیا، چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لا نافذ ہوا، اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔“

۱۹۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے زعماء نے کیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے، لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دل آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے، دل آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علماء کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت کانگریس کے ہممنوا رہے تھے، اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی علماء اور ثانیا بریلوی مکتب فکر کے علماء و زعماء تھے۔

مسلمانوں کا بچہ بچہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ”ختم نبوت“ کا مسئلہ خالص دینی و مذہبی مسئلہ ہے، ۱۹۵۳ء میں قزاقان ختم نبوت کی جارحیت اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ علمائے امت اور زعمائے ملت کو اس کے انسداد کی طرف متوجہ ہونا پڑا، اور اس وقت کے ارباب اقتدار کی ناعاقبت اندیشی سے یہ دینی مطالبہ پوری قوم کا مطالبہ بن گیا۔

اس کے برعکس جناب ڈاکٹر صاحب موصوف اس کو دینی نہیں بلکہ سیاسی مسئلہ فرماتے ہیں اور ان تمام اکابرین کی نیت پر حملہ کرتے ہیں جو اس مقدس تحریک کا ہر اول دستہ تھے، ڈاکٹر صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے وہ خالص ”قادیانی ذہن“ کی ترجمانی ہے، البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس ذہن سازی میں کن کن لوگوں کا حصہ ہے، یا قادیانیوں کے ساتھ ان کا کون سا جلی یا خفی رشتہ ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد،
جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہنامہ ”میشاق“ لاہور (ذوالحجہ کی اشاعت) میں تحریک ختم نبوت ۵۳ء کے بارے میں اظہار خیال فرمایا تھا۔ راقم الحروف نے اس سلسلہ میں ایک عریضہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لکھا، حال ہی میں اس کا جواب مرحمت فرماتے ہوئے موصوف نے فرمائش کی ہے کہ اسے ”بینات“ میں شائع کر دیا جائے، تقریب سخن کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا زیر بحث اقتباس اور اس پر راقم الحروف کا خط بھی درج کیا جائے۔ نیز ڈاکٹر صاحب کے جواب کی روشنی میں چند مزید باتیں عرض کر دی جائیں۔ گویا یہ مضمون علی الترتیب چار حصوں پر مشتمل ہوگا :

۱۔۔۔۔۔ ماہنامہ میشاق کا زیر بحث اقتباس

۲۔۔۔۔۔ راقم الحروف کا خط

۳۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا جواب

۴۔۔۔۔۔ اس جواب پر تبصرہ۔۔۔۔۔ واللہ الموفق

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

ماہنامہ میثاق لاہور کا اقتباس

”سنہ ۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کیلئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹری سے اتار کر رکھ دیا۔ چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لاء نافذ ہوا اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دور رس اثرات مرتب ہوئے۔“

سنہ ۱۹۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے ان زعمائے کیا تھا جو سنہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے اور اب اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے۔ دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علمائے کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنی کی زیر قیادت کانگریس کے ہمنوا رہے تھے اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی زعماء اور ثانیاً بریلوی مکتب فکر کے علماء و زعماء تھے۔ جماعت اسلامی اور مولانا

مودودی اس معاملے میں بالکل :

”نے تاب و صل دارم نے طاقت جدائی!“

والے مخمضے میں مبتلا ہو گئے تھے اس لیے کہ جماعت کی تاسیس جن اصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی ان کی رو سے اس کا اس تحریک میں حصہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا۔ لیکن سیاسی اکھاڑے میں اتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا معاملہ مسلسل ”نیمے دروں نیمے بروں“ کا رہا یعنی یہ کہ بظاہر، تحریک میں شامل بھی ہیں، لیکن بباطن، اس سے علیحدہ اور بری بھی۔!!۔ بہر حال اس وقت پیش نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اس زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا۔ اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز متحدہ مجلس عمل نے راست اقدام یعنی ڈائریکٹ ایکشن کے آغاز کا اعلان کیا، اور جماعت اسلامی کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں ”البتہ ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔“ اس روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار ان کی زبان سے انگریزی کا ایک محاورہ سنا۔۔۔ مولانا نے فرمایا ”ہم اس صورت حال سے وہ فلائنگ کلرز (فٹ) کے جھنڈے لہراتے ہوئے نکلتے ہیں!“۔ لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ

خوش فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے ”جوابی اقدام“ کی لپیٹ میں دوسرے علما وزعماء کے ساتھ مولانا بھی آگئے بلکہ وقت کے بعض ”فراعنہ“ نے جو موقع کی ٹاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لا کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا۔“

(۲)

ڈاکٹر صاحب کے نام راقم الحروف کا خط

”محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ اللہ وعافاہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔“

میشاق“ کے تازہ شمارہ (ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ) میں جناب نے اپنے مضمون ”مولانا مودودی مرحوم اور میں“ میں صفحہ ۶۵-۶۶ پر ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے، (یہاں ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس کا حوالہ دیا گیا)

اس ناکارہ نے جناب کی اس تحریر سے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں :

- ۱: — سنہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت (جسے جناب ”انٹی قادیانی تحریک“ سے تعبیر فرماتے ہیں) مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تحریک تھی
- ۲: — یہ تحریک ملک و ملت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی
- ۳: — یہ اتنی ہی خطرناک تھی جتنی کہ کمیونسٹ عناصر کی

پاکستانی طلبہ میں عظیم ترین ہل چل،

۴:۔۔۔۔۔ اس تحریک کے بانی مبنی اور مدار الہام ”احرار“ تھے جن کا مقصد پاکستان سے اپنی شکست فاش کا انتقام لینا تھا

۵:۔۔۔۔۔ احرار“ کے علاوہ جس قدر علما و صلحا نے اس میں حصہ لیا وہ یا تو اپنی کانگریسی ذہنیت کی بنا پر اس میں شریک ہوئے یا اپنے ضمیر و وجدان کے علی الرغم محض عوامی دباؤ کی وجہ سے، گویا خدا و رسول کی رضامندی اور دینی حمیت و غیرت کی بنا پر ان میں سے ایک بھی شریک نہیں ہوا تھا۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے اکثر زعماء خدا تعالیٰ کے حضور پہنچ چکے ہیں، اور ہر ایک کو اپنے کئے کا بدلہ مل چکا ہے، ”ان خیرا فحیر وان شرافشر“۔ ظاہر ہے کہ وہ ہماری مدح و ستائش اور ذم و نکوہش سے بالاتر ہیں۔ آپ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کا تو کوئی نقصان نہیں بلکہ کچھ نفع ہی ہوا ہوگا، کہ اس ”غیبت“ کے ذریعہ جناب نے اپنی نیکیوں کا تحفہ ان کو عطا کیا، میرا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کے اسیر حلقہ رہنے کی وجہ سے جناب کو نہ تو ان معروضی حالات کا علم ہے جن کی وجہ سے یہ تحریک اٹھی، اور نہ ان اکابر امت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس ناکارہ کو ان اکابر کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہے، اور ان کی خلوت و جلوت کا بغور مطالعہ کیا ہے، اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر اگر ان کے صدق و اخلاص اور حمیت و للہیت کی قسم کھاؤں تو انشاء

اللہ حادث نہیں ہوں گا۔

صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ یہ ناکارہ جناب کی اس تحریر کو سفید جھوٹ اور اکابر اولیاء اللہ کے حق میں ”سبحانک هذا بہتان عظیم“ کا مصداق سمجھتا ہے۔ اس افترا پردازی سے جناب کے بارے میں جو خوش فہمی تھی وہ بھی زائل ہو گئی۔ عارف رومیؒ کے بقول :

”چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکل زند“

ارادہ تھا کہ جناب کی اس دل خراش تحریر پر حسبہ للہ و ذبنا عن اولیائہ کچھ لکھوں، پھر خیال ہوا کہ اس سلسلہ میں چند امور دریافت کر لئے جائیں :

۱ — تحریک کے دو ہدف تھے۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، اور قادیانی وزیر خارجہ کو، جس نے اپنی سرکاری حیثیت کو قادیانیت کے فروغ و تبلیغ کا ذریعہ بنا رکھا تھا، برطرف کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ایک مطالبہ یہ تھا کہ قادیانی مرتدین کو کلیدی اسامیوں سے ہٹایا جائے۔ کیا آپ ان مسائل کو دینی مسائل سمجھتے ہیں یا آپ کے نزدیک یہ ”سیاست“ ہے؟ اگر یہ سیاست ہے تو ”دینی مسائل“ کی کیا تعریف ہے۔

۲ — سنہ ۱۹۷۴ء کی تحریک کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا وہ بھی ”سیاست بازی“ تھی؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جو مسئلہ

۵۳ء میں سیاسی تھا۔ وہی ۷۷ء میں دینی کیسے بن گیا؟ اور اگر یہ بھی ”سیاست“ تھی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ۷۷ء کے آئینی فیصلے سے جناب کو اتفاق نہیں؟

۳۔۔۔۔۔ جناب نے اکابر ملت پر جو الزام لگایا ہے اس کا تعلق نیت و ارادہ سے ہے، یعنی یہ کہ ان کا مقصد دین نہیں تھا، بلکہ اپنی سیاسی حیثیت بحال کرنا تھا، اور باقی لوگ اپنے ضمیر کے خلاف شریک ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جناب کو اس کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟ اگر اس کی بنیاد کسی خبر پر ہے تو کیا آپ نے اس خبر کو قرآنی معیار ”ان جاء کم فاسق بنبا فتبینوا“ کے مطابق جانچ پرکھ کر اس کی صداقت کا علم الیقین حاصل کر لیا ہے؟ اور ہزاروں لاکھوں مقبولان خداوندی کی نیتوں پر حملہ کرنے والے فاسق کے بارے میں اطمینان فرمایا ہے؟ اگر جناب کی تحریر کی بنیاد کسی خبر پر نہیں، بلکہ اپنی ذاتی فہم و فراست پر ہے تو کیا حدیث نبویؐ ”فہلا شققت عن قلبہ“ کے مطابق جناب نے ان کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟ یا جناب کے یہاں ”احوال قلب“ دریافت کرنے کا کوئی آلہ دریافت ہوا ہے؟ ان اکابر امت سے جناب کا یہ سوء ظن آیت کریمہ ”یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم“ اور ارشاد نبویؐ ”ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث“ کے خلاف تو نہیں؟ اور پس از مرگ ان پر یہ سنگین الزام عائد کیا ”اذکروا موتاکم بخیر“ اور ”لایغتب بعضکم بعضا“ سے سرتابی تو نہیں؟

۶۔۔۔۔۔ جناب نے ان اکابر امت پر جو الزام عائد کیا ہے اس

سے پہلے قادیانی صاحبان اور فجر القوم جسٹس منیر بھی یہی الزام لگا چکے ہیں، اس کو ذوق و فکر کی اتفاقیہ ہم آہنگی تصور کیا جائے۔ یا خاص تعلیم و تربیت کا کرشمہ باور کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آنجناب مسٹر محمد علی لاہوری کی قرآن دانی کے بڑے مداح ہیں، اور آپ کا میلان لاہوریوں کی جانب ہے، کیا جناب کی اس تحریر سے ان لوگوں کے خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ جناب اس ناکارہ کی جرات و گستاخی سے درگزر فرماتے ہوئے ان امور کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

والسلام

محمد یوسف

۱۸/۱۲/۱۴۰۲ھ

(۳)

ڈاکٹر صاحب کا جواب

محترمی و مکرمی مولانا محمد یوسف لدھیانوی، زید لطفکم
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مورخہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ بروقت مل گیا تھا لیکن کچھ علالت طبع اور کچھ شدید مصروفیت کے باعث جواب میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، بلکہ میں نے زبانی معذرت مولانا محمد طاسین مدظلہ کی معرفت پہنچائی بھی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بھول گئے! اس لیے کہ

میں نے معذرت کے ساتھ یہ درخواست بھی کی تھی کہ میرے جواب سے قبل اس معاملے کو ”بینات“ میں نہ چھیڑا جائے۔ لیکن بینات، بابت محرم الحرام ۱۴۰۳ھ میں آپ نے اس معاملے کو ذکر فرمادیا۔ بہر حال چونکہ تاخیر کی تقصیر میری جانب سے ہوئی ہے لہذا مجھے شکایت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

آپ کے خط سے مجھے بعض پہلوؤں سے اطمینان بلکہ خوشی بھی حاصل ہوئی لیکن ایک پہلو سے افسوس بھی ہوا۔ خوشی اس بات سے ہوئی کہ آپ نے اس معاملے کو پرچے میں چھیڑنے سے قبل مجھے وضاحت کا موقع عنایت فرمایا (یہ دوسری بات ہے کہ میں اس سے بوجہ فائدہ نہ اٹھا سکا!)۔ اطمینان اس سے ہوا کہ آپ ہماری مطبوعات پر نظر رکھتے ہیں۔ لہذا آئندہ بھی جہاں کوئی غلط فہمی یا غلط رجحان پائیں متوجہ فرمادیں گے۔ اور افسوس اس بات کا ہوا کہ آپ نے میری تحریر سے نتائج اخذ کرنے میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ ہر معاملے کے بہت سے درمیانی امکانات اور دیگر توجیہات کو نظر انداز کرتے ہوئے لمبی چھلانگ لگا کر آخری ممکنہ نتیجے اور ناگوار توجیہ تک جا پہنچے ہیں۔

میری تحریر کے جس حصے پر آپ نے گرفت فرمائی ہے اس کے بارے میں یہ حقیقت یقیناً آپ کی نگاہ سے اوچھل نہ ہوگی کہ اس میں اصل بحث سنہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے مالہ یا ماعلیہ پر نہ تھی بلکہ اصلاً ذکر مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے موقف کا تھا۔ تحریک کا آغاز کرنے والوں یا اس میں پہلے

یا بعد میں شریک ہونے والوں کا ذکر محض تمہیدی اور سرسری طور پر آیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں بات بہت مختصر ہوئی اور اسی اختصار کے باعث غلط فہمی کے دروازے وا ہوئے۔ بہر حال میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے وضاحت کا موقع دیا، اور اب جب کہ اس معاملے کا ذکر ”بینات“ میں آہی گیا ہے متوقع ہوں کہ آپ میری وضاحت بھی شائع فرمادیں گے۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی مسئلے یا مطالبے کے فی نفسہ صحیح یا غلط ہونے کا معاملہ جدا ہے اور اس کو ایک تحریک کی صورت میں لے کر اٹھنے والوں کا جدا۔ پھر تحریک لے کر اٹھنے والوں کے بھی طرز عمل اور طریق کار کا مسئلہ جدا ہے اور ان کی نیتوں اور قلبی ارادوں کا جدا !!! تبھی تو بعض تحریکوں کے بارے میں بعض اکابر سے یہ الفاظ منقول ہیں کہ ”کلمۃ حق ارید بھا الباطل!“ جو یقیناً جناب کے علم میں ہوں گے۔ (یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فقرہ خارجیوں کے بارے میں تھا، ناقل)۔

کسی بھی تحریک کے ضمن میں ان تین چیزوں (یعنی اصل نوعیت مسئلہ ۲۔ طریق کار اور طرز عمل، ۳۔ اور نیت و ارادہ) کے مابین خلط بحث کے سے بہت سے مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں، اور یہی غلطی، میں ادب کے ساتھ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میری اس تحریر کے ضمن میں آپ سے ہوئی ہے۔ کہ میں نے اس میں نہ اصل مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں کوئی بحث کی ہے نہ ہی تحریک چلانے والوں کی نیت کے بارے میں کوئی

رائے ظاہر کی ہے بلکہ واقعاتی انداز میں تحریک کے رخ اور نہج پر گفتگو کی ہے۔ گویا میری گفتگو متذکرہ بالا تین امور میں سے صرف درمیانی معاملے کے بارے میں تھی، لیکن آپ نے از خود میرے بعض الفاظ سے (جن کی دوسری توجیہ بھی ہے جو میں ابھی عرض کروں گا) اول و آخر کے بارے میں بھی میری رائے مستنبط فرمائی اور پھر اس پر پوری تنقید کی بنیاد رکھ دی۔ اور مجھے سوء ظن سے اجتناب کی بجاطور پر تلقین کرتے ہوئے خود میرے بارے میں سوء ظن کی انتہائی حدود کو چھوا۔

کون مسلمان بقائمی ہوش و حواس یہ کہہ سکتا ہے کہ ختم نبوت کا مسئلہ خالص دینی اور مذہبی نہیں سیاسی ہے۔ اور الحمد للہ کہ میری تحریر میں ایک حرف بھی ایسا نہیں جس کی اساس پر میری جانب یہ رائے منسوب کی جاسکے۔ البتہ اس کے لیے جو تحریک سنہ ۱۹۵۳ء میں اٹھی تھی اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس کا انداز اولاً تو خود بھی سیاسی تھا۔ اور ثانیاً اسے اس وقت کے برسر اقتدار لوگوں نے باہمی کشمکش کا آلہ بنا کر مزید سیاسی رنگ دے دیا، اور اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ بھی ملک و ملت دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوئے کہ جہاں تک قادیانیت، یا ختم نبوت کے مسئلے کا تعلق ہے وہ تو جوں کا توں رہا اور اس کے حل کی جانب پیش قدمی نہ ہو سکی، البتہ ملکی سیاست کی گاڑی کو جمہوری پٹری سے اتار کر مارشل لا اور آمریت کے رخ پر ڈالنے کے لیے میدان ہموار ہو گیا۔

رہا اس تحریک کا آغاز کرنے والوں یا بعد میں شامل ہونے والوں کی نیت کا معاملہ تو اس پر میں نے نہ تو اس تحریر میں کوئی حملہ کیا ہے اور نہ ہی 'خدا گواہ ہے کہ' میرے دل و دماغ کے کسی بعید ترین گوشے تک میں ان کے حسن نیت کے بارے میں کوئی شک موجود ہے!!!

میرے نزدیک صورت واقعہ تو یہی ہے کہ اس تحریک کا آغاز زعمائے احرار نے کیا تھا جو سیاست کے میدان کے معروف شہسوار تھے، لیکن اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ ان کی نیتیں ٹھیک نہ تھیں بلکہ ان میں کوئی فتور تھا اور معاذ اللہ ملک و ملت کو کوئی نقصان پہنچانا ان کے پیش نظر تھا۔ اسی طرح اس تحریک کے قوت پکڑ جانے کے بعد جو حضرات جس ترتیب کے ساتھ اس میں شریک ہوئے ان کا ذکر بھی بطور اظہار واقعہ ہوا ہے جس پر اس اعتبار سے تو یقیناً بات ہو سکتی ہے کہ وہ واقعاتی طور پر صحیح ہے یا نہیں لیکن اس سے ان کی نیتوں کے بارے میں میری جو رائے آپ نے مستنبط فرمائی ہے اس سے میں پوری شدت کے اظہار برات کرتا ہوں۔

میرے نزدیک اس صورت واقعہ کی اصل توجیہ یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر جماعت کے سامنے کرنے کے کاموں کے ضمن میں اولیت اور ثانویت اور تقدیم و تاخیر کا کوئی تصور ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ ہر شخص یا گروہ بیک وقت تمام کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق اپنے لیے

کرنے کا اصل کام متعین کر لیتا ہے اور اسی پر اپنی بہتر و بیشتر مساعی کو مرکوز کر دیتا ہے اور بہت سے دوسرے کاموں سے اصولی اتفاق کے باوجود اپنی عملی مساعی کا رخ ان کی جانب نہیں پھیرتا۔ اگرچہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ باقی تمام کاموں کو وہ یکسر غلط خیال کرتا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص یا گروہ کسی وقت کسی اور مسئلے کو اٹھا کر بالفعل سامنے لا کر کھڑا ہی کر دے تو اسے اس کے ضمن میں کوئی منفی یا مثبت موقف اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میرے نزدیک سن ۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک بالکل اسی نہج پر آگے بڑھی کہ ایک دینی اعتبار سے بالکل صحیح مسئلے کو لے کر اولاً زعمائے احرار اٹھے۔ لیکن بعد میں جب اس نے قوت پکڑ لی تو دوسرے حضرات بھی جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اس کی طرف متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ اس میں شامل ہوتے چلے گئے (اسی کو میں نے اپنی تحریر میں حالات کے دباؤ سے تعبیر کیا ہے!) بہر حال علما کرام کے مختلف حلقے جو اس میں شامل ہوئے ان میں کون پہلے آیا، اور کون بعد میں یہ تو ایک خالص واقعاتی مسئلہ ہے۔ البتہ ان کا اس میں شریک ہونا اور ان کے موقف کے اعتبار سے ہرگز کسی تضاد عملی کا مظہر نہیں تھا جب کہ اس میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی شرکت میرے نزدیک ان کے سابقہ موقف کے اعتبار سے صریح تضاد کا مظہر تھی۔ اور اپنی اسی رائے کے اظہار کے لئے میں نے ”مولانا مودودی اور میں“ میں اس واقعے کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اس

لئے کہ فی الواقع ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ضمن میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے طرز عمل ہی سے پہلی بار میرا ذہن اس حقیقت کی جانب متوجہ ہوا تھا کہ یہ تحریک اپنے اصل اساسی نظریات سے منحرف ہو رہی ہے! ---- !!

یہ ہے میرے ذہن کے مطابق صورت واقعہ کی اصل تصویر! ---- اب اس پر آپ خود ہی غور فرمائیں کہ میری جانب ان خیالات کی نسبت کس قدر غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ :
”احرار کا مقصد“ پاکستان سے اپنی شکست فاش کا انتقام لینا تھا!“

۲۔ ”احرار کے علاوہ جس قدر علما و صلحا نے اس میں حصہ لیا وہ یا تو اپنی کانگریسی ذہنیت کی بنا پر اس میں شریک ہوئے تھے یا اپنے ضمیر اور وجدان کے علی الرغم محض عوامی دباؤ کی وجہ سے ---- گویا خدا اور رسولؐ کی رضامندی اور دینی حمیت وغیرت کی بنا پر ان میں سے ایک بھی شریک نہیں ہوا تھا۔“

مجھے یقین ہے کہ آپ خود بھی دوبارہ غور فرمائیں گے تو یہ محسوس کر لیں گے کہ میری تحریر سے ان انتہائی نتائج تک پہنچنے میں آپ نے بہت بڑی چھلانگ لگائی ہے۔ ورنہ میرے الفاظ کا لازمی نتیجہ وہ نہیں ہے جو آپ نے نکالا ہے۔ بالخصوص آپ کی محولہ بالا عبارت کا آخری جملہ تو آپ کی ”زیادتی“ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بہر حال اگر میرے الفاظ میں اختصار کی بنا پر یا غیر محتاط طرز تعبیر کے باعث اس معاملے میں کسی غلط فہمی کی کوئی بنیاد ہے تو میں اپنی اس

تحریر کے ذریعے اس سے اعلان برات کرتا ہوں، اور اعلان کرتا ہوں کہ ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کو لے کر اٹھنے والوں یا بعد میں شامل ہونے والوں میں سے کسی کی نیت کے بارے میں مجھے کوئی شک یا شبہ نہیں ہے۔

آپ کا فرمانا یہ صحیح ہے کہ مجھے ان اکابر کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع بالکل نہیں ملا یا بہت کم ملا، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اپنی نوجوانی کے دور میں مجھ پر ایک خاص حلقے اور اس کے مخصوص طرز فکر کی چھاپ رہی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس حلقے کے ساتھ شدید قلبی لگاؤ اور عملی وابستگی کے دور میں بھی مجھ اللہ مجھ پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جس میں پالیسی یا طریق کار کے ضمن میں شدید اختلاف کے باوجود ”کانگریسی علما“ یا ”احرارِ زعماء“ کی نیتوں کے بارے میں سوء ظن کا کوئی پرچھانواں میرے ذہن یا قلب پر پڑا ہو۔ رہا حالات و واقعات سے پوری طرح باخبر ہونے کا الزام تو اس کے امکان کو میں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی کسی واقعے کے بارے میں میرے علم میں آیا کہ اس کے بارے میں میری معلومات درست نہ تھیں تو میں اس پر از سر نو غور کرنے کے لیے کھلے دل سے تیار ہوں گا۔ اور اس ضمن میں آپ کی جانب سے کسی نشاندہی کا نہ صرف یہ کہ خیر مقدم کروں گا بلکہ اس پر تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں گا۔

جہاں تک سنہ ۷۴ء کی تحریک کے بارے میں آپ کے سوالات کا تعلق ہے تو اگرچہ ان کا جواب بھی میری مندرجہ صدر

گزارشات میں آگیا ہے تاہم اسکے ضمن میں اپنی تفصیلی رائے کی وضاحت کے لیے میں آپ کو ”میشاق“ کی نومبر ۷۷ء کی اشاعت کا ایک نسخہ ارسال کر رہا ہوں جس کے تذکرہ و تبصرہ میں صفحہ ۲ سے صفحہ ۱۳ تک نہ صرف ۷۷ء کی تحریک بلکہ مسئلہ ختم نبوت اور قادیانیوں کی تکفیر کے بارے میں میری مفصل رائے درج ہے۔ پوری بحث تو انشاء اللہ آپ اس میں پڑھ ہی لیں گے اس میں جس خاص بات کی جانب میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سنہ ۷۳ء کی تحریک کے مقابلے میں سنہ ۷۷ء کی تحریک کو جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے اسباب و عوامل میں سے اہم ترین عوامل میرے نزدیک یہی تھے کہ ایک تو اس بار اسے کسی سیاسی جماعت نے نہیں اٹھایا تھا بلکہ یہ بالکل از خود سراسر قادیانیوں کی اپنی حماقت کے باعث اٹھی تھی، اور دوسرے یہ کہ اس کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے ہاتھ میں آئی جو معروف اور مروجہ معانی کے اعتبار سے خالص غیر سیاسی شخصیت تھے۔ اس تقابل سے انشاء اللہ ۷۳ء کی تحریک کے بارے میں میرے ان مختصر الفاظ کا مفہوم آپ کے سامنے زیادہ نکھر کر آجائے گا جن کی بنا پر آپ کو غلط فہمی لاحق ہوئی۔

آخر میں اعتراف اور دو احتجاج،

اعتراف اس کا کہ قادیانیوں کے خارج از ملت ہونے کے بارے میں تو کوئی اشتباہ مجھے کبھی بھی نہیں رہا۔ البتہ جس حلقے کی چھاپ کا ذکر اوپر آیا ہے اس کے زیر اثر لاہوریوں، کو کافر قرار دینے

سے ہچکچاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ آنجہانی غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں بلکہ صرف مجدد مانتے ہیں۔ (مولانا مودودی نے بھی منیر کمیشن کے سامنے لاہوری احمدیوں کو کافر نہیں، منافق قرار دیا تھا!) لیکن سنہ ۷۷ء کی تحریک کے دوران یہ مسئلہ جس طرح منٹخ ہو کر میرے سامنے آیا اس سے بھم اللہ میرا یہ وسوسہ دور ہو گیا (میری تالیف ”تحریک جماعت اسلامی“ میں بھی اس ضمن میں میری سابقہ رائے درج ہے وہ ایک عرصے سے غیر دستیاب ہے۔ آئندہ جب بھی اس کی طباعت کی نوبت آئی اس میں میں اپنی تبدیل شدہ رائے کی وضاحت کروں گا!)

احتجاج نمبر ۱----- اس پر کہ اگر میں نے اپنی تحریر میں ۷۵ء کے دو اہم واقعات (یعنی انٹی قادیانی موومنٹ اور کمیونسٹ طلبہ کی پیدا کردہ ہل چل) کا ذکر کیا تھا تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ میرے نزدیک وہ دونوں یکساں غلط یا برابر خطرناک تھے؟

اور دوسرا احتجاج----- اس پر کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ میری سوچ کے ڈانڈے قادیانیوں اور جسٹس منیر سے ملا دیئے لیکن اس سے بھی بڑھ کر ”بعض لوگوں“ کے حوالے سے مجھ پر لاہوریوں کی جانب میلان اور ”مسٹر محمد علی کی قرآن دانی“ کی مداحی کا الزام بھی عائد کر دیا۔ حالانکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، کچھ ہی عرصہ قبل میری کراچی کی ایک تقریر کی غلط اخباری رپورٹنگ پر آپ کی جانب سے استفسار کے جواب میں میرے بزرگ رفیق کار

شیخ جمیل الرحمن صاحب نے آپ کو ہماری دوسری مطبوعات کے ساتھ ”تاریخ دعوت رجوع الی القرآن“ کے ضمن میں میری مفصل تحریر بھی ارسال کر دی تھی۔ اس کے باوجود آپ کی جانب سے اس شبہ کا اعادہ ناقابل فہم ہے۔ بہر حال میں ان دونوں باتوں سے شدت کے ساتھ اعلان برات کرتے ہوئے آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جن صاحب نے یہ بہتان مجھ پر لگایا تھا آج وہ خود تو حد رجم کے مسئلے میں قادیانیوں، لاہوریوں اور منکرین حدیث کی صف میں کھڑے ہیں اور میں نے اسی بنا پر ان سے قطع تعلق کا اعلان ماہنامہ ”حکمت قرآن“ کی اشاعت بابت جولائی اگست ۸۲ء میں کیا ہے جو اس کے صفحہ نمبر ۷۵ پر دیکھا جاسکتا ہے (فوری حوالے کے لیے میں اس کا بھی ایک نسخہ ارسال کر رہا ہوں)

میں انشاء اللہ العزیز ۱۹ تا ۲۸ دسمبر ۸۲ء کراچی میں مقیم رہوں گا۔ اور اس دوران میں انشاء اللہ کسی روز وقت نکال کر آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں گا جس کے لیے میرے رفیق کار عبد الواحد عاصم آپ سے پیشگی وقت طے کر لیں گے۔

(نوٹ) اس خیال سے کہ شاید آپ کے پاس اپنے گرامی نامے کی نقل نہ ہو فوری حوالے کے لیے اس کی فوٹو اسٹیٹ بھی ارسال خدمت ہے!) باقی عند الملاقات۔ فقط والسلام مع الاکرام
خاکسار اسرار احمد عفی عنہ ۱۰ دسمبر ۸۲ء

۱۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب اپنے وضاحتی مکتوب میں تسلیم کرتے ہیں کہ تحریک ختم نبوت ۱۹۳۳ء میں جن حضرات نے حصہ لیا وہ ان کے نزدیک مخلص اور نیک نیت تھے اور یہ کہ ان کا مطالبہ صحیح اور حق بجانب تھا، لیکن موصوف کو دو باتوں پر ہنوز اصرار ہے۔ ایک یہ کہ تحریک کا آغاز احرار نے کیا۔ دوم یہ کہ مطالبہ کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ صحیح نہیں تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ دو باتیں بھی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ اور قادیانیت کا رد و تعاقب احرار کا ہمیشہ سے خصوصی ہدف رہا۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں انجمن خدام الدین کے عظیم جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ”امیر شریعت“ منتخب کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پر خود بھی بیعت کی، اور پانچ سو اکابر علما جو اس جلسہ میں موجود تھے۔ ان سے بھی بیعت کرائی، (ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ فرماتے تھے کہ میں اس جلسہ میں موجود تھا، اور بیعت کرنے والوں میں چوتھا یا پانچواں نمبر میرا تھا) حضرت امام العصرؒ کو رد قادیانیت کا خصوصی اہتمام تھا، اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ”امیر شریعت“ کا خطاب دے کر اہل علم سے ان کے ہاتھ پر بیعت کرانا اس امر کی وضاحت تھی کہ عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی خدمت ان کے سپرد کی جا رہی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں ”مجلس احرار اسلام“ قائم ہوئی، وہ دن اور آج کا دن، حضرت امیر شریعتؒ اور ان کی جماعت (پہلے مجلس احرار اور پھر مجلس تحفظ ختم نبوت) اس فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوئی، اور انہوں نے مسلمانوں میں عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور سارقین حریم نبوت کی بخیہ دری کو اپنی

زندگی کا نصب العین بنالیا۔ قیام پاکستان کے بعد سے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء تک بھی انہوں نے اس سلسلہ میں پورے خلوص اور تندہی سے کام کیا، اور امت مسلمہ کو فتنہ قادیانیت کی ہولناکیوں سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن عقیدہ ختم نبوت پر احرار کی اجارہ داری نہیں تھی۔ بلکہ یہ ملت اسلامیہ کا مقدس ترین مشترک سرمایہ تھا۔ اور اپنے اپنے دائرے اور اپنی اپنی حیثیت میں دوسرے حضرات بھی اس کام کو ہمیشہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں احرار نے دیگر اعضاء ملت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا، بلکہ سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا گیا اور تمام جماعتوں کی نمائندہ ”مجلس عمل“ تشکیل دی گئی، وہی اس تحریک کی ذمہ دار تھی۔ پس احرار ڈاکٹر صاحب کے بقول، ”چھ سال تک منقار زیر پر رہنے کے بعد اچانک تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ نامساعد حالات میں بھی احرار نے خون جگر سے شمع ختم نبوت کو روشن رکھا۔ تا آنکہ وہ وقت آیا کہ ۱۹۵۳ء میں تمام جماعتوں نے مل کر تحریک کا علم اٹھایا، اور جو جماعتیں مسلمانوں کے اس اجتماعی مطالبہ میں شریک ہوئیں وہ کسی مجبوری، دباؤ یا اضطراری کیفیت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے دین و ایمان اور عقیدے کی بنا پر۔

۲۔۔۔۔۔ رہا طریقہ کار کا سوال، تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء کے بارے میں خود ڈاکٹر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صحیح تھی۔ حالانکہ ۱۹۷۴ء کی تحریک میں جو طریقہ کار اپنایا گیا ٹھیک وہی ۱۹۵۳ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ وہی تمام جماعتوں کا مشترک پلیٹ فارم، وہی مجلس عمل، وہی مشترک لائحہ عمل۔

ان دونوں تحریکوں میں تحریک اٹھانے والوں کے طریقہ کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ جن حکمرانوں سے مطالبہ کیا جا رہا تھا ان کے طریقہ کار میں ضرور فرق رہا۔ ۱۹۷۴ء کے حکمرانوں نے مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اور ملت کے احساسات

وجہات کا صحیح اندازہ کر کے اس مسئلہ کو قومی اسمبلی کے سپرد کر دیا۔ جب کہ ۱۹۵۳ء میں قومی اسمبلی بھی موجود تھی اور اس مسئلہ کو قومی اسمبلی میں لے جا کر دلائل و براہین کی روشنی میں حل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا مگر اس وقت کے خداوندان اقتدار نے نہ تو مسئلہ کی نزاکت کو سمجھا نہ ملت اسلامیہ کے جذبات و احساسات کا ٹھیک مطالعہ کیا۔ نہ وہ اس مسئلہ کے سیدھے سادے آئینی حل پر آمادہ ہوئے۔ ان کی دور بینی و دور اندیشی امریکہ و برطانیہ اور اقوام عالم کے رد عمل کو صاف دیکھتی تھی مگر خود ان کے ملک میں اور ان کے پاؤں کے نیچے جو قیامت برپا تھی وہ انہیں نظر نہیں آرہی تھی، مسلمانوں کے صحیح اور معقول مطالبے کو اگر اس وقت تسلیم کر لیا جاتا تو یہ مسئلہ ۱۹۷۴ء کے بجائے ۱۹۵۳ء میں خوش اسلوبی سے طے ہو گیا ہوتا، نہ دار و رسن کی ضرورت پیش آتی۔ نہ حکومت کا نظام مفلوج ہوتا۔ نہ مارشل لا کا پہلا تجربہ ہوتا۔ نہ ڈاکٹر صاحب کے بقول ملک جمہوریت کی پٹری سے اترتا۔ اور نہ وہ خداوندان اقتدار فصب علیہم ربک سوط عذاب کے تحت آتے۔ الغرض فرق دونوں تحریکوں کے درمیان نہیں جیسا کہ ڈاکٹر صاحب سمجھ رہے ہیں۔ بلکہ فرق دونوں وقت کے حکمرانوں کے رویہ اور ان کی قوت فیصلہ کے درمیان تھا۔

۳ — جناب ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ میں نے ان کی تحریر کے درمیانی امکانات و توجیہات کو نظر انداز کر کے لمبی چھلانگ لگائی، اور آخری نتیجہ ان کی طرف منسوب کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کے جن الفاظ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھے :

”سنہ ۱۹۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلس احرار کے زعماء

نے کیا تھا جو قیام پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی

تھی اسکے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیر پر رہے تھے۔ اور اب

اچانک انٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظر عام پر ظاہر ہوئے تھے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان فقروں سے جو نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں یہ لوگ اس تحریک میں مخلص نہیں تھے، اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ احرار کے شکست خوردہ ہونے یا ان کے ”منقار زیر پر“ رہنے کا ۵۳ء کی تحریک کے ساتھ کوئی منطقی ربط نہیں جب تک کہ یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ یہ تحریک احرار نے اپنی شکست کا انتقام لینے اور ملک کو نقصان پہنچانے کے لیے اٹھائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بڑی دردمندی کے ساتھ ان عظیم ترین نقصانات کو بھی ذکر کر رہے ہیں جو اس تحریک سے ملک کو پہنچے، اور اسی کے ذیل میں احرار کے علمبردار تحریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے مقابلہ میں ان کی شکست خوردگی اور اس کے زیر اثر چھ سال تک ان کے ”منقار زیر پر“ رہنے کو بطور خاص نوٹ کر رہے ہیں، اس سیاق و سباق میں کون کہہ سکتا ہے کہ جو نتیجہ میں نے ان کی عبارت سے اخذ کیا ہے، وہ غلط اور عاجلانہ ہے، یا ڈاکٹر صاحب کے بقول میں نے لمبی چھلانگ لگا کر نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان حضرات کو مخلص اور نیک نیت سمجھتے تھے اور ان کو اپنے خیال کے مطابق صرف اظہار واقعہ مقصود تھا تو انہیں احرار کی ”شکست فاش“ اور ان کے ”منقار زیر پر رہنے“ جیسے تکلیف دہ الفاظ (جن کا تحریک ۵۳ء سے کوئی ربط نہیں) استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھے الفاظ میں کہہ سکتے تھے کہ اس تحریک کا علم ایک سیاسی جماعت ”احرار“ نے اٹھایا تھا۔ گو یہ بات بھی خلاف واقعہ ہوتی، مگر ان بزرگوں کے بارے میں سوئے ظن پیدا نہ ہوتا۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ کا وہ نتیجہ اخذ کیا یہ تھی کہ جن لوگوں نے تحریک ختم نبوت ۵۳ء کو غلط کہا (خواہ وہ قادیانی ہوں یا سرکاری دوائر) انہوں نے سب سے پہلے تو اس تحریک کی تمام تر ذمہ داری احرار پر ڈالی، پھر ان

کی شکست فاش بمقابلہ تحریک پاکستان کو ذکر کیا، اور پھر ان دونوں باتوں کی بنیاد پر بتکرار و اصرار یہ اعلان کیا کہ یہ تحریک کسی اخلاص اور نیک نیتی کی بنیاد پر نہیں اٹھائی گئی، بلکہ احرار کا مقصد اپنی شکست کا انتقام لینا اور ملک کو نقصان پہنچانا ہے۔ جیسا کہ منیر انکوائری رپورٹ میں بار بار یہی راگ الاپا گیا ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہانی دہراتے ہیں کہ تحریک ۵۳ء غلط تھی، اس کے علمبردار احرار تھے۔ جنہیں تحریک پاکستان کے مقابلے میں ”شکست فاش“ ہوئی تھی۔ اور وہ چھ سال تک منقار زیر پر رہنے کے بعد تحریک کا علم اٹھائے نمودار ہوئے تھے اور پھر اس تحریک سے ملک کو عظیم تر نقصانات پہنچے۔ تو اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے بدیہی طور پر ذہن یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے جو میں نے اخذ کیا۔ تاہم جب ڈاکٹر صاحب خود تشریح فرما رہے ہیں کہ ان کا یہ مطلب تھا۔ یہ نہیں تھا تو ان کا بیان کردہ مفہوم ان کے الفاظ سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو ہمیں اپنے قصور فہم کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم ان کی عبارت کے اس پوشیدہ مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہے (اور اب تک قاصر ہیں) ڈاکٹر صاحب اپنی عبارت کا جو مطلب بیان فرما رہے ہیں تسلیم کرنا چاہئے کہ وہی ٹھیک ہو گا۔

اسی طرح احرار کے علاوہ کانگریسی علما کے دلی آمادگی کے ساتھ اور دوسروں کے مجبوراً حالات کے دباؤ کے تحت تحریک میں شامل ہونے کا جو مفہوم ڈاکٹر صاحب بیان فرما رہے ہیں اسی کو صحیح تصور کرنا چاہئے گو ”دلی آمادگی“ کے مقابلے میں ”مجبوری“ اور ”حالات کے دباؤ“ کے الفاظ اس کی تائید کرنے سے معذور ہیں، اس موقع پر کانگریسی اور غیر کانگریسی کا مقابلہ بھی بے محل ہے، اور پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ سمجھنا کہ فلاں تو ”دلی آمادگی“ سے شروع ہوا، اور فلاں کو حالات کے دباؤ کے تحت مجبوراً شریک ہونا پڑا یہ بھی محض ان کا اندازہ و تخمینہ ہے، جس کی کوئی صحیح دلیل وہ قائم

دینی تحریک کی قیادت کا منصب اور ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى۔ اما بعد

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ماہنامہ میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء میں ”قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات“ اور ان کے بارے میں علما کرام کے خدشات کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جو موصوف نے ۲۹ رمضان ۱۴۰۴ھ کے آخری جمعہ میں کی تھی۔ نیز اسی شمارہ میں ان کی ایک تقریر ”جہاد بالقرآن“ کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے، رسالہ کے مدیر جناب جمیل الرحمن نے اہل علم سے اپیل کی ہے کہ :

”جن کی خدمت میں میثاق پہنچتا ہے یا جن کی نظر سے گزرتا

ہے وہ ان دونوں خطابات کے متعلق اپنی تنقید، تبصرے، مشورے

اور آراء سے ہمیں اور ڈاکٹر صاحب کو مستفید ہونے کا موقع مرحمت

فرمائیں۔“

ڈاکٹر صاحب کا خطاب اہل علم سے ہے۔ امید ہے اکابر اہل علم انہیں اپنی آرا سے مستفید فرمائیں گے۔ یہ ناکارہ اہل علم کی صف میں شمار کے لائق نہیں، مگر اس خیال سے چند امور عرض کرتا ہوں کہ :

گاہ باشد کہ کودک ناواں
بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اگر کوئی صحیح اور مفید بات قلم سے نکل جائے تو ڈاکٹر صاحب اس پر غور فرمائیں گے ورنہ ”کالائے بد بریش خاوند“۔

جناب ڈاکٹر صاحب ”رجوع الی القرآن“ اور ”جہاد بالقرآن“ کے داعی ہیں، انہوں نے ”تنظیم اسلامی“ کے نام سے اپنے مداحوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے اور انہوں نے ”تنظیم اسلامی“ میں شامل ہونے والوں سے بیعت لینے کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ موصوف کو شکایت ہے کہ علما کرام نہ صرف یہ کہ ان کے مبارک سلسلہ سے تعاون نہیں کر رہے بلکہ ان کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی ہے، وہ فرماتے ہیں :

”مجھے یہ کام کرتے ہوئے تقریباً بیس سال ہونے کو آئے ہیں، اور میں نے اس کا آغاز اسی آپ کے شہر لاہور سے کیا تھا، میں بھگت اللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں، میں نے تو بہر حال اپنی زندگی اسی کام کیلئے وقف کر رکھی ہے، تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے کام اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے آگے بڑھنا شروع ہوا تو ویسے ویسے چند علما کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا۔ یہ دعوت کیا ہے؟ کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا؟ میں حیران ہوتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ پھر یہ مخالفت صرف ایسے علما کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو بلکہ ثقہ علما وہ جن کا میرے اپنے دل میں بھی بڑا احترام ہے جن کے ساتھ میرا حسن عقیدت کا معاملہ ہے، میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب کچھ الرجب ہیں، قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے

ہیں، انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن قرآن قرآن کا جو لفظ لیا جا رہا ہے تو کہیں یہ انکار سنت والی بات نہ ہو جائے، کہیں حدیث کا انکار تو کرنے نہیں چلے۔“

(میشاق ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۲۷)

طویل غور و فکر کے بعد علما اور ثقہ علما کی الرجی کا سبب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو گیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

”لیکن مجھے پچھلے سال کے دوران اس معے کا حل مل گیا اور علما کرام کے طرز عمل اور رویہ کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ ہمارے علما کی طرف سے، بالخصوص ان کی طرف سے، جن کا ہمارے قدیم حلقوں سے تعلق ہے، جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے، اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے، وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی قریب و بعید میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ چکڑ الویت اٹھی قرآن کے نام پر، اسی طریقہ سے پروینیت اٹھی قرآن کے نام پر، اور تو اور قادیانیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتدا قرآن کی عظمت کے بیان سے کی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک اور طریق کار کو میں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ان سب سے پہلے بہت سی گمراہیوں کا سرسید احمد خان نے آغاز کیا قرآن کے نام پر۔ تو معلوم ہوا کہ پے بہ پے اتنے چرکے

لگے ہیں اور علما کو ایسے غلط تجربات (یہاں ”غلط تجربات“ کا لفظ غیر موزوں ہے۔ غالباً ڈاکٹر صاحب کی مراد ”تلخ تجربات“ سے ہے۔ ناقل) ہوئے ہیں کہ جیسے ہمارے یہاں ایک کھات ہے کہ ”دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے“ یا ایک دوسری کھات ہے کہ ”جو سانپ سے ڈسا ہو وہ رسی سے بھی ڈرتا ہے“۔ یہی انداز اب ہو گیا ہے اور ایک عقدہ لائیکل بن گیا ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کا یہ مزاج ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں ان کو فوراً ایک خطرہ، ایک اندیشہ، ایک سوء ظن لاحق ہو جاتا ہے۔ اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے، سابقہ ”غلط تجربات“ کی بنیاد پر ان کا اس قدر الرجک ہو جانا بڑی حد تک قابل فہم ہے۔“

(ص ۲۹)

قرآن کریم کے نام پر اٹھنے والی تحریکات سے حضرات علما کرام کے توحش کا جو سبب ڈاکٹر صاحب نے بیس بائیس برس کے غور و فکر کے بعد دریافت کیا ہے۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کو ”اصل سبب“ قرار دے کر خاصی سطحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان تحریکات سے علما کرام کے بدکنے کا اصل سبب یہ نہیں کہ چونکہ علما کرام کو پے بہ پے تلخ تجربات (یا ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں غلط تجربات) ہوتے رہے ہیں اس لئے وہ فطرتاً ہی ایسی تحریک سے جو قرآن کے نام پر اٹھے، فوراً بدک جاتے ہیں اور وہ کچھ اندیشے اور خطرے محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ان تحریکات کے قائد و بانی، علم و عمل اور صلاح و تقویٰ

کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے، جو کسی دینی تحریک کے قائد و بانی کے لئے ناگزیر ہے۔

قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کا منصب ہو یا کسی دینی تحریک کی قیادت کا منصب، یہ ایک بار امانت ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا :

یا ابا ذر! انک ضعیف، وانها امانة، وانها
یوم القيامة خزی وندامة الا من اخذها بحقها
وادى الذی علیہ فیہا۔

(صحیح مسلم۔ ص ۱۲۱ ج ۲)

ترجمہ: ”اے ابو ذر! تم کم زور ہو، اور یہ امانت ہے، اور یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا موجب ہے الا یہ کہ کوئی اس کو حق کے ساتھ لے، اور اس سلسلہ میں جو حقوق اس پر لازم ہیں ان کو ادا کرے۔“

کسی دینی تحریک کی قیادت درحقیقت نیابت نبوت ہے، اور نیابت نبوت کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو وراثت نبوت کا حامل ہو، اور وراثت نبوت کے اصول تین ہیں۔ علم صحیح، عمل صحیح اور تزکیہ باطن۔ جن کی طرف آیت کریمہ وعلمهم الكتاب والحكمة ویزکیهم میں اشارہ فرمایا ہے۔ پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو، جس کا عملی معیار مستند نہ ہو، جس نے اہل قلوب اور ارباب باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی تصحیح نہ کی ہو، اس کے بارے میں کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے گا، اور وہ کسی افراط و تفریط خود رائی و کج

روی کا شکار نہیں ہوگا۔ دینی قیادت تو بہت دور کی بات ہے دنیا کا وہ کون سا کام ہے جس کے لئے بقدر ضرورت لیاقت و مہارت کی شرط کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اور جب کوئی انٹرویو اس کام میں ہاتھ ڈالے تو اہل عقل و خرد اس سے اندیشہ و خطرہ محسوس نہیں کرتے؟ ایک گاڑی کا ڈرائیور، جس نے ڈرائیونگ نہ سیکھی ہو جب مسافروں سے بھری گاڑی کو لے کر چلے تو کیا اہل عقل اس سے خطرہ محسوس نہیں کریں گے۔ اور کیا ٹریفک کے سپاہی اس سے لائسنس کا مطالبہ نہیں کریں گے؟ اور کیا ڈاکٹر صاحب نے اہل عقل کے اس اندیشے اور ٹریفک کانٹریل کے اس مطالبہ پر کبھی تعجب کا اظہار کیا؟ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا، جس نے کسی مرد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا، جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا، جس نے کتاب و سنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا، جس نے اپنے علم و عمل، عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوۂ نبویؐ میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی، اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے، وہ دینی قیادت کا منصب سنبھالتا ہے، اور دین کی گاڑی کا ڈرائیور بن کر نکلتا ہے۔ اور حضرات علما کرام، جن کو حق تعالیٰ شانہ نے دین کا صحیح فہم عطا فرمایا ہے، اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب سرپا حیرت بن کر پوچھتے ہیں کہ یہ آخر ایسی کون سی بات ہے جس پر علما کرام، خواجہ و دور دراز کے اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس غریب نے آخر کیا جرم کیا ہے جس پر علما کرام پریشان ہیں، ”رجوع الی القرآن“ کی دعوت کا بیڑا ہی تو اٹھایا ہے اور ”تنظیم اسلامی“ کی قیادت اور ”جہاد پر بیعت“ لینا ہی تو شروع کیا ہے۔

گویا قرآن کریم کی دعوت و ترجمانی اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک تنظیم کی قیادت کا منصب ایک بہت ہی سرسری اور معمولی بات ہے جس پر اہل علم کو

کسی اندیشے اور خطرے کا احساس نہیں کرنا چاہئے۔ فیما لغربة الاسلام، وضیعة المسلمین۔۔۔ انا لله وانا اليه راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کو آنحضرت ﷺ کی وہ حدیث یاد ہوگی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کب ہوگی؟ فرمایا، جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔ عرض کیا گیا، امانت کیسے ضائع کر دی جائے گی، فرمایا :

اذا وسد الامر الى غير اهله فانتظر

الساعة

(صحیح بخاری ص ۱۳ ج ۱)

ترجمہ: ”جب معاملہ نا اہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔“

اور یہ بھی کہ :

لا يقص الامير او مامور او مختال۔

وفی رواية او مرأء

(مشکوٰۃ ص ۳۵)

ترجمہ: ”وعظ کہنا تین آدمیوں کا کام ہے۔ امیر کا، مامور کا، یا متکبر کا۔“

اور ایک روایت میں ہے کہ یا ریاکار کا۔“

الغرض ڈاکٹر صاحب نے علما کی تشویش کا جو سبب دریافت کیا ہے، وہ حقیقی سبب نہیں۔ بلکہ اصل سبب وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی ہو یا غلام احمد پرویز۔ ان سب کی خود رائی و خود روی کا اصل سبب بھی یہی تھا کہ انہوں نے دینی طب کی ڈگری حاصل کئے بغیر امت کی مسیحائی کا کام شروع کر دیا، اس ”عطائیت“ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کی خواہشات جہاں تک لے جاسکیں وہ وہاں پہنچ

گیا۔ کوئی الحاد و زندقہ کی وادیوں میں بھٹکنے لگا، اور کوئی اس حد کے عبور کرنے میں کسی حد تک محتاط رہا۔

یہ ہے وہ مسلسل تجربہ، جو علمائے امت کو خوارج و روافض کے دور سے آج تک ہوتا رہا، اور جسے تنظیم اسلامی کے امیر محترم ایک بار پھر دہرا رہے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اپنی حالت پر غور کرتے کہ وہ دینی قیادت کے بلند ترین منصب کے اہل بھی ہیں یا نہیں، الٹا علمائے کرام سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ ان کی قرآنی دعوت اور ان کے حلقہ بیعت سے تعاون کیوں نہیں کرتے، جب کہ ٹیلی ویژن پر ان کے ”اہدیٰ“ کا غلغلہ بلند ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں پڑھے لکھے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کو سعادت سمجھ رہے ہیں، اور وہ پاکستان سے امریکہ تک قرآن کی دعوت کو پھیلانے اور مسلمانوں کو جہاد کے لئے منظم کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

کاش! ان سے گزارش کی جاسکتی کہ قبولیت عند اللہ کے بازار میں اس شرت و قبولیت کی قیمت پھوٹی کوڑی کے برابر بھی نہیں، اور جب تک کسی صاحب نظر کی طرف سے یہ کام تفویض نہ کیا جائے اس سے دھوکہ کھانا کسی طرح بھی روا نہیں :

بصاحب نظرے بنما گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

یا مولانا معین الدین اجمیری کی طرح کوئی ان سے جرات کے ساتھ کہہ سکتا کہ :

ایاز قدر خویش شناس!

مگر ڈاکٹر صاحب مطمئن ہیں کہ اس آزادی کے زمانے میں ان کو امامت و قیادت سے کون روک سکتا ہے، اور چند سر پھرے ان کے بارے میں کچھ لکھیں گے

بھی تو ان کے ارادت مندوں کا حلقہ سلامت رہے، یہ لوگ ان کا کیا بگاڑ لیں گے، ان کو تو ”علمائے سو“ ”کٹھ ملا“ یا کم از کم ”جنگ نظر“ کے چھوٹے سے بم سے اڑا دیا جائے گا، رہا آخرت کا معاملہ! سو وہ جب آئے گا دیکھا جائے گا :

ستعلم لیلی ای دین تدانیت
وای غریم یوم التقاضی غریمها

ڈاکٹر صاحب تو اپنی فتوحات پر نازاں ہیں اور اسے تائید و نصرت الہی کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں، لیکن یہ ناکارہ، ان کی اس بلند پروازی اور ان کے اس جراتمندانہ اقدام سے واقعتاً کانپ رہا ہے، خدا ہی خیر کرے جو جتنا اونچا اڑتا ہے۔ جب گرتا ہے تو اتنا ہی نیچا گرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کی قرآن کانفرنسوں میں مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا شمس الحق افغانی، مولانا محمد گوندلوی، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا عبید اللہ انور، مولانا تقی عثمانی، مولانا عبد الرحمن جامعہ اشرفیہ، مولانا سید ابو بکر غزنوی، پروفیسر سلیم چشتی، مولانا طاسین اور ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمن جیسے اکابر تشریف لاتے رہے ہیں۔

(ص ۵۸)

ان حضرات کی ”قرآن کانفرنس“ میں شرکت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کو قرآن فہمی میں درجہ استناد حاصل ہو چکا ہے اور اب وہ قرآن کی دعوت پر تنظیم اسلامی قائم کر کے لوگوں کو اپنے حلقہ بیعت میں داخل کرنے کے بھی مجاز ہو چکے ہیں۔ دوسرے کے بارے میں نہیں تو کم از کم اپنے شیخ و مربی حضرت اقدس مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہ کے بارے میں تو یہ ناکارہ عرض کر سکتا ہے کہ وہ ڈاکٹر

صاحب کی خود رائی اور قلت علم کے شاکے تھے اور انہیں قرآن کریم کی تشریح و تفسیر اور دینی قیادت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ”ماہنامہ بینات“ کا آخری شمارہ جو حضرت کی زندگی میں شائع ہوا، اس کے ”بصائر و عبر“ میں ڈاکٹر صاحب کی تفسیر دانی پر تنقید کرتے ہوئے حضرت لکھتے ہیں :

”افسوس کہ آج کل ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ سب سے آسان کام یہی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کا بیڑہ اٹھائیں پھر چاہے اسلام کا بیڑہ بھی غرق ہو جائے، میں سب کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتا لیکن طرز عمل پر تنقید کرتا ہوں، یہ مانا کہ کہیں کہیں عمدہ بات اور بہتر توجیہ بھی کر لیتے ہیں لیکن کہیں اپنی رائے کی حریت اور علم کی کمی (کی وجہ) سے ایسی باتیں لکھتے ہیں کہ ان کی تمام محنتوں پر پانی پھر جاتا ہے، اور بسا اوقات وہ غلطی گمراہ کن اور خطرناک ہوتی ہے اور قطعی عقیدہ کے خلاف ہوتی ہے۔ بطور مثال اس وقت ایک نمونہ پیش کرتا ہوں ہمارے ایک محترم نے سورۃ العصر کی تفسیر و تشریح میں حسب ذیل حقائق کا اظہار فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے :

”(الف) سورہ والعصر میں نجات کی کم از کم چار شرائط بیان ہوئی ہیں اور ان سے کم پر نجات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجہ میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے۔

(ب) ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق، تواصی بالصبر چاروں شرطیں لازمی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہر کلمہ گو کی نجات لازمی ہے۔ گویا نجات کے لئے صرف ایمان اور اس کا بھی محض زبانی اقرار کافی ہے الخ۔ (دیکھو انسان کا اصلی سرمایہ "از ڈاکٹر اسرار احمد خاں مطبوعہ ادارہ اشاعت علوم ملتان)

افسوس کہ اس وقت تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں صرف اجمال و اختصار سے چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ متواترہ اور اہل سنت والجماعت کی تصریحات ہیں کہ اصلی نجات یعنی کفر سے نجات جس کا نتیجہ خلود نار اور دوا می جہنم ہے صرف ایمان پر ہے جو کلمہ شہادت میں ذکر ہے بشرطیکہ دل و جان سے یہ عقیدہ ہو صرف زبانی اعتراف نہ ہو۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ یعنی "بلاشبہ حق تعالیٰ شرک و کفر کو نہیں بخشتا اور اس کے علاوہ جسے چاہے بخش دے"۔ عمل صالح کو جزا ایمان ایسا ماننا کہ اس کے نہ ہونے سے نجات نہ ہو اور انسان کافر بن جائے یہ مذہب خوارج کا ہے اور قریب اس کے معتزلہ کا مذہب ہے، بہر حال اس قسم کا نظریہ دور حاضر میں جناب مودودی صاحب نے اپنی کتابوں میں بہت زور و شور سے پیش کیا، شاید ہمارے محترم چونکہ ان کے رفیق کار تھے ان سے لیا ہو گا اور مودودی صاحب سے پہلے غالباً مولانا فراہی صاحب مرحوم بھی اس قسم کی باتیں لکھ چکے ہیں، بہر حال کسی نے کہا ہو، سراسر غلط ہے، قرآن کریم کے نصوص قطعہ کے خلاف

ہے، اور اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ پھر سورہ والعصر میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے اس کو تیسرے درجہ کی کامیابی سمجھنا سراسر غلط ہے، وہ تو اعلیٰ ترین کامیابی ہے جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں ہو سکتا ”عملوا الصالحات“ کی فرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو۔ اس وقت تفصیل کا موقع نہیں ورنہ صاف صاف ان غلطیوں کی نشاندہی کرتے جہاں ہمارے محترم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ دراصل باکمال اصحاب کی صحبت کے بغیر علم دین اور قرآن کریم کا فہم میسر نہیں آ سکتا۔ اسی وجہ سے مودودی صاحب بھی ان خطرناک غلطیوں میں مبتلا ہو گئے کہ تعجب ہوتا ہے۔“

(ماہنامہ بینات، رمضان و شوال ۱۳۹۷ھ - ص ۶ و ۷)

حضرت بنوری قدس سرہ کی یہ تحریر آج سے سات برس پہلے کی ہے، جب ڈاکٹر صاحب نے تنظیم اسلامی کی بیعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا، ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو حضرت کی اس رائے سے استفادہ کرتے ہوئے اسے سرمہ چشم عبرت بنا سکتے تھے اور اس ناکارہ نے آج سے اٹھارہ بیس برس پہلے ڈاکٹر صاحب کی کتاب ”تحریک جماعت اسلامی ایک مطالعہ“ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی بات مولانا مودودی صاحب اور ان کی تحریک اسلامی کے بارے میں کہی تھی، مناسب ہو گا کہ اس کا ضروری اقتباس یہاں نقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب پر جماعت اسلامی کے دو مقصد تجویز کرتے ہوئے کہا تھا کہ دور اول میں جماعت کے یہ یہ خصائص تھے اور دوسرے دور میں یہ خصائص ایک ایک کر کے مٹتے چلے گئے۔ اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے موصوف نے لکھا تھا کہ ”میں اگر ایک لفظ میں اس کی اصل وجہ کو بیان کرنا چاہوں تو

وہ ایک لفظ ”عجلت پسندی“ ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس ناکارہ نے لکھا تھا :

” ہماری رائے میں (جو اگر غلط ہو تو حق تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں) مصنف نے جماعت کی ”بنائے فساد“ کی تشخیص صحیح فرمائی ہے، یعنی ”عجلت پسندانہ بے اصولی“۔ لیکن ہمارے خیال میں جماعت اسلامی کی عجلت پسندی ذرا وسیع مفہوم بھی رکھتی ہے، اور اس کی تاریخ بھی کچھ طویل ہے، اس کے لئے ہمیں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی تازہ ترین تالیف ”خلافت و ملوکیت“ سے راہنمائی ملتی ہے، مولانا موصوف عمال عثمانی کے بارے میں فرماتے ہیں :

”دوسرے یہ کہ اسلامی تحریک کی سربراہی کے لئے یہ لوگ موزوں بھی نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ وہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر نبی ﷺ کی صحبت و تربیت سے ان کو اتنا فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں ملا تھا، کہ ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی پوری قلب مابیت ہو جاتی، وہ بہترین منتظم اور اعلیٰ درجہ کے فاتح ہو سکتے تھے، اور فی الواقع وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے، لیکن اسلام محض ملک گیری اور ملک داری کے لئے تو نہیں آیا تھا وہ تو اولاً بالذات ایک دعوت خیر و صلاح تھا جس کی سربراہی کے لئے انتظامی اور جنگی قابلیتوں سے بڑھ کر ذہنی اور اخلاقی تربیت کی ضرورت تھی اور اس کے اعتبار سے یہ لوگ صحابہ و تابعین کی اگلی صفوں میں نہیں، بلکہ پچھلی صفوں میں آتے تھے۔“

مولانا موصوف کا بیان لروہ یہ معیار عمل عثمانی پر منطبق ہے یا نہیں؟ یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن خود مولانا کی ”دعوت خیر وصلاح“ جس نے جماعت اسلامی کی دعوت کی شکل اختیار کی، اس معیار کی بہترین مثال ہے۔

فیاض ازل نے مولانا مودودی کو بے پناہ استعدادوں، بلا کی ذہانت، طبیعت کی جولانی اور قلم کی روانی جیسی گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے، لیکن بقول سعدی ”استعداد بے تربیت دریغ“ ان صلاحیتوں کی صحیح تربیت کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے وہ سب کی سب نہ صرف یہ کہ ضائع ہوئیں، بلکہ غیر تربیت یافتہ صلاحیتوں کے ”بے دھڑک استعمال“ سے اولاً اسلام کو، ثانیاً جماعت اسلامی کو اور آخر میں خود مولانا مودودی کو بہت سی مضرتیں ہوئیں۔ عمل عثمانی کے بارے میں مولانا کو یہ شکایت ہے، کہ نبی کریم ﷺ کی تھوڑی بہت ”صحبت و تربیت“ ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی قلب ماہیت نہ کر سکی تھی، اور یہاں یہ قصہ ہے کہ مولانا کو کسی ”نائب رسول“ کی صحبت و تربیت سے فائدہ اٹھانے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملا، ”ذہنی قلب ماہیت“ ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔ مولانا کی دعوت خیر وصلاح (یا بہ لفظ دیگر دعوت جماعت اسلامی) کسی نائب نبی ﷺ کی صحبت میں تربیت یافتہ ذہن سے نہیں ابھری، بلکہ وہ تمام تر مولانا کے ذاتی اور ”خودرو مطالعہ“ کی پیداوار ہے، انہوں نے اسلام اور دیگر نظریہ ہائے حیات کا وسیع مطالعہ کیا، اور اسی ”ذاتی مطالعہ“ سے انہوں نے اسلامی کلیات و جزئیات کا ایک ذہنی

خاکہ مرتب کر لیا، جسے وہ بتدریج صفحہ قرطاس پر بھی لاتے رہے اور لارہے ہیں) اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے تجدیدی تحریکات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا، اور ان تحریکات میں جہاں جہاں کوئی خامی نظر آتی گئی، اسے اپنے خود رو مطالعہ کی روشنی میں نوٹ کرتے گئے، اس مطالعہ سے اقامت دین کا نقشہ مرتب ہو کر ان کے سامنے آیا اور اسے انہوں نے ایک دعوت کے طور پر پیش کیا، یہ ”جماعت اسلامی“ کی ”دینی دعوت“ تھی۔

الغرض ”عجلت پسندی“ کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ مولانا نے اپنے افکار و نظریات اور دعوت خیر و صلاح کی بنیاد کسی ایسے ذہن اور سیرت و کردار پر نہیں رکھی کہ کسی باقاعدہ صحبت و تربیت سے جس کی قلب ماہیت ہو گئی ہو، بلکہ اپنے ذاتی اور خود رائے مطالعہ پر رکھی، اور کوئی نہیں جانتا کہ خود رو مطالعہ ضروری نہیں کہ کسی صحیح نتیجہ پر آدمی کو پہنچا دے، بلکہ خود رو مطالعہ سے آدمی مرزا غلام احمد بھی بن سکتا ہے، اور عبد اللہ چکڑالوی بھی، اسلم حیراج پوری بھی بن سکتا ہے، اور عنایت اللہ مشرقی بھی، اور ڈاکٹر فضل الرحمن بھی بن سکتا ہے اور غلام احمد پرویز بھی۔ اس لئے ہمیں اس پر قطعاً تعجب نہیں کہ مولانا کی تحریک میں غلطیوں کیوں پیدا ہوتی گئیں، بلکہ حیرت اور تعجب اس پر ہے کہ اتنی کم غلطیوں ہی کیوں پیدا ہوئیں، اور وہ اپنے خود رو مطالعہ کے نتیجے میں، اہل حق سے نسبتاً قریب کیسے رہ گئے، دوسرے لوگ نہ معلوم اس کی کیا توجیہ

کریں، لیکن مجھے تو یہ مولانا کی نیک نیتی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔

اور عجلت پسندانہ بے اصولی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا، جب کہ مولانا نے اپنے نظریات و افکار کے گرد ”انا اعلم“ کا حصار کھینچ لیا، ان کی کسی غلطی پر جب کبھی تنبیہ کی جاتی تو انہوں نے اس کی پرواہ کئے بغیر کہ یہ تنبیہ کتنے بڑے فاضل، فقیہ، اور خدا ترس کی جانب سے کی گئی ہے، اسے ”لائق توجہ نہیں“ کہہ کر دل و دماغ کے تمام راستے بند کر لئے، ورنہ جب وہ غیر تربیت یافتہ ذہن کے باوصف اسلامی تحریک کی سربراہی کر رہے تھے، اگر اس دوران بھی وہ اہل صلاح و تقویٰ، اور اصحاب علم و فضل کی ہدایت پر کان دھرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جماعت بالاخر اس سطح پر آجاتی جس کی شکایت بڑے درد مند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے۔“

(ر بینات ربيع الاول ۱۴۰۵ھ)

ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریک اور اندیشے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى!)

گزشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا کہ نئے فرقوں یا جماعتوں کے بانیوں کے بارے میں اہل علم کو جو اندیشے اور خطرے محسوس ہوئے (اور جو بعد میں حقیقت واقعہ بن کر سامنے آئے) ان کا اصل منشا یہ تھا کہ اس عظیم الشان منصب کی صلاحیت و اہلیت حاصل کئے بغیر انہوں نے مسندِ قیادت پر جلوہ افروز ہونے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ضروری نہیں کہ یہ سب قائدین و مصلحین شروع ہی سے دل کے کھوٹے ہوں، نہیں! بلکہ ان میں سے بعض کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ امت کے واقعی خیر خواہ تھے، ان کی زیوں حالی سے فکر مند تھے، وہ خلوص دل سے چاہتے تھے کہ امت کو قعرِ مذلت سے نکال کر اوجِ ثریا پر پہنچائیں۔ مگر چونکہ یہ بزرگوار علمِ راسخ سے تہی دامن اور اصلاح و تربیت کے فیضان سے محروم تھے اس لئے منصبِ قیادت کے بارگراں کو زیادہ دیر تک نہ اٹھاسکے، بلکہ سفرِ قیادت شروع کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ بالآخر پڑی سے اتر گئے۔ اور چونکہ ”بے مرشد“ و ”بے استاد“ بھی تھے اور بزمِ خود مجتہد بھی (یا ہمارے ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں نیم مقلد)

اس لئے شتر بے مہار کی طرح جس طرح کو منہ اٹھا چل نکلے، نہ ان کا کوئی مرشد ور ہنما تھا اور نہ وہ کسی کی تقلید کے قائل تھے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خدا خیر کرے ٹھیک انہی کے نقش قدم پر آج کل ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب اسرار احمد صاحب بھی اس امت کے دینی انحطاط اور اس کی زیوں حالی پر کچھ زیادہ ہی فکر مند نظر آتے ہیں۔ مدت کے غور و فکر کے بعد موصوف نے امت کی خستہ حالی کا علاج ”جہاد بالقرآن“ تجویز فرمایا ہے اور اس جہاد کے لئے انہوں نے ”تنظیم اسلامی“ تشکیل دے کر ”سفر قیادت“ کا آغاز کر دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چشم بد دور انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح ”سلسلہ بیعت“ بھی جاری فرمادیا ہے (یہ تشبیہ نفس بیعت میں ہے گو نوعیت کا اختلاف ہو) (جسے سلسلہ عالیہ احمدیہ کے مقابلے میں ”سلسلہ عالیہ اسرار یہ“ کہنا موزوں ہوگا) مگر ”منصب امامت“ کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں موصوف ان سے عہدہ بر آہیں اس لئے ان کے پیش رو قائدین و مصلحین کی طرح ان کے قدم بھی بار قیادت سے لڑکھڑانے لگے ہیں اور وہی اندیشہ سامنے آنے لگا ہے کہ کہیں وہ بھی گزشتہ قائدین اور مصلحین کی طرح پٹری سے نہ اتر جائیں۔ ولا فعل اللہ ذلک۔

جو خطرہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ یوں تو ڈاکٹر صاحب بار بار یہ کہتے ہیں کہ وہ ان پڑھ اور امی امتی ہیں (ان کی اس تعبیر پر گفتگو انشاء اللہ آگے آئے گی) لیکن اپنی تمام تر امتیت اور ان پڑھی کے باوصف انہوں نے پیچیدہ قسم کے دقیق نظری مسائل پر ”اظہار خیال“ شروع کر دیا ہے جو گویا ڈاکٹر موصوف کی ”اصطلاحات“ کی ابتدا اور بسم اللہ ہے۔

ان میں سے ایک ”اجتہاد و تقلید“ کا مسئلہ ہے، موصوف نے ”جہاد بالقرآن“ کے لئے جو میدان یا محاذ تجویز کئے ہیں ان میں ایک فرقہ واریت کا محاذ ہے، وہ فرماتے ہیں:

”چوتھے محاذ کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ہمارے سامنے فرقہ واریت کا محاذ ہے، اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لئے ہمیں کوئی ایسی بنیاد، کوئی ایسی جڑ، کوئی ایسا مرکز درکار ہے جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے، پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے، یہی مفہوم جبل اللہ کا ہے، میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ جبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔“

(بیثاق ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۲۳)

اس فرقہ واریت سے ان کی مراد ائمہ مجتہدین کا فقہی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے فقہی مذاہب یا مسالک ہیں۔ موصوف اس فرقہ واریت کو امت کے لئے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اس کے خلاف ”جہاد بالقرآن“ کا محاذ کھولتے ہیں، اور اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے کے لئے ”ایک معتدل راستہ“ نکالتے ہیں۔ جو ”اجتہاد“ اور ”تقلید“ کے بیچ میں سے ہو کر گزرتا ہے، اور جو موصوف کی خاص اصطلاح میں ”نیم مقلدیت“ کا راستہ ہے۔ اس راستہ کو اپنانے کے لئے موصوف دو چیزوں کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ ائمہ اربعہؒ کے ساتھ امام بخاریؒ کے فقہی مسلک کو بھی ایک مستقل مذہب کی حیثیت میں تسلیم کر لیا جائے۔ دوم یہ کہ ان مذاہب خمسہ کے دائرے میں گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہئے۔ ”یہ نہیں

کہ بس ایک ہی کے ہو رہیں۔“ موصوف کا یہ ”معتدل راستہ“ بھی مسئلہ فرقہ واریت کا عارضی و عبوری حل ہے۔ ان کی دعا ہے کہ مستقبل میں اجتہاد مطلق کی حامل کوئی عظیم شخصیت کھڑی ہو اور وہ ان مذاہب خمسہ کا عطر نکال کر ایک ہی فقہی مذہب بنا ڈالے اور ساری دنیا کو اس پر جمع کر دے۔ یہ گویا فرقہ واریت کے مسئلہ کا صحیح اور حقیقی حل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں :

”شاہ کاشمیری“ کے خیالات کے پیش نظر ایک معتدل راستہ نکالنا ہوگا، خاص طور پر ان حضرات کو جو علمی میدان میں خدمت دین اور خدمت قرآن میں لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے اس کے لئے ایک نئی اصطلاح وضع کی ہے میں اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کر رہا ہوں۔ چونکہ بات سمجھانے کے لئے نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑتی ہیں۔ اصلاً یہ اصطلاح میں نے اپنے فقہی موقف کے لئے وضع کی ہے۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ میں مقلد ہوں پانچ کا صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہ ہیں اور پانچویں امام بخاریؒ جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں ”اصح الکتاب بعد کتاب اللہ“ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لئے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر دے جس کے تقویٰ، جس کے تدین، جس کی فہم دین، جس کی اصابت رائے، جس کے خلوص و اخلاص پر امت کے بڑے حصہ کا بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور و فکر کے بعد یوری للہیت اور خدا ترسی کے ساتھ امت کو ایک

فقہی مسلک پر مجتمع کر دے تو کر دے اور کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہاد مطلق کر دے تو کر دے۔ اس دور میں میرے نزدیک ہم جیسے ٹھٹھ بھہمیے اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنہ کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ رہیں اس دائرے کے اندر لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے وہ اپنے مسلک کے مطابق عمل بھی کریں اور روز مرہ کے مسائل میں اپنے ہی مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقا کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں، میں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میں محض مقلد نہیں ہوں، میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں۔ ان پانچوں دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنہ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں اسکی رائے کو ترجیح دیتا ہوں۔۔۔۔۔ میرے مزاج، میری افتاد طبع اور میری احتیاط کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ آپ کے اس شہر لاہور ہی کی نہیں بلکہ عالم اسلام کی مشہور علمی درس گاہ اور دارالعلوم کی ایک جید شخصیت، عالم دین، شیخ الحدیث کی خدمت میں آج سے قریباً ڈھائی سال قبل میں نے حاضر ہو کر اپنی تمام کتابیں ان کے قدموں میں ڈال دیں اور ان سے عرض کیا کہ اگر ان میں سے آپ

کسی بات کی نشاندہی فرمادیں جو ائمہ اربعہؒ اور امام بخاری رحمہم اللہ کے دائرے سے باہر کی ہیں تو میں ان کتابوں سے حذف کر دوں گا۔۔۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف حنفیت میں منحصر ہے تو میرا راستہ اور ہے اور آپ کا اور۔۔۔ انہوں نے کہا ہم ایسی بات کیسے کر سکتے ہیں، جب کہ ہم ان سب کو اہل سنت کے ائمہ تسلیم کرتے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ میں ان شاء اللہ ان تمام باتوں سے رجوع کر لوں گا جو امت مسلمہ کے ان پانچ ائمہ عظام کے دائرے سے باہر کی ہوں گی۔

(میشاق ستمبر ۱۹۸۳ء ص ۵۰-۵۱)

ڈاکٹر صاحب کے پیش رو مصلحین و قائدین کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ وہ جب بھی امت کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی اچھی سی ”نئی تجویز“ پیش کرتے ہیں ”ملا“ (اپنی کور ذہنی کی وجہ سے) فوراً اس کی مخالفت کرتا ہے، اور تنقید کے تیروں سے اسے چھلنی کر دیتا ہے، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس اچھی سی نئی تجویز کو یہی سانحہ پیش آیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے اس نظریہ پر ماہنامہ ”الخیر ملتان“ (نومبر ۱۹۸۳ء) میں مولانا عبد القیوم حقانی (دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک) اور مولانا محمد ازہر مدیر الخیر نے شدید تنقید کی۔ اس تنقید کا پورا متن ”الخیر“ کے محولہ شمارے میں دیکھ لیا جائے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا نظریہ ”اجماع امت“ کی نفی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے میثاق (دسمبر ۱۹۸۳ء) میں ایک طویل وضاحتی نوٹ رقم فرمایا ہے جس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں :

۱۔۔۔۔۔ ”میری تقریر کے یہ جملے، جن پر تنقید کی گئی، ان کا

مطلب وہ نہیں تھا جو سمجھا گیا، اور اس مغالطہ کی کچھ وجہ خود راقم (یعنی ڈاکٹر صاحب) کی کج رجحانی اور کچھ اس تقریر کے مرتب کی تقصیر ہے۔“ (میشاق دسمبر ۱۹۸۴ء ص ۲۴)

۲۔ ” تقلید واجتہاد کے مسئلہ میں) میں اپنا موقف اپنے ہی الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں :

” ان تمام مسائل کے ضمن میں، جو ائمہ مجتہدین (اعنی ائمہ اربعہ) کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور ان پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کر کے اپنے فیصلے ثبت فرمادیئے ہیں ان میں سے (الف) جن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو ان کے ضمن میں تو اجتہاد مطلق تو کجا، نفس اجتہاد کے باقی رہنے کا بھی قائل نہیں البتہ (ب) جن میں ان کے مابین اختلاف رائے ہو ان کے ضمن میں ” اجتہاد“ کو اس میں دائر سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کر لیا جائے، لیکن ان کے دائرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

جنس اجتہاد یا نفس اجتہاد کے بقا اور تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے نتیجے میں بالکل نئی صورت معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں۔“

(ص ۲۷)

۳۔ ” مذاہب اربعہ کے ساتھ امام بخاری کے مسلک کے اضافہ کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یہ بتائی ہے کہ :

(ص ۲۹)

(ص ۳۰)

۵۔۔۔۔۔ مستقبل میں کسی مجتہد مطلق کے کھڑا ہونے کی دعا کا جو ذکر ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں آیا تھا وہ بات ایک خاص تناظر میں کہی گئی تھی، اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں :

(ص ۲۶)

۶ — فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے سے موصوف کی مراد یہ ہے کہ :

”مختلف فقہی مسالک کے ماننے والے ان پر عمل پیرا ہوتے

ہوئے اپنے سینوں اور دلوں میں وسعت پیدا کریں اور ایسا نہ ہو کہ

”قولنا صواب لکن متحمل الخطا وقول غیرنا خط

محمتمل الصواب“ صرف کہنے اور لکھنے میں آئے اور عملی

صورت یہ ہو کہ فقہی اختلافات کی بنا پر ہمارے دلوں میں بُعد پیدا

ہو جائے اور ہم مل جل کر شانہ بشانہ منکرات، فواحش کے خلاف

جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی سعی، اور غلبہ اقامت دین کی

جدوجہد میں شریک نہ ہو سکیں۔“

(ص ۲۸)

اس ناکارہ نے ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کے اہم نکات قریب قریب انہی کے

الفاظ میں درج کر دیئے ہیں جو حضرات ان کی پوری تحریر دیکھنا چاہیں وہ ”میشاق“ کا

دسمبر ۱۹۸۴ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں۔ امید ہے کہ موصوف کی یہ توضیحات ان کے

ناقدین کے لئے بڑی حد تک اطمینان و تسلی کا موجب ہوں گی۔ تاہم اس ضمن میں

چند گزارشات ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کرنا مناسب ہو گا :

مذہبِ خمسہ کا دائرہ کھینچ کر ڈاکٹر صاحب نے علما کرام سے اس دائرے کے اندر

گھومنے پھرنے کی اجازت طلب فرمائی ہے ہمارے خیال میں انہیں اس اجازت طلبی کی

مطلق ضرورت نہیں تھی، کیونکہ اول تو یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ مسلکنا اہل

حدیث ہیں، اور اس فقہی مسلک کو اختیار کرنے کے لئے کسی سے اجازت طلب کرنا

خارج از بحث ہے۔ ثانیاً وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کے فیض یافتہ ہیں، اور

ان کے ذوق و مشرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جب کہ اس سلسلہ میں مولانا مرحوم کا

فتویٰ حسب ذیل ہے :

”کیا ایک فقہی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا گناہ ہے؟“

”سوال : ہمارے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہو گئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم و فضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حقدار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر مٹاوی میں ایک بڑے صاحب کمال فقیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟“

”المنتقل من مذهب الی مذهب باجتهاد ویرھان آثم يستوجب التعزیر۔“

جواب : میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا، رہا مٹاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو میں اس کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہش نفس کی بنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بنا پر۔“

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال سنہ ۱۴۱۳ھ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

رسائل و مسائل، حصہ اول ص ۱۶۰، ۱۶۱، مطبوعہ لاہور، طبع دوم سنہ ۱۹۹۳ء)

مولانا سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے یہ فتویٰ غریب طحاوی کا نہیں، بلکہ علامہ طحاوی نے اہل علم کا فتویٰ نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بار بار مذہب تبدیل کرتا پھرے وہ مستحق تعزیر ہے کیونکہ اس کا یہ فعل خواہش نفس اور تلعب بالدرین کے ذیل میں آتا ہے، خواہ وہ اجتہاد و برہان کا دعویٰ کرے۔

مثلاً----- جدید تعلیم کے اثرات کی وجہ سے ہمارے آج کل کے ”محققین“ میں ”اجتہاد“ کی وبا عام ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر (الاماشاء اللہ) اجتہاد کی حقیقت و ماہیت، اس کے لوازم و شرائط، اس کے موارد و مواقع اور اس کی ضرورت و غایت سے بھی واقف نہیں، لیکن ان میں سے ہر شخص اجتہاد کے مرض میں مبتلا ہے اور چشم بد دور اپنے تئیں ابو حنیفہ و شافعیؒ سے کچھ اونچا ہی سمجھتا ہے، کم نہیں، خود ڈاکٹر صاحب کے استاذ جناب مولانا امین احسن اصلاحی کی زندہ مثال موجود ہے، جو بے چارے اجتہاد کے اسی ”وبائی بخار“ میں نہ صرف یہ کہ خود مبتلا ہیں۔ بلکہ انہوں نے ایسے بلند پایہ مجتہدین کا ایک حلقہ بھی پیدا کر لیا ہے جو حضرات ائمہ مجتہدین کو سادہ لوح اور صحابہ کرامؓ کو (جن کے جنتی ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے بشارت دی) غنڈے اور بد معاش کہنے سے بھی نہیں شرماتے (اصلاحی صاحب نے ”تدبیر قرآن“ سورہ نور میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے اور ان کے شاگردوں نے مجلہ ”الاعلام“ میں)۔

اجتہاد کی ایسی وبائے عام کے دور میں ڈاکٹر صاحب کا صرف مذاہب خمسہ کے اندر گھومنے پھرنے کی اجازت طلب کرنا نرا تکلف نہیں تو اور کیا ہے؟ علمائے کرام نے ان ”وبائی مجتہدین“ ہی کا کیا بگاڑ لیا تھا جو ڈاکٹر صاحب کے ہلکے پھلکے اجتہاد کا (یا موصوف کی اصطلاح میں ”نیم مقلدی مسلک“ کا کیا بگاڑ لیں گے)۔

۱۔ — دقیق علمی مباحث پر اظہار خیال میں بڑی احتیاط اور ہمہ پہلو نظر کی ضرورت ہے اس کے لئے جہاں بیان کرنے والے کے لئے بڑی گہری بصیرت اور راسخ علم درکار ہے وہاں سامعین میں ان مباحث کو سمجھنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ ایسے مسائل پر ڈاکٹر صاحب ایسے شخص کا (جو اپنے آپ کو ان یڑھ اور ”امی امتی“ لکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں) عوام کے مجمع میں ”اظہار خیال“ کرنا بڑی ہی عجیب سی بات ہے، شاید یہ بھی اسی وبائی مرض کا اثر ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ورنہ بے چارے عوام کے سامنے جن کی ذہنی سطح معلوم ہے ڈاکٹر صاحب اجتہاد کے موضوع پر خطاب کرنے اور نئی اصطلاحات وضع کر کے لوگوں کو پریشان کرنے سے ضرور گریز کرتے پھر نہ اہل علم کو ان کے ”خطاب“ پر اشکالات پیدا ہوتے، اور نہ انہیں طویل وضاحتی نوٹ لکھنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ بہر حال اس ناکارہ کا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ ایسے دقیق نظری مسائل جو ان کی بساط علم سے باہر ہیں ان پر اگر اظہار خیال نہ فرمایا جائے اور اس سنگلاخ زمین کو انہی لوگوں کے لئے چھوڑ دیا جائے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب کے حق میں بہتر ہوگی۔ اور اگر وہ ان نظری مباحث میں الجھ کر رہ گئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دامن کو تار تار ہونے سے نہیں بچاسکیں گے۔ ان کے پیشرو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو بھی علمائے کرام نے یہی مشورہ دیا تھا جو افسوس کہ ان کی بارگاہ میں شرف پذیرائی حاصل نہ کر سکا، اس کا نتیجہ جو نکلا وہ ڈاکٹر صاحب کو بھی معلوم ہے۔

۳۔ — ڈاکٹر صاحب نے ”فرقہ واریت“ کے خلاف جو ”جہاد بالقرآن“ کا اعلان فرمایا ہے وہ ان کی اس توضیح کے باوصف بھی (جو فقرہ نمبر ۶ میں نقل کر چکا ہوں) دانش مندی و تدبیر کے خلاف ہے، کیونکہ اہل سنت کا یہ مسلکی اختلاف کبھی تعاون علی البر

والتقویٰ کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اس کو ”فرقہ واریت“ سے تعبیر کرنا اور اس کے خلاف ”جہاد بالقرآن“ کا طبل بجانا ان تمام اکابر کی اہانت کے مترادف ہے، جو مختلف مسالک حقہ سے وابستہ ہیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ ہر طبقہ میں غیر معتدل مزاج کے لوگ بھی ہوا کرتے ہیں جو ان فقہی و مسلکی اختلافات کو جنگ و جدال کا اکھاڑہ بنا لیتے ہیں، ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب انہی کے خلاف ”جہاد بالقرآن“ کرنے چلے ہوں لیکن ایسے لوگوں کا علاج طبل جنگ نہیں، بلکہ حکمت و دانائی کے ساتھ انہیں دعوتی مقصد کی طرف متوجہ کر دینا ہے۔۔۔ میں یہاں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو مثال کے طور پر پیش کروں گا، جو حق تعالیٰ شانہ کے لطف و احسان سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور جس میں اہل سنت کے تمام مسالک حقہ ایک خاندان کی طرح جڑے ہوئے ہیں، اس تحریک کے اکابر کی طرف سے کبھی فرقہ واریت کے خلاف جہاد کا اعلان نہیں ہوا، بلکہ صرف دعوت الی اللہ پیش کی جاتی ہے، ایمان و یقین کو دلوں میں اتارا جاتا ہے، علم و ذکر کی تلقین کی جاتی ہے، اعمال کے فضائل بتائے جاتے ہیں، مسلمانوں کا اکرام سکھایا جاتا ہے، راہ خداوندی میں محض رضائے الہی کے لئے جان و مال لگانے کی ترغیب دی جاتی ہے، ایثار و قربانی کے عملی نمونے پیش کئے جاتے ہیں، اس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، اکابر تبلیغ کی طرف سے یہ بھی ہدایت ہے کہ تبلیغی حلقوں میں صرف فضائل بیان کئے جائیں مسائل بیان نہ کئے جائیں، بلکہ جس شخص کو جس عالم پر اعتماد ہو اس سے انفرادی طور پر مسائل دریافت کرے۔

دور جدید کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ خوبصورت نعروں کی گردان تو خوب کی جاتی ہے، مثلاً ہر شخص اٹھتے بیٹھتے یہ نعرہ لگاتا ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہو کر ”بنیان

مرصوص“ بن جانا چاہئے۔ یہ نعرہ بجائے خود بڑا دلش ہے لیکن اتحاد کے نعرے جس زور و شور سے لگائے جاتے ہیں اسی رفتار سے انتشار بڑھتا جا رہا ہے ڈاکٹر صاحب کا یہ اعلان بھی کہ فرقہ واریت کے خلاف جہاد بالقرآن کیا جائے، اسی نوعیت کا ایک خوش کن نعرہ ہے اس سے فرقہ واریت کو تو کوئی آنچ نہیں پہنچے گی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی ”تنظیم اسلامی“ کے رفقا کا یہ ذہن ضرور بن جائے گا کہ ائمہ کے فقہی اختلافات ”فرقہ واریت“ ہیں۔ ہمیں ان اختلافات سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تنظیم اسلامی خود ایک فرقہ بن جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب چلے تو فرقہ واریت کے خلاف جہاد بالقرآن کرنے، لیکن بالآخر خود ایک فرقہ بنا کر چلتے بنیں گے۔ اور صرف یہ اندیشہ ہی نہیں بلکہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے جس قدر گمراہ فرقے اس وقت موجود ہیں تم انہیں علما کے اختلافات اور فرقہ واریت کے خلاف وعظ کہتے سنو گے، ان کے اسی ذہن نے انکو نئے فرقے میں تبدیل کر دیا ہے۔ قادیانیت پروینیت اور جماعت المسلمین سے لے کر ڈاکٹر عثمانی کی ”حزب اللہ“ تک کا یہی نعرہ اور یہی تکنیک ہے۔

ڈاکٹر صاحب بھی لاشعوری طور پر ٹھیک انہی کے نقش قدم پر فرقہ واریت کے خلاف جہاد کرنے جا رہے ہیں۔

_____ ڈاکٹر صاحب نے فقرہ نمبر ۲ کی شق (ب) میں جو فرمایا ہے :

”جن مسائل میں ان (ائمہ اربعہ) کے مابین اختلاف رائے

ہو ان کے ضمن میں ”اجتہاد“ کو اس میں دائر سمجھتا ہوں کہ ان میں

سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کر لیا جائے لیکن ان

کے دائرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔“

(ص ۳۰)

ڈاکٹر صاحب کی اس بات کو اصولی طور پر تسلیم کر لینے کے باوجود یہاں دو

سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے ایک یہ کہ آیا یہ حق ہر شخص کو حاصل ہے کہ اپنے ”اجتہاد“ کے ذریعے مذاہب اربعہ میں سے جس کے موقف کو جب چاہے ترجیح دے لیا کرے یا اس کے لئے خاص اجتہادی صلاحیت بھی درکار ہے؟ اور اگر ایسی کوئی صلاحیت شرط ہے تو اسکا معیار کیا ہے؟ دوم یہ کہ یہ اجتہاد خاص ناگزیر حالات و ضرورت کے تحت ہو گا یا ایسی کوئی پابندی نہیں؟ افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی پوری تحریر میں ان دونوں سوالوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔۔۔ اور اس سلسلہ میں خود اپنے ”اجتہاد“ کی جو دو مثالیں ذکر فرمائی ہیں ان سے عجیب و غریب کیفیت سامنے آتی ہے ان میں سے ایک تو ”فاتحہ خلف الامام“ کا مسئلہ ہے اور دوسرا مزارعت کا، جو غالباً مولانا محمد طاسین صاحب کے مقالہ سے تاثر کا نتیجہ ہے۔۔۔ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں تو ڈاکٹر صاحب کا امام بخاریؒ کے مسلک کو اختیار کرنا قابل فہم ہے کیونکہ کسی ایسے شخص کے لئے، جو اہل حدیث مکتب فکر سے منسلک ہو، امام بخاریؒ کے قول کی ترجیح ایک فطری سی بات ہے اس لئے میں ان کے اس اختیار و ترجیح پر گفتگو کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ مزارعت کے مسئلہ میں امام بخاریؒ کا قول ترک کرنے پر اپنے دل و دماغ کے ہاتھوں کیوں مجبور ہو گئے؟ حالانکہ دلائل کے اعتبار سے بھی یہ مذہب قوی ہے یہی جمہور صحابہؓ و تابعینؓ کا قول بھی ہے، اور یہی فقہ حنفی کا ”مفتی بہ“ مسئلہ بھی ہے۔۔۔ اور پھر ضرورت بھی اسی کی مقتضی ہے۔۔۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طرح ہر شخص کو مذاہب خمسہ کے دائرے میں گھومنے پھرنے کی اجازت دیدی جائے تو وہ کس طرح چن چن کر شاذ یا کم از کم مرجوح اقوال کو ترجیح دینے لگے گا، اور ڈاکٹر صاحب کی طرح دلیل صرف یہ پیش کر دیا کرے گا کہ ”میں اپنے دل و دماغ کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔“

علمائے حقانی نے مذاہب اربعہ میں سے کسی قول کو اختیار کرنے کا دروازہ کبھی بند نہیں کیا (جس کو دوبارہ کھلوانے کی ڈاکٹر صاحب سفارش کرتے ہیں) البتہ اس کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ شرط عائد کی ہے کہ اس راستہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے۔ کسی ناگزیر ضرورت کی بنا پر ایسا کیا جائے، محض تشہی (یعنی ”میں دل و دماغ کے ہاتھوں مجبور ہوں“) اس کا نشانہ ہو، پھر اس راستہ میں انفرادی قدم اٹھانے سے پرہیز کیا جائے، اہل علم و فہم کے مشورے سے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ پھر بسبب مذہب کو اختیار کیا جائے اس کے تمام شروط کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ”آدھا تیترا آدھا بیڑ“ قسم کا اجتہاد کر کے یہ فرض کر لیا جائے کہ اس مسئلہ میں ہم نے فلاں امام کا قول لے لیا ہے۔ ماضی قریب میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے رسالہ ”الحیلۃ الناجزہ“ میں حنفی مسلک کو چھوڑ کر مالکی مسلک اختیار کیا گیا جس میں مندرجہ بالا تمام شرائط کو احتیاط سے ملحوظ رکھا گیا، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور حضرت بنوریؒ کے زمانہ میں اسی مقصد کے لئے مجلس مشاورت قائم کی گئی تھی، اور اس نے بعض اہم فیصلے بھی کئے۔۔۔۔۔ الغرض ڈاکٹر صاحب نے مذاہب اربعہ کے دائرے میں رہ کر ”اجتہاد“ کرنے کا جو اصول بیان فرمایا ہے وہ عند الضرورت اپنی جگہ صحیح ہے اور علمائے حقانی کا معمول یہ بھی۔۔۔۔۔ لیکن بحث اس میں ہے کہ ایسے ”اجتہاد“ کا اہل کون ہے؟ اور یہ کہ اس کی اجازت کن حالات میں ہے؟ ورنہ اس ”اجتہاد“ کو بھی اگر بے لگام چھوڑ دیا جائے تو اس کی سرحدیں اباحت کے ساتھ جاملتی ہیں۔

۴۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ :

”جنس اجتہاد نفس اجتہاد کے بقا و تسلسل کا معاملہ میرے

نزدیک ان مسائل میں سے ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے

نتیجے میں بالکل نئی صورت معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔“

(ص ۲۷)

ظاہر ہے کہ جب ایک بالکل نئی صورت سامنے آئے گی تو اہل علم کے لئے اس پر غور کر کے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ قرآن و سنت اور اشباہ و نظائر کی روشنی میں اس کا حکم کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے حوالے سے دین کے قطعی مسائل میں کتر پیونت بھی ہمارے دور حاضرہ کے ”مجتہدین“ کا روزمرہ کا معمول بن چکی ہے، وہ ہر جگہ یہ موٹا سا اصول جاری کر لیتے ہیں کہ فلاں صورت حال زمانہ نبویؐ اور فقہاء کے زمانے میں نہیں تھی۔ بالکل ”نئی صورت حال“ ہے۔ اس لئے اس پر قرآن و سنت کے نصوص کا اطلاق نہیں ہو سکتا ہے اور نہ فقہاء کے اجتہادی فیصلے اس پر لاگو ہوتے ہیں۔ اس میں ہمیں بالکل نیا اجتہاد کرنا چاہئے۔ اس کی مثال عورت کی دیت و قصاص کا مسئلہ ہے جس پر ہمارے محققین نے حال میں ہی ”اجتہاد“ کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ جب اندرون ملک کی اجتہادی سرگرمیاں کافی نہ ہوئیں تو باہر سے جناب معروف دوالیبی اور شیخ مصطفیٰ الزرقا کو تشریف آوری کی زحمت دی گئی، ان ”عرب شیوخ“ نے جو کچھ فرمایا اس کا مغز اور خلاصہ یہی تھا کہ کسی زمانے میں خاندان کا معاشی بوجھ صرف مرد کے کندھوں پر تھا، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، عورت اپنا معاشی کردار ادا کرنے لگی ہے، اور معاشی بوجھ اٹھانے میں مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہے لہذا اب عورت کی دیت بھی مرد کے برابر ہونی چاہئے۔ فیا سبحان اللہ۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان شیوخ کی تقریر میں جو نئے حالات کے تحت نئے ”اجتہاد“ کا وعظ فرمانے کے لئے ہمارے یہاں تشریف لائے تھے، کیا کیا سقم ہے میں یہاں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نئے حالات کے نئے مسائل سے نمٹنا

بلاشبہ اہل علم کا فریضہ ہے (اس کو خواہ ڈاکٹر صاحب کی اصطلاح میں نفس اجتہاد کا تسلسل کہہ لیا جائے) لیکن عمرانی ارتقا کے حوالے سے دین کے قطعیات میں قطع و برید شروع کروینا اور ہر مدعی اجتہاد کو کھلی چھٹی دے دینا کہ وہ نئے حالات میں جیسے چاہے نئے فتوے صادر کرتا پھرے، کسی طرح بھی قرین عقل و قیاس نہیں، بہر حال ڈاکٹر صاحب کا نفس اجتہاد کے بقا کا نظریہ اپنی جگہ صحیح ہونے کے باوجود بڑی احتیاط کا مقتضی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے زیر بحث خطاب میں متعدد گوشے ابھی باقی ہیں جن پر تنبیہ کی ضرورت ہے، لیکن مضمون اندازے سے زیادہ طویل ہو گیا۔ اس لئے باقی نکات پر کبھی فرصت ہوئی تو پھر عرض کروں گا البتہ ایک بات کا اوپر وعدہ کر چکا ہوں اس لئے مختصراً اس کا عرض کروینا ضروری سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطاب میں بھی، اور اپنے وضاحتی نوٹ میں بھی اپنے لئے ”امی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امی امتی“ کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے چنانچہ وضاحتی نوٹ میں اپنے رفیق شیخ جمیل الرحمن کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

”اس سب کے باوصف یہ اندازہ تو جملہ قارئین ”میشاق“ کو ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ بھی بالکل میری طرح، امی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے امی امتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میری طرح ان کی تحریروں میں بھی بعض فاش غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ ادھر میرے ”ان پڑھ“ ہونے کا یہ عالم ہے کہ -----“

(میشاق دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب مقدس ----- امی ----- مدح کے لئے ہے۔ اور آپ ﷺ کی امت آپ ﷺ کی نبوت کی ایک مستقل دلیل

ہے۔ لیکن کسی امتی کے حق میں تو یہ لفظ بطور مدح استعمال نہیں ہوتا (اللہ کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کو علم لدنی سے سرفراز فرمایا گیا ہو) اب اگر ”امی نبی“ کا امی امتی“ میں امی کا لفظ مدح کے لئے ہے تو ڈاکٹر صاحب پر اس لفظ کا اطلاق کیسے ہوتا ہے؟ اور اگر یہ ”کسر نفسی“ کے لئے ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ ملانے کی کیا تک ہے۔۔۔۔۔ علاوہ ازیں امی تو اس شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو، اس اعتبار سے بھی اس کا اطلاق ڈاکٹر صاحب پر محض تک بندی ہے الغرض اگر ڈاکٹر صاحب ”امی نبی“ کا جاہل یا بے علم امتی“ لکھتے تو صحیح تھا، مگر ”امی نبی“ کا امی امتی“ لکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سوء ادب کا پہلو رکھتا ہے۔

بظاہر یہ ایک لفظی سا مناقشہ ہے، لیکن ایک تو معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا ہے، اس لئے اس پر تنبیہ کرنا ضروری ہوا۔ دوسرے میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب (اپنی تمام خوبیوں کے باوصف) چونکہ علم راسخ نہیں رکھتے۔ اس لئے معمولی علمی تعبیرات میں بھی ان سے کیسی کیسی لغزشیں ہوتی ہیں، جن میں ان کو تنبیہ بھی نہیں ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے، ڈاکٹر صاحب کی شان کے خلاف کوئی بات نکل گئی ہو تو اس پر پیشگی معذرت کا طالب ہوں، واللہ العظیم۔

میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان سے عرض کیا جائے کہ آپ ایک نئی جماعت بنا کر اور بیعت کی نئی طرح ڈال کر امت کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں، یہ امت نئی نئی اصطلاحات اور دین کے نام پر وجود میں آنے والی نئی نئی تنظیموں کے چرکوں سے پہلے ہی چور چور ہے، خدا را اس پر رحم کیا جائے اس کو کسی نئی تنظیم، نئی بیعت اور نئی اصطلاحات کی آزمائش سے معاف

رکھا جائے بہر حال ان کے علمی ضعف کے پیش نظر میں ڈاکٹر صاحب کو وہی مشورہ
دوں گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا :

یا ابا ذر! انی اراک ضعیفا، وانی احب
لک ما احب لنفسی، لا تا مرن علی اثنین ولا
تولین مال یتیم۔

(رواہ مسلم (مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

ترجمہ: ”ابو ذر! میں تمہیں کمزور دیکھتا ہوں اور میں تمہارے لئے
وہی پسند کرتا ہوں، جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔ کبھی دو آدمیوں کا
بھی امیر نہ بننا اور کبھی یتیم کے مال کا متولی نہ بننا۔“

اقول قولی هذا۔ واستغفر اللہ العظیم۔ وما
ابری نفسی۔ ان النفس لا مارة بالسوء الا ما
رحم ربی۔ ان ربی غفور رحیم۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه

صفوة البرية سيدنا ومولانا محمد

وآله وصحبه واتباعه اجمعين الى يوم الدين۔

(بینات ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ)

مولانا محمد حنیف ندوی اساسیات اسلام کے آئینہ میں

”مولانا محمد حنیف ندوی ایک بلند پایہ مفکر و ادیب اور مصنف کی حیثیت سے علمی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ اہل حدیث مسلک سے تعلق ہے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع ہے، امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن خلدون اور اشعری کے افکار کی تشریح و توضیح میں ان کی فکری کاوشیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی نئی کتاب: ”اساسیات اسلام“ کے نام سے (جو کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، کی مطبوعہ ہے) ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

چونکہ کتاب کے نام سے کتاب کے موضوع کی وضاحت نہیں ہوتی اس لیے سرورق پر کتاب کا موضوع ان الفاظ میں مختص کیا گیا ہے: ”اسلام کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے فکری اور تمدنی مسائل کا تجزیہ اور حل“۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف موصوف مغرب اور مغربی افکار سے مرعوب ہیں بلکہ انہیں اسلام اور علماء اسلام سے شکایت ہے کہ وہ دور حاضر کی جاہلیت

جدیدہ کو سند جواز کیوں نہیں دیتے؟ ذیل میں ہم کتاب کے
مندرجات کی روشنی میں مصنف کی سوچ و فکر اور افطار
و خیالات کا جائزہ لیں گے۔

مغرب کے صنعتی انقلاب نے جس جاہلیت جدیدہ کو جنم دیا اس نے نہ
صرف بے شمار مسائل، ان گنت ناہمواریوں، لاتعداد تضادات اور بے حد الجھنوں
کے تحائف سے جدید انسان کو نوازا بلکہ اسے انسانی قدروں اور روحانی رشتوں
سے اس حد تک محروم کر دیا کہ وہ اچھا خاصا حیوان آکل بن کر رہ گیا، بیضہ مور کی
طرح اس کی تگ و تاز کا میدان اس فضائے نیلگوں تک محدود ہے، وہ مادیت کے
ایک ایک شعبہ حیات کے لئے مستقل سائنس رکھتا ہے، کیڑے مکوڑے اور
درختوں کے پتے تک اس کی سائٹیفک ریسرچ کا موضوع بنے ہوئے اس کی
سائنسی تحقیقات سے مشرف ہو رہے ہیں، لیکن جو چیز اس کی نظر التفات سے
محروم ہے وہ خود اس کا فلسفہ موت و حیات اور قلب و نظر کی سائنس ہے، جسے
مذہب کہا جاتا ہے اور جو انسان کے سر پر ولقد کر منابنی آدم کا تاج رکھ کر
صرف اقلیم مادیات کی سیادت و قیادت ہی اسے عطا نہیں کرتا، بلکہ خدا تعالیٰ کی
معصوم اور نورانی مخلوق کو اس کے آگے سرنگوں دیکھنا چاہتا ہے : واذ قلنا
للملائكة اسجدوا لآدم۔

جدید انسان کا گوشہ چشم کبھی اپنے فلسفہ زیست (مذہب) کی طرف ملتفت
ہوا بھی تو اس نیت سے نہیں کہ وہ اس کے ذریعہ شرف انسانیت کی تکمیل کا
مواد فراہم کرے، یا اپنے داغ جگر اور افسردگی قلب کا مداوا ڈھونڈے، بلکہ اس
نقطہ نظر سے کہ : مادیت کے جدید اسلمہ سے مذہب کی روح کو کچلنے میں کامیابی
کس طرح حاصل کی جائے؟

الغرض آج کا جدید انسان، سائنسی انسان اور مشینی انسان، مذہب بیزاری کی بدولت روحانی خودکشی کرچکا ہے، وہ خود اپنے ہاتھوں جس قدر مظلوم، بے بس، محروم اور بے مقصد بن چکا ہے، تاریخ نے اپنے طویل ترین سفر میں اسے کبھی اتنا مظلوم اور لاچار نہیں دیکھا ہوگا، مولانا ندوی نے صحیح لکھا ہے:

”مادیت کے اس بڑھتے ہوئے ریلے میں دنیا کس عظیم

خطرے سے دوچار ہے، اس کو سمجھنے کے لیے یورپ اور امریکہ

کے اس لڑیچر کو پڑھنا چاہیے جس کو وہاں کے ”مستقبل آشنا“

اہل دانش نے ترتیب دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر سائنس اور

ٹیکنالوجی کے ترقی پذیر تقاضوں کے لئے کوئی نصب العین نہ

وضع کیا گیا، یا ارتقا برائے ارتقا کے اصول پر پابندیاں عائد نہ کی

گئیں اور اس چیز کے مواقع فراہم کئے جاتے رہے کہ لذت

ایجاد کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلے

گا کہ خود تہذیب انسانی کے لئے خطرات پیدا ہو جائیں گے، مثلاً

دھوئیں اور گیس سے ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی، انسانی

اختیار اور نشاط آفرینی کا دائرہ انت نئی ایجادات سے تنگ سے

تنگ تر ہوتا جائے گا.... سب سے بڑھ کر خطرہ یہ ہے کہ بالآخر یہ

انسان مشینوں کی دائمی رفاقت سے خود مشین بن کر رہ جائے گا

اور وہ اپنا روحانی اور اخلاقی تشخص کھو بیٹھے گا، جس کی وجہ سے

یہ مسجود ملائک قرار پایا تھا۔“

(ص ۱۳۲)

”ہمارے نزدیک سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا

نے جس سب سے بڑے خطرے کو جنم دیا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب نے روحانی اور اخلاقی قدروں سے محرومی اختیار کر لی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ علاوہ ان خطرات کے جن کی طرف ”مستقبل آشنا“ دانشوروں نے اشارہ کیا ہے، وہ قاہر و با اختیار انسان، جس نے اس مادی تہذیب کی تخلیق کی تھی، خود اس کے مقابلہ میں بے بس اور مجبور ہو کر رہ گیا ہے، اس کا اختیار اس سے چھن گیا ہے اور یہ قطعی اس لائق نہیں رہا کہ تہذیب کے اس اسپ تیز رفتار کو روک سکے، اس کی منہ زوریوں کا مداوا کر سکے، یا اس کے لئے راہ منزل کا تعین کر سکے۔“

(ص ۱۳۳)

جدید انسان کی اس محرومیت کے اسباب و عوامل کیا تھے؟ اس نے بقائی عقل و خرد قبائے مذہب کیوں اتار پھینکی؟ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے تمام پیانے توڑ دینے پر کیوں آمادہ ہوا؟ اور اس نے گلیم مادیت پہن کر ”مشینی حیوان“ کی حیثیت میں زندہ رہنے کو کیوں ترجیح دی؟ اس پر طویل بحثیں ہو چکی ہیں، اور ہمارے مفکرین ایک مدت سے بے چین ہیں کہ کسی طرح جدید انسان اور مذہب کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو پاٹ دیا جائے وہ ”کچھ لو اور کچھ دو“ کے اصول پر کوئی ایسا ”مصالحی فارمولا“ تلاش کرنا چاہتے ہیں جو انسان اور مذہب بیک وقت دونوں کے لئے قابل قبول ہو، اور جو دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد و معاون ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کچھ مشورے مذہب کو دیئے جائیں گے اور کچھ فرمائشیں مشینی دور کے انسان سے کی جائیں گی۔

مغرب، جو اس فتنہ سامانی کا موجد ہے، مدت ہوئی اپنے مذہب۔ عیسائیت

اور یہودیت۔ سے ایک مصالحتی فارمولا طے کرچکا ہے، اور وہ یہ کہ مذہب ہر شخص کا اختیاری و انفرادی معاملہ ہے، مذہب کو تہذیب و معاشرت کے دوائر میں داخل ہونے اور دخل دینے کی اجازت نہ ہوگی، نہ وہ قانونی، سیاسی، اقتصادی، اور انتظامی اداروں کو کنٹرول کرے گا، نہ ان کی راہنمائی کرے گا، نہ انہیں کوئی مشورہ دے گا۔ لہذا مذہب لائق قبول ہے بشرطیکہ وہ اپنے جامہ سے باہر پاؤں پھیلانے کی جسارت نہ کرے، بلکہ اس کا دائرہ عمل مذہبی رسوم تک محدود رہے اور وہ بھی صرف رضاکارانہ طور پر۔ اس مصالحت کے بعد وہاں مذہب زندہ ہے مگر اس کا کوئی اجتماعی کردار نہیں، نہ وہ مادیت کے طوفان میں افراد سازی ہی کا کام کر رہا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اس مصالحتی فارمولے پر آمادہ صلح نہیں، اس کا پہلے دن سے اعلان ہے :

”قل الحق من ربکم“ فمن شاء
فليؤمن ومن شاء فليکفر، انا اعتدنا للظالمين
ناراً احاط بهم سرادقها۔“ (۱ کلت، ۲۹)

ترجمہ: ”آپ (صاف صاف) کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی جانب سے (آچکا) ہے، اب جس کا جی چاہے ایمان و تسلیم کا راستہ اختیار کرے، اور جس کا جی چاہے کفر اور بے ایمانی کا راستہ لے، (اور خوب یاد رکھے کہ) بے شک ہم نے (ایسے) ظالموں کے لئے آگ تیار رکھی ہے جس کی قناتیں انہیں ہر چہار طرف سے محیط ہوں گی۔“

اسلام کسی کا منت کش احسان نہیں کہ وہ کاسہ احتیاج لے کر کسی تہذیب کے دروازے پر دستک دے، بلکہ وہ کمال بے نیازی سے بڑی سے بڑی ترقی یافتہ خود سر تہذیبوں کو ”اسلم تسلم“ کی دعوت دے کر بار احسان ان پر رکھتا ہے :

”یمنون علیک ان اسلموا قل لاتمنوا
علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم
للایمان۔“
(الحجرات، ۱۷)

ترجمہ : ”وہ آپؐ پر احسان دھرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا، آپؐ کہہ دیجئے کہ اپنے اسلام لانے کا احسان مجھ پر مت رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت عطا فرمائی۔“

اسلام، خود دین فطرت ہے، وہ فطرت کے معیار اور پیمانے وضع کرتا ہے، اور انسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار کا مجسم نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں پیش کر کے تمام انسانیت کو دعوت دیتا ہے کہ اپنے تہذیبی معیاروں کی پیمائش اس پیمانے سے کر کے دیکھو کہ وہ صحیح ہیں یا غلط؟ وہ پیمانہ فطرت پر پوری اترتی ہیں یا نہیں؟

”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ

حسنۃ“
(الاحزاب، ۲۱)

ترجمہ : ”بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔“

اسلام کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ اس ”پیام امن و سلامتی“ کو قبول کرے: ”لا اکراه فی الدین“۔ لیکن وہ بڑی سختی سے یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ جو شخص اس گہوارہ امن میں پناہ لینا چاہتا ہے اسے اپنی خواہشات کو چھوڑ کر آنا ہوگا، آنے نہ آنے کا اختیار ہے، لیکن جو آتا ہے اسے پورے انشراح صدر کے ساتھ آنا ہوگا۔ اور ”آدھا اندر، آدھا باہر“ کی پالیسی پر عمل کرنے کی اسے اجازت نہیں ہوگی۔ ”یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم كافة“۔

اغراض و خواہشات انسان کی فطری کمزوری ہے، عام طور سے آدمی کسی چیز کے رد و قبول میں اغراض و خواہشات کے پیمانے استعمال کرتا ہے، حد یہ ہے کہ وہ کسی دین کو قبول کرتا ہے تو اس میں بھی اپنی خواہشات کی آمیزش ضروری سمجھتا ہے، اور جب دین پر اغراض و خواہشات اور نفسانی پسند و ناپسند کا غلاف چڑھا دیا جائے تو نہ صرف اس کی چمک دمک مدہم پڑ جاتی ہے، بلکہ رفتہ رفتہ دین کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ جاتا ہے، یہودیت و نصرانیت اور دیگر مذاہب کو یہی حادثہ پیش آیا۔ اور وہ اپنی بقا کے لئے انسانوں کے رحم و کرم پر رہ گئے، اس لئے انہیں بہر حال مصالحتی سمجھوتہ کرنا پڑا، برعکس اس کے اسلام دائمی صداقت لے کر آیا تھا، اس کی حفاظت و صیانت کا غیبی انتظام کر دیا گیا، ناممکن ہے کہ آفتاب اسلام کو انسانی خواہشات کے غبار سے بے نور کر دیا جائے، اس غیبی انتظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یحمل هذا العلم من کل خلف عدولہ

ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۶)

ترجمہ: ”اس علم دین کو ہر آئندہ نسل کے ایسے دیانت دار لوگ حاصل کرتے رہیں گے جو غلو پسندوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط دعاوی اور جاہلوں کی تاویل باطل کا پردہ چاک کرتے رہیں گے۔“

اس طرح دین اسلام نہ صرف کامل و مکمل ہے، بلکہ پائیدار و پائندہ بھی، اور یہ اپنی بقا کے لئے کسی کامنوں احسان نہیں، بلکہ اس کے پاس خود کار نیبی انتظام موجود ہے، جو اس کی بقا کا خود ضامن ہے، اسی نکتہ سے ”مجددین“ اور ”متجددین“ کے درمیان جو فرق ہے واضح ہو جاتا ہے، ”مجددین“ انسانوں کی خود تراشیدہ بدعات کے داغ دھبوں سے دامن اسلام کو صاف کرتے ہیں، اس کے برعکس ”متجددین“ کاشیوہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں غلط اغراض و خواہشات کی پیوند کاری کے لئے ہمیشہ بے تاب رہتے ہیں۔

غرض اسلام اور معاشرہ کے درمیان مصالحت کا یہ تصور ہی غلط ہے جس کا تجربہ دانشوران مغرب اپنے یہاں کر چکے ہیں، اور جس کی دعوت ہمارے جدید مصلحین کی جانب سے دی جاتی ہے اور چاہا جاتا ہے کہ ”آزاد اجتہاد“ سے تراش کر اسلام کے کس بل نکالے جائیں تاکہ اسے معاشرہ پر منطبق کیا جاسکے۔ ممکن ہے ان میں کچھ حضرات مخلص بھی ہوں اور وہ کمال اخلاص و دل سوزی سے چاہتے ہوں کہ کسی طرح اسلام کو معاشرہ سے ہم آہنگ کیا جاسکے، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اسلام کی نفسیات اور اس

کے مزاج سے ناواقف ہیں، اسلام خدائے لم یزل کا آخری دین ہے، وہ اس لئے نازل نہیں کیا گیا کہ اسے حسب ضرورت توڑ موڑ کر غلط معاشروں پر چسپاں کیا جائے، وہ تو اس لئے آیا ہے کہ خود غلط معاشروں کی اصلاح کی جائے، اور انہیں اسلام کے شفاف آئینے کے سامنے کھڑا کر کے یہ دیکھا جائے کہ ان میں کس کس جگہ کیا کیا غلطیاں در آئی ہیں تاکہ ان کی نوک پلک درست کی جاسکے، ہمارے ان مصلحین کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر یہ دیکھتے ہیں کہ آج کے دانشور اسلام کے فلاں عقیدہ و نظریہ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اور اسلام کو کس شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ چھوٹے ہی اسلام کو اصلاحی مشورے دینا شروع کرتے ہیں، اور ”آزاد اجتہاد“ کے ذریعہ اس میں ترمیمی تجاویز پیش کرنے لگتے ہیں۔ ماضی قریب میں اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، سود پر مبنی ساہوکاری کا دور آیا تو سود کی حلت کی تجاویز پیش ہونے لگیں۔ تعلیم نسواں کا مسئلہ اٹھا تو اسلامی پردہ کے خلاف محاذ کھول دیا گیا، اشتراکیت کا چرچا ہوا تو اس کو اسلام میں داخل کرنے کی سفارش کرنے لگے۔ وغیرہ وغیرہ

زیر نظر کتاب ”اساسیات اسلام“ بھی بنیادی طور پر ایک مصالحتی فارمولا کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں تہذیب جدید کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اسلام کے نظریہ توحید و عبادات کو اپنا کر روحانیت سے بہرہ ور ہو، اور اسلام کو مشورہ دیا گیا ہے کہ جاہلیت جدیدہ کے ان کھوٹے سکوں کو سند جواز عطا کر دے، جن کی ظاہری چمک دمک اور دلفریبی و رعنائی پر طفلان مغرب ریختے ہوئے ہیں۔

ہمارے ”جدید مصلحین“ کا ایک طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ جب اسلام کے موضوع پر لکھتے اور بولتے ہیں تو اس بنا پر کہ ان کے سامنے یورپ کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا پورا طومار موجود ہوتا ہے، انہوں نے ایک مومن قانت کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ مغرب کی کور باطنی اور کور چشمی کی سیاہ عینک سے اسلام کا مطالعہ کیا ہوتا ہے، اس لئے انہیں اسلام کا ماضی ہمیشہ تاریک ہی تاریک نظر آتا ہے، انہیں غلط نگہی کی بنا پر، اسلاف کے کارناموں میں غلطیاں ہی غلطیاں نظر آتی ہیں، جنہیں دیکھ کر وہ عرق ندامت میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں، اور یکایک ان کا لہجہ ایک ایسی معذرت پسندانہ پستی اختیار کر لیتا ہے گویا میدان محشر قائم ہے، نفسی نفسی کا عالم ہے، مگر انہیں صرف اپنے نامہ عمل کا نہیں، بلکہ بد قسمتی سے اپنے اسلاف کی ”خطاؤں“ کا حساب گویا آج چکانا پڑ رہا ہے۔ ”اساسیات اسلام“ کے مصنف کی زبانی ”اعتراف خطا“ کا یہ دل خراش منظر ملاحظہ ہو :

”صحت فکر اور علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ تعمیر نو کے اس مرحلہ میں ہم اس حقیقت کو کھلے بندوں تسلیم کر لیں کہ عہد ماضی میں ہم سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، ہم نے غیر صحت مند تمدنی رجحانات کو نہ صرف اپنایا اور قبول کیا ہے، بلکہ ان کی پرورش بھی کی ہے، اور ایسے تصورات کو اسلامی سمجھ کر سینے سے چمٹائے بھی رکھا ہے، جن کا اسلامی روح سے، اسلام کے مزاج سے اور اسلامی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا، اس

اعتراف سے دو گونہ فائدے حاصل ہوں گے، ایک تو ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کی جوابدہی سے بچ جائیں گے، دوسرے اس تضاد سے ہم مخلصی حاصل کر لیں گے جو اسلام اور مسلمان کو مترادف سمجھ لینے سے پیدا ہو سکتا ہے۔“

(ص ۱۱۹، ۱۲۰)

وہ کون سے امور تھے جن کا اسلامی روح، اسلام کے مزاج اور اسلام کی تعلیمات سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ہمارے اسلاف نے ان کو اسلامی سمجھ کر سینے سے چمٹائے رکھنے کی غلطی کی؟ یہ داستان خود مصنف کی زبانی سنئے :

”ہمارے ہاں علم الکلام پر اس حیثیت سے کام ہوا کہ یہ یونانی فلسفہ کی ایک شاخ ہے.... تصوف، اسلام کے مقابلے میں ایک مستقل بالذات نظام کی حیثیت سے ابھرا، جس کا دعویٰ یہ تھا کہ تعلق باللہ اور عبودیت و ولایت کے رشتوں کو ریاضت و مجاہدہ سے ہر ہر شخص براہ راست استوار کر سکتا ہے، اسی طرح فقہ کے معنی ہمارے ہاں یہ تھے کہ نئے نئے پیش آئند مسائل (میں) کتاب اللہ اور سنت کو بحیثیت مجموعی فکر و نظر کے سامنے رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا کیا حل نکلتا ہے، اس کے بجائے یہ ہوا کہ فقہ ایک جداگانہ فن قرار پائی اور مسائل کے حل و کشود کے لئے ایسے اصول اور پیمانے وضع کئے گئے جو ایک طرف ان روحانی و اخلاقی اقدار

سے بیگانہ تھے جن سے اسلامی فقہ ترتیب پاتی ہے اور دوسری طرف جن کی صحت کے بارے میں قیل و قال کی کافی گنجائش تھی، اس پر مستزاد یہ کہ بغیر کسی اجتماعی اور معاشرتی ضرورت اور تقاضے کے شاخ در شاخ مسائل تراشے گئے، اس انداز اجتہاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فقہ جسے زندگی کے مسائل حل کرنا تھے، جسے فکر و کاوش کی تازہ کاریوں سے تہذیب و تمدن کے قافلے کو آگے بڑھانا تھا، اس طرح سے زندگی کی گرانباریوں میں اضافے کا سبب بنی۔“

(ص ۱۲۰، ۱۲۱)

لیجئے یہ تھیں ہمارے اسلاف کی وہ غلطیاں یعنی علم عقائد، علم تصوف و سلوک اور علم فقہ و قانون جن پر مصنف عرق انفعال میں ڈوبے جاتے ہیں اور انہیں اپنے ماضی سے دستبردار ہوئے بغیر نہیں بن پڑتی۔ اس سے قطع نظر کہ ان اکابر (متکلمین، صوفیا اور فقہائے امت) کے بارے میں ”اساسیات اسلام“ کے مصنف کا دامن فکر غلط فہمیوں کے کتنے بڑے انبار کو سمیٹے ہوئے ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب وہ اسلاف سے اس قدر ”حسن ظن“ رکھتے ہیں اور تیرہ صدیوں کی متاع عزیز پر اس قدر نادام اور منفعل ہیں تو ”تعمیر نو“ کے مرحلہ میں اسلام کی تشریح و تعبیر میں وہ عقل و خرد اور علم و دانش کے کیا گل کھلائیں گے اور ان کے اصول اور پیمانے کیا ہوں گے؟ دراصل یہ ہمارے سادہ لوح مصلحین کی مخصوص تکنیک ہے، انہیں چونکہ ”روح اسلام“ کو سامنے رکھ کر ”آزاد اجتہاد“ کی دعوت

دینا ہے، اس لئے وہ پہلے مرحلے پر ان تمام اصول و ضوابط سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں جو ”آزاد اجتہاد“ کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہوں۔ جب علم عقائد و کلام غلط اور متکلمین کے ارشادات ”یونانی فلسفہ کی شاخ“ قرار پائیں گے تو آپ کسی مسئلہ میں ان کا حوالہ نہیں دے سکیں گے۔ جب تصوف اسلام، اسلام سے جداگانہ ایک چیز تصور کیا جائے گا، تو مادیت کے طوفان میں اکابر اولیاء اللہ کا، جنہیں صوفیا کہتے ہیں، حوالہ بے کار ہوگا اور جب فقہ کا رشتہ اسلام سے کاٹ دیا گیا، تو آپ ”آزاد اجتہاد“ کے استنباط شدہ نتائج کے مقابلہ میں یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ اس مسئلہ میں اسلام کا قانون (فقہ) تو یہ کہتا ہے، مسلمانوں کے اسلاف میں کیڑے نکالنا اور ان کے زریں کارناموں کو بھیانک شکل میں پیش کرنا ابلیس مغرب کا وہ تخریبی حربہ ہے جو انگریزی میں ”اسلام کا مطالعہ“ کرنے والوں کو اسلام کے بارے میں متذبذب کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا، اور اسکے بعد انہیں ”آزاد اجتہاد“ کے ذریعہ ”اصلاح اسلام“ کی پٹی پڑھائی گئی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے : آپ کو حیرت در حیرت ہوگی جب آپ یہ دیکھیں گے کہ وہی قلم، جو اسلام کے علم عقائد، علم تصوف و سلوک اور علم فقہ و قانون پر ماتم کناں نظر آتا ہے اسی کو ہم دیکھتے ہیں کہ جاہلیت جدیدہ کے ”فن کاروں“ پر داد و تحسین کے پھول نچھاور کرنے میں وہ کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کرتا :

”ہمارے نزدیک ”فن کار“ کا درجہ ایک مصلح سے

کم نہیں، یہ بسا اوقات برش اور قلم کی ایک جنبش سے

ایسے عجیب و غریب نقوش ابھار دیتا ہے جن سے قانون

و آئین کی بے مائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، اور ایک اچھے خاصے مہذب و شائستہ معاشرہ کی وہ بھیانک غلطیاں فکر و نظر کے سامنے آ موجود ہوتی ہیں، عام حالات میں جن کو محسوس نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح ایک معنی شعلہ نوا اور مطرب جاں فزا دل میں طرب و انبساط کے بعض مرتبہ ایسے نازک گوشوں کو بیدار کرتا ہے جن کی بیداری سے زندگی کا پورا دبستان مہک اٹھتا ہے، فنکار کی نگاہ احتساب معاشرہ کے عیوب ہی کو تلاش نہیں کرتی بلکہ اس کے لئے مرہم اور مداوے کا اہتمام بھی کرتی ہے، صرف تفریح اور خوشی کے موتی ہی نہیں بکھیرتی، زندگی کی تمام نشاط آفرینیوں میں اضافہ کا موجب بھی بنتی ہے، زندگی کو ولولہ تازہ بھی عطا کرتی ہے اور تہذیب و تمدن کو ادراک و احساس کے ان لطائف سے بھی مالا مال کرتی ہے جن کے بغیر زندگی ٹھس اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، غرض فن ایک ایسی حسین طاقت ہے، اور ایک حسین قوت ہے اور اصلاح و تعمیر کا ایسا اسلوب ہے جو بہر حال کارگر ہوتا ہے۔“

یہ ہے فکر و نظر کا غلط زاویہ! جس سے اسلام کے مایہ ناز فرزند جن کی زندگی کا مشن خدا و رسولؐ کے منشا کو سمجھنا اور سمجھانا تھا، خطا وار اور مجرم نظر آتے ہیں، اور مہذب دنیا کے اوباش ”مصلح“ قرار دیئے جاتے ہیں :

”بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوا العجیبت“

”فنون لطیفہ“ اگرچہ جاہلیت قدیمہ کی یادگار ہے، مگر جدید جاہلیت نے ان بتان کسہ کو ترقی یافتہ شکل دیکر ہوا و ہوس کے نئے صنم خانوں میں لا رکھا ہے، اور آج کے روحانی و اخلاقی اقدار سے محروم انسان نے ”تفریح“ کے نام پر ان کی پرستش کے نئے اسلوب وضع کئے ہیں۔ ”اساسیات اسلام“ کے مصنف سے توقع کی جاسکتی تھی کہ مبادی فواحش کے خلاف علم جہاد بلند کریں گے، لیکن فنون لطیفہ پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے سینما، ٹیلی ویژن، تصویر سازی اور موسیقی کے جواز کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، اس سلسلہ میں ان کے ”اجتہادی استدلال“ کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں کا رواج چل نکلا ہے، لہذا سائنس اور ٹیکنالوجی کے ان نتائج کو کسی بے جان فقہی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتویٰ سے روکنا ممکن نہیں، اندریں صورت دین کے حکیمانہ انداز فکر کا داعیہ یہ ہے کہ ہم اپنے اجتہاد کو حریت پسندانہ انداز استدلال سے نکال کر افادیت و دانش کے وسیع تر سانچے میں ڈھالیں.... اور یوں سوچیں کہ اگر عہد جاہلیت کے بجائے اسلام آج نازل ہوتا تو ان مسائل کو کیونکر سلجھا پاتا.... اگر فطرت گلے مڑے فضلات غذا کو دودھ جیسی مفید اور تروتازہ غذا میں بدل دینے پر قادر ہے، اور دواساز مہلک و مضر اشیاء سے حیاتیں تیار کر دینے پر قدرت رکھتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مجتہد، اجتہاد و تخلیق کے اس عملیہ سے کام نہ لے۔“

(ص ۱۳۹ تا ص ۱۵۱ ملخصاً)

یہ خیالات پریشاں خود مولانا ندوی کے ذہن کی اچھ نہیں، بلکہ متجددین کے حلقے میں یہ ایک مدت سے گشت کر رہے ہیں، ایوبی دور میں ڈاکٹر فضل الرحمان نے ”اسلام کی تعمیر نو“ کا نعرہ لگایا تو ان کے فلسفہ تعمیر کا

تار و پود انہی افکار پریشاں سے عبارت تھا، تعجب ہے کہ مولانا ندوی ایسا سمجھا ہوا مفکر، جو افلاطون و ارسطو کے افکار کے تجزیہ و تحلیل پر قدرت رکھتا ہے، جو ہیوم اور کانٹ وغیرہ کے نظریات کی تنقید کا فریضہ انجام دیتا ہے اور جو ”اساسیات اسلام“ کی تشریح کی نازک ذمہ داری سے عمدہ برآ ہونا چاہتا ہے، وہ آخر ان بچکانہ مغالطوں کے چکر میں کیوں جا پھنسا؟ سوال یہ ہے کہ ”اساسیات“ کے ان مباحث کو سپرد قلم کرتے وقت مصنف نے موسیٰ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کا مطالعہ کیوں ضروری نہیں سمجھا؟ یا ”زمانہ سازی“ کے خمار میں وہ حکیم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو --- خام بدہن --- کوئی اہمیت دینے کے لئے کیوں تیار نہیں؟ ”ان چیزوں کا رواج چل نکلا ہے۔“ ”یہ ہمارے معاشرہ میں زبردستی گھس آئی ہیں“ اور ”اب ان کو روک دینا ممکن نہیں“ ایسے فقرے لکھنے سے پہلے انہیں، اسلام کی نفسیات پر غور کرنا چاہیے تھا، کہ اسلام مشرق و مغرب کی تہذیبوں سے ٹکرا کر تاریخ کے دھارے بدلنے کا عادی ہے؟ یا خود تاریخ کے طوفانی ریلے میں بہ جانے کا خوگر ہے؟ وہ ہر دور کی غلط روش کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہونے کی دعوت دیتا ہے؟ یا ہر غلط تہذیب کے سانچے میں ڈھل جانے کی تلقین کرتا ہے؟ اسلام کو ایسے دوں ہمت، پست حوصلہ، اور کوتاہ نظر لوگوں کی ضرورت نہیں جو جہاد زندگی میں ”تو زمانہ بساز“ کی کتاب کھول کر ناصحانہ و عظم کہنا شروع کر دیں، اسلام کو ایسے جوان ہمت، اولو العزم، بلند نظر اور بہادر سپاہیوں کی ضرورت ہے جو روحانیت کی بھرپور ضرب سے، تاریخی جبریت اور مادی جدلیت کے سومات کو مسمار کر ڈالیں، انسان کو لذت طلبی اور خواہش پرستی

کے طلسم سے نکال کر اسے اعلیٰ قدروں سے آشنا کر دیں۔

کون نہیں جانتا کہ آج کا انسان تہذیب جدید کے رنگ و بو کا مارگزیدہ ہے، نفسانی خواہشات کے طوفان نے اس کے امن و سکون کو غارت کر ڈالا ہے، اور جدید انسان ”تفریح“ کے لئے تہذیب جدید کے ان مصنوعی کھلونوں پر قناعت کناں ہے، مگر یہ آلات طرب و نشاط جو اسے وقتی اور مصنوعی لذت عطا کرتے ہیں، درحقیقت یہی اس کے امن و سکون کے غارت گر ہیں، لیکن صد حیف! کہ زمانے کے رواج کی سند لا کر مولانا ندوی اسی زہر ہلاہل کو نسخہ شفا تجویز کرتے ہیں، یعنی : ۷

میر بھی کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے بیٹے سے دوا لیتے ہیں

الغرض اسلام کے نقطہ نگاہ سے مولانا ندوی کے اس فقرے میں کوئی جان نہیں کہ : چونکہ فلاں چیز کا رواج چل نکلا ہے، اس لئے اسے اسلام کی عدالت سے جواز کی سند ملنی چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت پیش کی تو کفر و شرک اور فسق و فجور کا کتنا رواج تھا؟ مولانا ندوی ایسا فلسفی اگر اس وقت موجود ہوتا تو غالباً یہی فتویٰ دیتا کہ چونکہ ان چیزوں کو قبول عام کی سند حاصل ہے، لہذا یہ سب جائز ہیں۔ تصویر اور موسیقی کے جواز کی مولانا نے کیا خوب صورت دلیل دی ہے کہ ”اس کو بے جان فقہی بحث اور غیر موثر عدم جواز کے فتویٰ سے روکنا ممکن نہیں۔“ (ص ۱۴۹) حالانکہ دو تین صفحے پہلے رقص اور مجسمہ سازی کے جواز کو خود مولانا ہی یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ”ان کے لئے اسلامی فقہ

و تہذیب میں جواز کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔“ (ص ۱۳۶) کیا مولانا کو اس تضاد پسندی پر تنبیہ نہیں ہوا، یا یہ کہ ان کے ہاں رد و قبول کے پیمانے الگ الگ ہیں، یعنی جس چیز کو مولانا کا ذہن رد کرنا چاہے اس کے لئے اسلامی تہذیب و فقہ حرکت میں آجاتی ہے اور اس کے جواز کے سارے راستے بند کر دیتی ہے۔ اور جس شے کی طرف مولانا کی نظر استحسان ملتفت ہو جائے وہاں فقہی بحث بے جان اور عدم جواز کے فتوے غیر موثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا کے قلم سے نکلا ہوا یہ فقرہ علمی ثقاہت سے عاری ہے :

”تصویر اور نغمہ کی بحث میں بھی اس نقطہ نظر کو ملحوظ رہنا چاہئے کہ انداز اب یہ نہیں اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے حق میں یا مخالفت میں جو دلائل محدثین اور فقہاء اور صوفیاء کے درمیان استخوان نزاع بنے رہے ہیں....۔“

محدثین اور فقہاء و صوفیاء کے دلائل پر ”استخوان نزاع“ کا طعن سن کر روح ایمان لرز جاتی ہے اور وجدان کانپ کانپ اٹھتا ہے، مولانا کی منطق یہ ہے کہ مسئلہ کے حق میں دلائل کچھ ہی ہوں اور دلائل کی رو سے رائج پہلو خواہ عدم جواز ہی کا ہو ہمیں بہر حال اس کو جائز بنانا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ طرز فکر الحاد کے راستے سے گزرتے ہوئے سیدھا ”اباحیت“ کے جہنم تک جاتا ہے۔ اگر حریت پسندانہ استدلال اسی کا نام ہے تو ہٹ دھرمی کا کوئی نیا مفہوم وضع کرنا ہوگا، متوازن بحث و استدلال کا آخر یہ کیا تک ہوا کہ ”اگر فطرت گلے سڑے فضلات غذا کو دودھ جیسی مفید اور تروتازہ غذا میں بدل دینے پر قادر ہے اور دوا ساز مملک و مضر اشیاء سے حیاتیں تیار

کر سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مجتہد اجتہاد و تخلیق کے اس عملیہ سے کام نہ لے سکے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجتہد کا کام نصوص شرعیہ کے مطابق حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی نشاندہی نہیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد و تخلیق سے کام لے کر حرام چیزوں میں کچھ سائٹیفک تبدیلیاں کر کے انہیں حلال بنانے کی خدمت انجام دیا کرے، اگر یہی اجتہاد ہے، اور اسی پر ”اساسیات اسلام“ مبنی ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ حلال و حرام کا تصور محض ایک اضافی چیز ہے، ہر کفر و شرک اور ہر بدعت و معصیت کو آزاد اجتہاد کی لیبارٹری میں لے جا کر اسے پاکیزگی و طہارت کی سند عطا کی جاسکتی ہے۔ مولانا مجتہد پر تخلیق کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلامی احکام میں اجتہاد کسی غیر موجود شئی کی تخلیق کا نام نہیں، بلکہ نصوص شرعیہ کی تشریح و تطبیق کا نام ہے، اور یہ انطباق بے ہنگم نہیں بلکہ اپنے جلو میں کچھ اصول و ضوابط رکھتا ہے، لوگوں کے دلوں میں ابو حنیفہؒ و شافعیؒ یا کم از کم ابن تیمیہؒ بننے کی خواہش تو چٹکیاں لیتی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے کچھ علم و عقل کی حاجت ہے۔

”اسلام اور عورت“ کے موضوع پر مصنف کی گفتگو بڑی متین اور ان کی نگہ بلند کی غماز ہے، تاہم یہاں بھی وہ تضاد کا شکار ہیں یعنی ایک طرف وہ اسلام کے وکیل کی حیثیت سے عورتوں کو دور حاضر کی تمام ترقیات کی کھلی چھٹی دیتے ہیں اور دوسری طرف اسے عفاف و پاکیزگی اور نسوانی وقار کی بیڑیوں میں جکڑنا بھی چاہتے ہیں، نسوانی وقار کا پیمانہ جو خود قرآن نے وضع کیا ہے، مولانا کے سامنے ہے :

”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ

(الاحزاب، ۳۳)

ترجمہ: ”اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں، اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جاہلیت کے وقت میں۔“

(ترجمہ شیخ المنذر)

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ جاہلیت اولیٰ کا تبرج آج کی جاہلیت جدیدہ کے ترقی یافتہ ”تبرج“ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، پس جب کہ قرآن صنف ضعیف کے نازک آئینوں کو جاہلیت اولیٰ کے غبار سے اس لئے مصون و محفوظ رکھنا چاہتا ہے کہ اس سے نسوانی وقار مجروح ہوتا ہے تو آج کے ”تبرج“ میں جو بد قسمتی سے ”ترقی نسواں“ کا عنوان بن گیا ہے، نسوانی وقار کا مقدس جوہر، تہذیب کے قزاقوں کے ہاتھوں محفوظ رہ سکتا ہے؟ کلا! واللہ! اندرین صورت انہیں ”ترقی“ کے نعروں سے فریب دینا اور پھر اسے عفاف و پاکیزگی کا وعظ کہنا فلسفہ اجتماع ضدین ہی کہلا سکتا ہے جس کے مولانا بڑی شد و مد سے قائل ہیں، یعنی :

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

”اسلام اور سیاست“ کی بحث میں مصنف نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ آج کے دور میں احیا خلافت کا نظریہ محل نظر ہے ”خلیفہ اور بادشاہ کی اصطلاحوں میں اس دور کے سیاسی شعور کو کوئی بات سمجھانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ غلط فہمیوں کو پیدا کرنے کے مترادف ہے۔“ اور ”حکومت

الہیہ کا نعرہ محض پیرایہ بیان کی حیثیت رکھتا ہے جس کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں۔“ وہ صاف صاف جمہوری نظام مملکت کو موجودہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کا نظام مملکت قرار دیتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت، اقتدار کا سرچشمہ عوام کو مانتی ہے اور تشریع و قانون سازی کے اختیارات مجلس منتخبہ کو تفویض کرتی ہے، جب کہ یہ دونوں باتیں اسلام کے یکسر منافی ہیں، اس کے جواب میں مصنف نے بتایا ہے کہ اسلامی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ صرف انتظامی امور کی حد تک ہی عوام یا اس کے منتخب نمائندوں کے پاس ہوگا جسے وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق نافذ کریں گے اور یہ کہ تشریع اور قانون سازی میں فرق ہے۔ قانون سازی دراصل اجتہاد و استنباط تک محدود ہوگی، اور اس کے دائرے نصوص شریعت کے دائروں سے متصادم نہیں ہوں گے۔

مصنف کا یہ نکتہ نظر بے حد الجھا ہوا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اسلام کا نظریہ سیاست موجودہ دور کی ٹھیٹھ جمہوریت ہے، کس ملک کی جمہوریت کو کن راستوں پر چلنا ہے اور اسے دستور و آئین اور ضابطہ و قانون کے کون سے پیمانے وضع کرنے ہیں؟ اس کا بیشتر انحصار عوام کی خواہشات پر اور اس سے بڑھ کر قومی نمائندوں کی مجلس مقننہ اور انتظامیہ کی سلامتی فکر و نظر اور عقیدہ و عمل پر ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ عملی طور پر یہ جمہوریت غلط راہوں پر چل نکلتی ہے یا اس کے تخلیقی عناصر، اسلام کے نقطہ نظر سے انحراف کر لیتے ہیں تو انہیں کنٹرول کرنے کے لئے آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہوگی؟ یہی اصل مرکزی سوال تھا جسے مولانا ندوی تشنہ جواب چھوڑ کر آگے نکل گئے ہیں۔ جمہوریت پر دوسرا سوال وہ ہے

جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا یعنی ”اس میں سروں کو گنا جاتا ہے
تولا نہیں جاتا“۔ اور یہ کہ :

کہ از مغز دو صد خر کار یک مردے نمی آید
گریز از طرز جمہوری، غلامے پختہ کارے شو

مولانا محمد حنیف ندوی نے اس کی تاویل میں کتاب کے پورے چار
صفحات سیاہ کئے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ سوال نہ صرف نظری طور
پر جوں کا توں باقی ہے بلکہ عملی طور پر بھی جمہوریت کے جو تماشے ایک
مدت سے دکھائے جا رہے ہیں ان میں بیشتر مناظر سروں کے گننے ہی کے نظر
آتے ہیں اور یوں ”مغز دو صد خر“ کو ”کار یک مردے“ پر ترجیح دی جاتی
ہے۔

جمہوریت پر سب سے قوی اعتراض خود جمہوری اصول ہی سے یہ
ہوتا ہے کہ اس میں بڑی آسانی سے ایک محدود اقلیت پر جمہوری لیبل
چسپاں کر کے اسے اکثریت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا جاتا ہے، پھر لطف یہ
کہ ایک معینہ مدت کے لئے ”جمہور“ خود بھی بے بسی کی چکی میں پسے کے
لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اسلام کا معیاری نظام، خلافت
ہی ہے، اس پر مستشرقین نے اپنی کور چشمی کی وجہ سے اگر اعتراضات کئے
ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسلام کا نظریہ ہی بدل ڈالیں۔
”اقتصادیات اور اسلام“ کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے مصنف کا موقف یہ
ہے کہ اسلام کے پاس کوئی ڈھلا ڈھلایا اقتصادی نظام موجود نہیں، وہ صرف
ان اصولی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے جن کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل

پر غور و فکر ہو سکتا ہے، اور ہر ہر دور میں تعبیر و تشریح کی ایسی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، جو اس عصر کی روح کے عین مطابق ہو۔ اور ان کے نزدیک ”روح عصر کے عین مطابق“ چونکہ اشتراکی نظام اقتصادیات ہے، لہذا وہی اسلام کا اقتصادی نظریہ قرار پانے کا مستحق ہے۔

اشتراکیت کو اسلام کے چوکھٹے میں سجاتے ہوئے پہلا سوال تو یہ سامنے آتا ہے، کہ اشتراکیت کی بنیاد تاریخی جدلیت پر قائم ہے، اور انکار خدا، انکار وحی و رسالت، انکار آخرت اور انکار دین کے عناصر اربعہ سے اس کا خمیر اٹھایا گیا ہے، جس نظام کا نعرہ ہی دین اور دینی اقدار سے جنگ لڑنا ہو اسے مشرف بہ اسلام کیونکر بنایا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ ”ہمیں سوشلزم سے صرف اس کے معاشی نظام کی حد تک دلچسپی ہے، اس کے پورے فلسفہ سے نہیں، اس لئے کہ سوشلزم اپنے ریاضیاتی مزاج کے اعتبار سے نہ اسلامی ہے، نہ غیر اسلامی۔ یہ ایک سائنس ہے جس کا تعلق تقسیم دولت کے ایک خاص طریق سے ہے۔“ (ص ۲۴۰)

ہمارے اشتراکی مفکرین، جو اسلام اور سوشلزم کے ملاپ کو انسانیت کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے ہیں، عموماً یہی نکتہ پیش کیا کرتے ہیں جو مولانا ندوی نے کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اشتراکیت کا اقتصادی نظریہ تو اسلامی اصول کے عین مطابق ہے، اس میں کسر ہے تو صرف ایک آنچ کی۔ اور وہ یہ کہ اس نظام اقتصادیات کی بنیاد دہری مادیت اور تاریخی جدلیت پر رکھی گئی ہے، اے کاش کہ دین و مذہب پر اس کی بنیادیں استوار ہوتیں تو اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز کے دو عنوان ہوتے۔ اور اب یہ فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے کہ ایوان اشتراکیت کے نیچے سے زمین کھود

کر اس کی تہ سے مادیت کے سارے اینٹ پتھر نکال ڈالیں اور اس خلا کو روحانیت سے پر کر دیں تو اشتراکیت کا سارا زہر نکل سکتا ہے۔ مولانا ندوی کے الفاظ میں :

”اس وقت معاشرہ کو ابن عربی، ابن تیمیہ اور ابو حنیفہ ایسی بھاری بھر کم شخصیتوں کی ضرورت ہے جو مادیت کے طوق و سلاسل سے انسان کو نجات دلائیں، جو کتاب و سنت کے دبستان سجائیں اور قانون و فقہ کا ایسا سلجھا ہوا ڈھانچہ تیار کریں جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے قابل قبول ہو۔“

(ص ۲۴۲)

ابن عربی، ابن تیمیہ اور ابو حنیفہ تو خیر اب کیا آئیں گے (یوں بھی اپنے وقت میں انہوں نے جو کارنامے انجام دئے ان کے بارے میں مصنف کی جچی تلی رائے ہم اوپر نقل کر چکے ہیں) تاہم ابن تیمیہ کے جانشین کے ذہن میں قانون و فقہ کا جو ڈھانچہ ہے اس کی جھلک خود ان کی اسی کتاب میں نظر آرہی ہے، ملاحظہ ہو :

”اشتراکیت کی یہ اقتصادی روح جس کو ہم اسلامی فکر میں سمولینا چاہتے ہیں، چونکہ اجتماعی ملکیت کے نظریہ کی حامی ہے اس بنا پر نجی ملکیت کے مسئلہ پر، فقہی سطح پر اس لئے غور کر لینا ضروری ہے کہ اس میں (فقہ میں) تقسیم دولت کے قریب قریب تمام ابواب یعنی حضانت، وراثت، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ کو اس مسلمہ اصول کی روشنی میں

مرتب کیا گیا ہے کہ دولت اور اس کے ذرائع کا مالک ایک فرد یا کچھ لوگ ہیں۔“

مولانا کا مدعا یہ ہے کہ اسلامی قانون کے تمام ابواب انفرادی ملکیت کے اصول پر مبنی ہیں، جب کہ اشتراکیت کی ”اقتصادی روح“ اجتماعی ملکیت ہے، اس سے لوگوں نے یہ منطقی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ”اسلام اور اجتماعی ملکیت دو مختلف چیزیں ہیں“ لیکن مولانا کی رائے ہے کہ ”درحقیقت ایسا نہیں“ کیونکہ بقول ان کے فقہ کے مسائل و احکام کو ابدیت حاصل نہیں، وہ تو ان مجتہدانہ کوششوں سے تعبیر ہے جو ہر دور میں جاری رہیں، اس لئے فقہی احکام کے الفاظ و حروف سے زیادہ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا روح، کارفرما ہے۔ اور پھر عام حالات میں تو خیر اجتہاد کی ایک لگی بندھی شکل ہوتی ہے کہ نصوص کو دیکھو، تعامل صحابہؓ پر نظر کرو اور قواعد زبان کو مد نظر رکھو، لیکن غیر معمولی حالات میں اجتہاد کا اسلوب بدل جاتا ہے، وہاں صرف الفاظ نصوص، ترتیب مسائل، اور اصول و معانی کی باریکیوں کو نہیں دیکھیں گے بلکہ اس خاص مسئلہ میں ”اسلام کی روح“ حقیقی مصلحت اور غرض و غایت کو دیکھیں گے۔

مزید وضاحت کے لئے مولانا بتاتے ہیں دیکھو غلامی ایک برائی تھی، انسانیت کی جبین پر ایک بد نما داغ تھا، اس کا رواج صدیوں سے چلا آ رہا تھا اس کا خاتمہ اس وقت ممکن نہ تھا، اسلام نے حکمت سے کام لے کر ان کے حقوق متعین کر دیئے، صدیوں تک مسلمانوں میں یہ برائی رائج رہی، اسلام کبھی اس برائی کو جائز قرار نہیں دے سکتا تھا، ہاں اس وقت کی بین الاقوامی مجبوریوں کی بنا پر اس نے غلاموں کے احکام دیئے، تا آنکہ یہ برائی خود بخود

اسی طرح نجی ملکیت بھی مولانا کے نزدیک گو فی نفسہ برائی نہیں مگر خاص مرحلے میں برائی ہے جو پہلے سے چلی آرہی تھی اسلام نے اس کو تحفظ حقوق کی خاطر جائز رکھا اور اس کے لئے احکام و قوانین وضع کئے، اور مولانا کے خیال میں اب اشتراکی نظریہ اقتصادیات نے اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے اسلام کی روح اب یہی فتویٰ دیتی ہے کہ نجی ملکیت کا تصور ختم کر دیا جائے، بقول ان کے ”نجی ملکیت سے متعلقہ احکام کی روح استحصال کو ختم کرنا، سرمایہ کو خرچ کرنا، پھیلانا اور اس کو چند ہاتھوں میں مرککز ہونے سے روکنا ہے، اور جب یہ ”اسلامی روح“ اشتراکیت کے قالب میں منتقل ہو چکی ہے تو ان اسلامی احکام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔“ یہ ٹھیک وہی انداز فکر ہے جس کا اظہار ان سے پہلے مسٹر پرویز ان الفاظ میں کر چکے ہیں کہ یہ احکام عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں، یا ڈاکٹر فضل الرحمان یہ کہہ کر کر چکے ہیں کہ یہ احکام وقتی و ہنگامی تھے، یا زیادہ سے زیادہ ایک نظیر کی حیثیت رکھتے ہیں :

بے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کائے مادر نہ زادے

مولانا کی منطق کو کارل مارکس کے یہودی فلسفہ اشتراکیت کے پرستار ذرا آگے بڑھائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اس تاریک دور میں آیا تھا جب کہ انسانیت کارل مارکس کی مادی جدلیت کے فلسفہ سے نا آشنا تھی، اور کسی نہ کسی منظر میں ”خدا“ کا تصور ان کے یہاں رائج تھا، اسلام بین

الاقوامی مجبوریوں کی بنا پر اس برائی کو مٹانے کی پوزیشن میں نہیں تھا، اس لئے اسلام نے اس کی اصلاح کے لئے ایک صاف ستھرا عقیدہ انسانیت کو عطا کیا۔ اب جب کہ کارل مارکس کے طفیل زندگی کے صحیح فلسفہ، تاریخی جدلیت، تک انسانیت کی رسائی ہو چکی ہے اور اب جب کہ انسان کے تمام مسائل اس فلسفہ کی روشنی میں حل کئے جاسکتے ہیں تو اسلام کے تصور توحید کی روح خود بخود حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اسلامی توحید و عقائد اور نبوت و رسالت کی احتیاج باقی نہیں رہ جاتی ہے، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ توحید کا مقصد انسانی مساوات کی دعوت دینا تھا، اسلام نے اس کی بنیاد ڈال دی تھی اور کارل مارکس اور اس کے متبعین نے اسے انتہا تک پہنچادیا اور جب اسلامی توحید کی ”روح“ اشتراکیت میں آگئی اور اس نے ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی تو اس کے بعد نظریہ توحید خود بخود ایک غیر ضروری چیز قرار پایا۔ اس طرح مولانا ندوی کے عطا کردہ ”اساسیات اسلام“ سے چشم بد دور خود اسلام ہی کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ کیا مولانا ندوی اس دلیل کو آگے بڑھانے کی اجازت دیں گے؟ کتنے شرم کی بات ہے کہ غلامی اور نجی ملکیت کو ”فی نفسہ برائی“ تسلیم کر کے یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ برائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر صدیوں تک مسلمانوں میں رائج رہی، نہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے مٹا سکے، نہ خلفائے راشدین کو اس کی توفیق ہوئی، نہ بعد کے مسلمانوں کو۔ اور آج اس برائی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے مولانا ندوی کو ”اساسیات اسلام“ تصنیف کرنا پڑی۔

غلامی ایک برائی تھی؟ نجی ملکیت ایک برائی تھی؟ اور خدا اور خدا کا

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے لئے احکام پر احکام دیتے چلے گئے۔ مگر اس برائی کو ختم کرنے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، بتائیے! یہ اسلام کی اساسیات ہے یا خالص کفر کی بنیاد؟ اور ایک آدمی یہ کفریہ نظریہ سن کر اسلام پر یقین لانے کے لئے کہاں تک آمادہ ہو سکتا ہے؟ لقد جئتم شیئا ادا۔

مولانا ندوی نے اپنے فکر و نظر کی جولانیوں میں قرآن کریم کی آیات کی تعبیر و تشریح کی خدمت بھی انجام دی ہے جس کا سرا تاویل سے آگے بڑھ کر تحریف سے جا ملتا ہے، لیکن اس ضمن میں یہ احتیاط انہوں نے اکثر و بیشتر ملحوظ رکھی ہے کہ حتی الامکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات (احادیث) سے گریز ہی کیا جائے۔ اس کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں، مثلاً ایک یہ کہ انہوں نے یہ کتاب ایسے انداز و اسلوب میں لکھی ہے کہ جدید ذہنوں کو اپیل کر سکے، اور چونکہ جدید اذہان احادیث طیبہ کے نام سے چونکتے ہیں اس لئے مولانا نے ان کو توحش سے بچانا چاہا ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ احادیث نبویہ پر اعتماد کر لیا جاتا تو ”آزاد اجتہاد“ اور ”مجتہدانہ تخلیق“ کی راہ میں کچھ الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مولانا نے مناسب سمجھا کہ ان سے تعرض ہی نہ کیا جائے۔ بہر حال قرآن کو خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر سمجھنے سمجھانے کی جو کوشش کی ہے وہ ندوی صاحب کے درون باطن کو پوری طرح آشکارا کر دیتی ہے۔ جس سے ہر مسلمان کو پناہ مانگنی چاہئے۔

اپنے پیش رو مجددین کی طرح مولانا ندوی نے بھی ”اسلام کی روح“ کا بے معنی لفظ بار بار استعمال کیا ہے، اس سلسلہ میں بھی چند نکات

اجمالاً عرض کر دینا ضروری ہے :

اول :- اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی صرف روح ہی عطا نہیں کی بلکہ اس کے لئے اسلام کا ایک قالب، ایک ظاہری ڈھانچہ اور جسم بھی بخشا ہے، اسلام اس قلب و قالب کے مجموعے سے عبارت ہے، اور یہ روح اسی وقت تک اسلامی کہلائے گی جب تک کہ اسلامی قالب میں ہے، اس قالب سے نکل کر کسی اور قالب میں اس کا منتقل ہونا ممکن نہیں، جس دن آپ اس ”اسلامی روح“ کو اس کے ”اسلامی قالب“ سے نکال کر کسی دوسرے قالب میں منتقل کرنے کے لئے اسلام پر عمل جراحی کا آغاز کریں گے، وہ دن اسلام کی موت کا دن ہوگا اور آپ قاتل اسلام قرار پائیں گے۔ ولا فعل اللہ ذالک۔

دوم :- جس طرح اسلام کی روح ہر کہنگی سے پاک ہے اسی طرح اسلام کا جسم بھی گردش ایام سے کہنہ نہیں ہو پاتا، ہاں اس پر خواہشات و بدعات کا میل آتا رہتا ہے، اور گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجدید اسلام کا جو خود کار نظام تخلیق فرمایا ہے اس کا مفہوم یہی ہے کہ اسلام کو غسل دے کر اس کے جسم اطہر سے وہ تمام میل کچیل اتار دیا جائے جو اس عرصہ میں لوگوں کی اہوا و اغراض اور بدعات نے اس پر چڑھادیا تھا۔ الغرض تجدید کے معنی اسلام کے جسم کو بیرونی آلائشوں سے پاک صاف کر کے اس کے فطری گیسو و کاکل سنوارنے کے ہیں۔ اس کے جسم میں کانٹ چھانٹ کر کے تبدیلیاں لانے کے ہرگز نہیں۔ آفتاب و ماہتاب کے کروں کی طرح اسلام کا جسد منور ہر کہنگی سے پاک ہے اور

اس کی تابانی وضو پاشی ہر زمانہ میں تابندہ و پائندہ رہی ہے اور رہے گی۔

ہمارے متجددین کا یہ بنیادی مفروضہ قطعاً بے ہودہ ہے کہ چونکہ اسلام کا جسم کہنہ، دور از کار اور نکما ہو چکا ہے اس لئے اس کی روح نکال کر فوراً کسی دوسرے تروتازہ، چست اور جوان جسم میں منتقل کر دو، ورنہ وہ بیکار ہو جائے گی، آفتاب و ماہتاب کے نورانی پیکروں کے بارے میں اگر کوئی شخص کمال اخلاص سے یہ وعظ کرے کہ : ان کا جسم قبل از تاریخ کے وقت سے چلا آرہا ہے اور اب بالکل فرسودہ ہو چکا ہو گا اس لئے ان کی ”نورانی روح“ نکال کر کسی اور پیکر میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے، جو نئے زمانے کی ترقیات کا ساتھ دے سکے، تو ایسا شخص احمق کہا جائے گا۔ مگر افسوس ہے، کہ اسلام کے نورانی پیکر کے بارے میں اس نوعیت کے ہذیانات کو حماقت اور جنون کے بجائے دانش مندی، روشن خیالی اور ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے، یہ بھی دور حاضر کے ”حسن کرشمہ ساز“ کا کمال ہے کہ جہل کے معنی علم بتائے جاتے ہیں، جنون کا ترجمہ عقل سے کیا جاتا ہے، اور بد تہذیبی کو تہذیب و ثقافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سوم : ----- جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسلام کی روح کو اس کے جسم سے (جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عطا کیا) نکالنا ممکن ہی نہیں، نہ اسے کسی اور حسین قالب میں منتقل کیا جاسکتا ہے، تاہم فرض کیا کہ آپ نے اسلام کی روح نکال کر اسے بتمام و کمال کسی اور قالب میں منتقل ہی کر دیا، تب بھی معاف کیجئے وہ نیا جسم اسلام نہیں ہو گا، آپ کو اس کا نام کچھ اور ہی رکھنا پڑے گا۔ ہندوانی عقیدہ ”آواگون“ کے مطابق فرض کرو کہ زید کی روح عمرو میں منتقل ہو جاتی ہے، بتائیے اس دوسرے

جنم میں اسے زید کہا جائے گا؟ نہیں! بلکہ عمرو ہی کہلائے گا، کسی مجرم انسان کی روح اپنے پاپ کی سزا بھگتنے کے لئے کسی حیوان میں منتقل کر دی جاتی ہے تو کیا وہ اس جون میں انسان کہلائے گی؟ نہیں! بلکہ اسے کتا، بلی ہی کہیں گے۔ کتنی موٹی سی بات ہے کہ جو ہمارے باریک عقل فلسفیوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ”اسلام کی روح“ تو اسلامی قالب میں ہی باقی رہ سکتی ہے، اور جب تم نے اسلام کا وہ سانچہ ہی توڑ ڈالا، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا تھا، تو اسلام تو اسی دن ختم ہو گیا، اب نہ اس کی روح کسی کے قبضہ میں آئے، نہ اس کا قالب مہیا ہو سکے۔ اور جس نئے قالب پر اسلام کی تختی چسپاں کی جائے گی وہ اسلام نہیں ہوگا۔ ان معروضات سے معلوم ہوگا کہ ”اسلامی روح“ کا جو راگ ہمارے جدید مصلحین، بڑی سریلی لے میں الاپتے ہیں محض ایک فریب، ایک دھوکہ، ایک سازش ہے، حیف ہے کہ مولانا ندوی، جو ائمہ دین کی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے، وہ ان ملاحظہ کی تقلید میں ”اسلامی روح“ کا نعرہ بڑی بلند آہنگی سے لگاتے ہیں اور اسے اشتراکیت کے قالب میں منتقل کر دینے کے بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

عیش ہمہ بگفتی، ہنرش نیزگو

مولانا ندوی سے بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں کہ موصوف نے ”اساسیات اسلام“ میں وجود باری، توحید، نماز، حق تعالیٰ کی ربوبیت اور اسلامی اخلاق سے متعلق بعض جزوی امور سے قطع نظر، بڑی ایمان افروز بحثیں کی ہیں، جن میں ان کا قلم واقعۃً ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی بلند یوں کو چھوتا نظر آیا۔ تاہم کتاب کے تین ابواب نے، جو اصل

موضوع بحث سے تعرض کرتے ہیں، ان کی ساری قلمکاریوں پر پانی پھیر دیا ہے، یہ مواد اس قدر ”ایمان شکن“ ہے کہ اس کی توقع کسی ”مولانا ندوی“ سے کیا؟ کسی سلیم فکر عامی سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ اس سے قبل متعدد کتابیں شائع کر چکا ہے، جن میں اسلامی ثقافت کے نام اور ”اسلامی روح“ کے فلسفے سے دینی حقائق کے مسخ کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا گیا، اور جن کا اصل ہدف دین میں تشکیک کے راستے ہموار کرنے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، ہمیں امید ہے کہ ادارہ کے اس مقصد کے لئے اساسیات اسلام سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگی، کیونکہ اس میں محرمات کو حلال کرنے، احکام شرعیہ کو ساقط کرنے اور اسلام کو اشتراکیت کے قالب میں ڈھالنے کا فلسفہ بڑے سلیقے سے سائنسی زبان میں مرتب کیا گیا ہے، اور لطف یہ کہ یہ ”مقدس فریضہ“ ایک ایسے مصنف نے انجام دیا جو اپنے نام کے ساتھ ”مولانا“ کی شہرت رکھتے ہیں اور ندوۃ العلماء کے فاضل کی حیثیت سے ”ندوی“ کہلاتے ہیں۔

(رمضان المبارک، شوال المکرم ۱۳۹۳ھ)

اسلام اور علمائے اسلام کو بدنام

کرنے کا بھونڈا انداز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

نوائے وقت ۲۲ ستمبر ۱۹۷۷ء میں جناب وقار انبالوی صاحب کا ایک مضمون ’سوشلزم‘ کیونزم کا روپ“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ روسی انقلاب کے بعد ۲۳-۱۹۲۲ء میں روس کے دانشور کارپردازوں کا ایک وفد دہلی آیا اس نے جمیعت علماء دہلی سے رجوع کیا اور کہا، اگر برفانی علاقوں کے لوگوں کو وڈکا کے دو ایک گھونٹ پینے اور صبح کی نماز کے لئے تیمم کی رخصت دے دی جائے تو روس میں اسلامی ضابطہ حیات کے تجربے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ مگر جمیعت علماء اسلام نے اسے یہ جواب دیا کہ یا تو اسلام کو پورے کا پورا قبول کرو یا اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ اس واقعہ کو نقل کر کے وقار صاحب نے علامہ اقبالؒ کی زبانی یہ رونا رویا ہے کہ افسوس! ہمارے علماء کرام کی کم نگہی اور بے سوادگی نے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو اسلام کے دروازے سے دھکا دے دیا۔

جناب وقار انبالوی ایک کہنہ مشق صحافی ہیں، اسلام اور سوشلزم کی جنگ میں عموماً ان کو اسلام کا حامی سمجھا جاتا ہے، مگر جس موقع پر ان کا یہ مضمون چھپا ہے اس کی نزاکت کو یا تو انہوں نے محسوس نہیں کیا، یا انہوں نے جان بوجھ کر اس نازک

۱۔۔۔۔۔ موصوف اس واقعہ کو روسی انقلاب کے بعد کا واقعہ بتاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا روسی انقلاب ایک سنجیدہ انقلاب تھا اور اس نے روس کے ”دانشور کارپردازوں“ کو یہ سوچنے کی مہلت دی تھی کہ انہیں انقلاب کے بعد اب کون سا ضابطہ حیات اپنانا ہے؟ جن حضرات نے روسی انقلاب کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ روس کے کمیونسٹ انقلاب نے مذہب و اخلاق کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا تھا کہ تمام مذہبی و انسانی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں تھیں اور اجتماعی طور پر تو کجا انفرادی طور پر بھی اسلام کے اپنانے اور اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ روس کے دانشور کارپردازوں کے ذہن کے کسی گوشے میں اسلام کو اپنانے کا خیال پیدا ہو سکتا تھا۔ نہ نو تشکیل کمیونسٹ معاشرے میں اس کی گنجائش تھی۔ ان حالات میں وقار صاحب کا یہ انکشاف تاریخی انقلاب کے اور اس کے نفسیاتی و ذہنی نتائج سے بے خبری کی دلیل ہے۔

۲۔۔۔۔۔ وقار انبالوی صاحب موسیٰ جار اللہ صاحب کو ترکستان کا شیخ الاسلام بتاتے ہیں اور یہ کہ انہی کی ترغیب پر روسی دانشوروں کا وفد دہلی آیا تھا حالانکہ موسیٰ جار اللہ کو ترکستان کے شیخ الاسلام ہونے کا شرف صرف وقار صاحب نے عطا کیا ہے نہ وہ اس حیثیت کا آدمی تھا اور نہ اسے یہ منصب حاصل تھا، اس کے عقائد و نظریات اہل

علم سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔۔۔۔۔ اگر وقار صاحب کے بقول موسیٰ جار اللہ صاحب ترکستان کے شیخ الاسلام تھے تو سوال یہ ہے کہ انہوں نے اس فرضی وفد کو دہلی آنے کی زحمت کیوں دی؟ وہ اپنے ملک کے حالات و ضروریات سے جس قدر آگاہ تھے، دہلی کے علمائے کرام اس قدر باخبر نہیں ہو سکتے تھے، جس مشکل کا حل دہلی کے ایوان علم میں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ ترکستان کے شیخ الاسلام نے خود ہی کیوں نہ پیش کر دیا، انہوں نے اپنے اٹھارہ کروڑ اہل وطن کو اسلام کے دروازے سے دھکا کیوں دے دیا؟

۴۔۔۔۔۔ سب سے تعجب خیز اور حیرت افزا بات یہ ہے کہ وقار صاحب کے مطابق روسی دانشور کارپردازوں کا یہ وفد روس سے چلتا ہے اور سیدھا جمعیت علماء دہلی کے دفتر پہنچ کر وڈکا اور تیمم کی رخصت چاہتا ہے اور وہاں سے نفی میں جواب پا کر چپ چاپ روس لوٹ جاتا ہے اور وہاں جا کر سوشلسٹ ضابطہ حیات مرتب کر لیتا ہے۔ اسے نہ تو ہندوستان میں کسی اور عالم سے رجوع کرنے کی توفیق ہوتی ہے۔ نہ یہاں کے اخبارات ان کی آمد و رفت کا نوٹس لیتے ہیں نہ ہندوستان میں اس کی آمد اور ناکام واپسی کی کسی کو کانوں کان خبر ہوتی ہے اور نہ وقار صاحب ایسے دردمندان اسلام میں سے کوئی اس وفد کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ یہ سارے راز ۵۵ برس تک وقار صاحب کے سینہ میں دفن رہتے ہیں اور وہ اس کا انکشاف ٹھیک اس وقت کرتے ہیں جب کہ پاکستان میں اسلام اور سوشلزم کی جنگ آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے اور چند ہی روز بعد پاکستانی قوم کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یہاں اسلام کے نفاذ کو دیکھنا چاہتی ہے یا اسے دفن کر کے اس کی جگہ سوشلزم کا گرجا تعمیر کرتی ہے۔ اس نازک موقع پر وقار صاحب کا ۵۵ سال کے مخفی راز کو اگلنا، علما کرام پر کم نگہی

اور بے سوادى كافتوى صادر كرنا آخر كس چيز كى غمازى كرتا هے؟ اس سے نظام مصطفیٰ كى تحريك كى تائيد هوتى هے يا اس كے مقابلہ ميں لا دينى تحريك كى؟

۵۔۔۔۔۔ وقار صاحب نے وڈ كا كے دو ايك گھونٹ لے كر صبح كى نماز كے لئے تيمم كى رعايت كا جو افسانہ رقم كيا هے اب ذرا اس كى شرعى حيثيت بهى ملاحظہ فرمائيے :

دينيات كا ايك معمولى طالب علم بهى جانتا هے كه ايّے طوفانى علاقے ميں جهاں ٹھنڈے پانى سے وضو كرنے ميں واقعتاً بيمارى كا انديشہ هو، تيمم كرنے كى اجازت هے كيا اس معروف مسئلہ سے تركستان كے علما ناواقف تھے كه روس كے وفد كو هندوستان آنے كى زحمت اٹھانا پڑى؟ اور پھر كيا دہلى كے علما كرام اس سے ناواقف تھے كه انھوں نے اس شرعى رخصت پر عمل كافتوى دينے ميں تحمل سے كام ليا؟ ظاھر هے كه يہ ايك غلط تہمت هے جس كا تصور كسى عالم دين كے حق ميں قبول نهيں كيا جاسكتا۔ جهاں تك ”وڈ كا“ پينے كا تعلق هے اس كے لئے آنحضرت صلى الله عليه وسلم كا ارشاد سن لييجئے۔ حضرت ديلم حميرىؒ نے آنحضرت صلى الله عليه وسلم سے سوال كيا كه :

”ھمارا علاقہ بڑا سرد هے اور سردى كا مقابلہ كرنے كے لئے ھم

ايك مشروب تيار كيا كرتے ھيں، كيا اس كے پينے كى اجازت هے؟

فرمايا كيا وہ شراب نشہ آور هوتى هے؟ بولے جى ھاں! فرمايا تب تو اس

سے پرہيز لازم هے، عرض كيا لوگ اسے چھوڑنے پر آمادہ نهيں ھوں

گے فرمايا۔ لوگ اسے ترك نہ كريں تو ان سے قتال كرو۔“

(ابوداؤد شريف ص ۱۲۲ ج ۲)

كيا وقار صاحب آنحضرت صلى الله عليه وسلم پر بهى كم ننگھى اور بے سوادى

كافتوى صادر كريں گے؟ (نعوذ بالله)۔

۶۔ — جناب وقار صاحب نے سنی سنائی کو بے موقع نقل کر کے صحافت کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اپنی ثقاہت و اعتماد کو مجروح کیا ہے میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ وقار انبالوی صاحب بہائی مذہب کے پیرو ہیں میں اپنے دوست کی اس بات پر اعتماد نہیں کر سکا، اسی بنا پر مجھے احتجاج کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، ورنہ اگر میرے دوست کی بات صحیح ہے اور وقار انبالوی صاحب واقعی بہائی مذہب رکھتے ہیں تو میرے لئے شکایت کا کوئی موقع نہیں، کیونکہ اس صورت میں لوگوں کو اسلام سے بدظن کرنا اور علمائے اسلام کو بدنام کرنا ان کا مذہبی مشن ہے تاہم ان سے یہ توقع پھر بھی رکھوں گا کہ وہ اس مقصد کے لئے غلط افسانے تراشنے سے گریز کریں۔

(ہفت روزہ لولاک ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب
کے جدید انکشافات!

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب کے جدید انکشافات!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا اللہ یار خان چکڑالوی صاحب نے تصوف و صوفیا سے متعلق عوام و خواص اور علماء کے دلوں میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ کیلئے متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد نہایت عرق ریزی سے ”دلائل السلوک“ نامی ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے، موصوف نے اس کتاب میں اکابر علماء دیوبند، سلف صالحین اور ائمہ تصوف کے جادہ مستقیمہ کی کس قدر پاسداری کی ہے؟

ذیل میں ہم نے موصوف کی اس کتاب کے اقتباسات کی روشنی میں ان کے افکار و نظریات اور تفردات کا جائزہ لیا ہے، جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ چکڑالوی صاحب نے یہ کتاب تصنیف فرما کر تصوف و صوفیاء سے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیاں دور کی ہیں یا ان میں مزید اضافہ کیا ہے؟

مولانا المحترم ”مسکاد دیوبندی اور مشرباً نقشبندی، ایسی ہیں“-(ص ۱۵۱)

زندگی کا اکثر حصہ فرقہ باطلہ کی تردید میں گزرا، لیکن اب آخری عمر میں
 اشغال تصوف، اور بیعت و تلقین کا سلسلہ شروع فرمادیا ہے، زیر نظر کتاب انہوں
 نے تصوف اور صوفیا سے متعلق عوام اور علماء کے دلوں میں پیدا شدہ غلط فہمیوں
 کے ازالہ اور عوام و خواص کی علمی تشفی کیلئے لکھی ہے (ص ۱) کتاب بڑے بڑے
 بیس عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر عنوان کے تحت ذیلی عنوان آتے گئے ہیں،
 فاضل مؤلف کی محنت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس تالیف
 کے لئے پچاس سے زائد کتابوں کا تصفیہ کیا ہے، اور بڑی دیدہ ریزی سے حوالے
 تلاش کئے ہیں، بلاشبہ مؤلف کا مقصد نہایت مبارک اور محنت قابل ستائش ہے،
 مگر کتاب کی زبان صوفیانہ تو مطلق نہیں، بیشتر متکلمانہ ہے، جس میں کہیں
 کہیں مناظرانہ تلخی کی آمیزش نے اسے بے لطف کر دیا ہے، مثلاً کشف کی بحث
 میں یہ عبارت :

”یہ بحث قدرے طویل ہو گئی، دراصل بات یہ ہے کہ
 ہمارے بعض نئے رفقاء حلقہ سے ”کشف قبور“ کے
 متعلق اظہار ہوتا ہے تو بات ذرا آگے چلتی ہے، نور بصیرت
 سے محروم مولوی نما لوگ جب سنتے ہیں تو چیں بہ جیں
 ہو جاتے ہیں، اور جھوٹے.... مدعیان ولایت و خلافت
 و سجادگی جو اعلیٰ حضرت، خلیفہ مجاز، پیر طریقت، رازدان
 شریعت، قطب الاقطاب اور نہ جانے کیا کیا بنے بیٹھے ہیں،
 جب یہ باتیں سنتے ہیں تو دل ہی دل میں اپنی تہی دامن پر نادم
 ہوتے ہیں مگر اپنا جھوٹا و قار قائم رکھنے کے لئے بھانت

بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔“ الخ (ص ۱۲۳)

نفس مسئلہ (کشف قبور) سے قطع نظر نہ صرف یہ کہ یہ زبان تصوف جیسے پاکیزہ موضوع کے شایان شان نہیں، بلکہ یہ عبارت فاضل مؤلف کے بلند مقصد کو مشتبہ اور ان کی تمام محنت کو بے قیمت بھی کر دیتی ہے، ان کی ”در اصل بات یہ ہے“ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے ”نئے رفقائے حلقہ“ اور ”بعض علماء و مشائخ کے درمیان“ ”کشف قبور“ کے موضوع پر معرکہ کارزار گرم ہے، اور زیر نظر تالیف سے فاضل مؤلف کا اصل مقصد، اپنے ”بعض نئے رفقائے حلقہ“ کے لئے اظہار کشف قبور کی سند مہیا کرنا اور انہیں مخالفین کے مقابلہ میں مناظرہ کے لئے تیار کرنا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ واقعہ فاضل مصنف کا مقصد تالیف یہی ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ ان کی مذکورہ بالا عبارت قاری کو یہ غلط اور ناخوشگوار تاثر دیتی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ تاثر ان کے اہم اور وقیع مقصد کے لئے کوئی اچھی فضا پیدا نہیں کر سکتا۔

اس تالیف میں ”انکشافات“ بالکل نئے ہیں مثلاً :

”فائدہ : تصوف جزو دین ہے، اور انتقائے جزو مستلزم ہے

انتقائے کل کو، پس انکار تصوف مستلزم ہوگا انکار دین کو۔“

(ص ۱۳)

تصوف بمعنی ترمیم قلب، تعمیر باطن اور اصلاح اخلاق کوئی شک نہیں کہ دین کا اہم شعبہ ہے، اس لئے یہ کہنا تو صحیح ہے کہ اس کے بغیر دین ناقص رہتا ہے، لیکن اس کے انتقائے دین کا دعویٰ.... صرف ”نیا“ ہی نہیں بلکہ محل نظر بھی ہے، اور فاضل مؤلف کی تقریب بھی تام نہیں، اور اگر تصوف سے مراد ان کا

اصطلاحی تصوف لیا جائے جس کے لوازم میں ”کشف“ (قبور وغیرہ) کو بھی شمار کر لیا گیا ہے۔ (ص ۱۸۵) تو پھر ان کروڑوں صلحاء کے ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے، جو کشف قبور وغیرہ کی دولت سے محروم رہے ہیں۔

فاضل مؤلف ”لطائف اور شیخ کامل کے عنوان کے ذیل میں رقم طراز ہیں :

”صوفیا کرام میں فقہائے مجتہدین کے مقابلے میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب کشف والہام ہوتے ہیں، فقہاء محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں، اور یہ لوگ الہام و کشف کی روشنی میں، اور کشف والہام، اعلام و اطلاع من اللہ ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے۔“ (ص ۳۳)

تمام فقہائے مجتہدین کا استخراج محض ذاتی رائے اور وہ صفائے باطن سے محروم؟ اور ہر صوفی کا دعوائے کشف، اعلام و اطلاع من اللہ؟ انا اللہ وانا الیہ راجعون پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ”محض ذاتی“ رائے کو منصف امامت حاصل، اور ”اعلام و اطلاع من اللہ کو ربقہ تقلید نصیب، چنانچہ فاضل مؤلف لکھتے ہیں :

”میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں، اس کی دلیل صوفیاء کا تعامل ہے، تمام صوفیہ محققین، مجتہدین کے مقلد رہے ہیں، پس فقہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہو گیا۔“ (ص ۳۳)

کاش! فاضل مؤلف کو مقام اجتہاد اور مقام کشف والہام کا ”صحیح کشف“ ہو جاتا تو ان کی تحقیق شاید یہ نہ ہوتی جس سے ان کے بیان میں تضاد،

صوفیاء کے موقف تقلید میں پیچیدگی، ائمہ اجتہاد کے اعتماد میں اشتباہ اور ہماری حیرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

فاضل مؤلف ”شیخ کامل کی پہچان“ کے ذیل میں لکھتے ہیں :

”۸۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی تعلق قائم کر دے، جو بندے اور خدا کے درمیان واحد واسطہ ہیں۔

اس ناچیز کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے ہاتھ پر بیعت کبھی نہیں لی، صرف تعلیم دیتا ہوں، اور ابتدائی منازل طے کر کے دربار نبویؐ میں پیش کر دیتا ہوں، جو تمام جہاں کے پیر ہیں، صرف زبانی جمع خرچ کافی نہیں کہ پیر صاحب فرمادیں کہ لو تمہیں دربار نبویؐ میں پہنچادیا، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سالک خود مشاہدہ کرے کہ سلوک طے کر رہا ہے اور دربار نبویؐ میں پہنچ کر حضور اکرم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کر رہا ہے، اگر کوئی مدعی دربار نبویؐ تک رسائی نہیں رکھتا، پھر بیعت لیتا ہے، تو وہ دھوکا باز ہے، ماخوذ ہوگا، پس کامل و ناقص کی یہی پہچان ہے، خوب سمجھ لو۔“ (ص ۳۸)

فاضل مؤلف کو اگر یہ مقام رفیع حاصل ہے کہ صرف ”ابتدائی منازل“ طے کرانے کے بعد براہ راست سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر وہ اپنے حلقہ ارادت کے راہ نوردان طریقت کی بیعت کر دیتے ہیں، تو یہ ان کے مریدین کی بڑی سعادت مندی ہے، ہم نے جن اکابر اولیاء کو دیکھا سنا ہے وہ تو اپنے کو اس کا اہل بھی نہیں سمجھتے کہ بیداری میں نہ سہی خواب ہی میں اور بلا واسطہ

نہ سہی بالواسطہ ہی سلام نبویؐ سے مشرف ہو جائیں، بہر حال یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے، لیکن کوئی مدعی جب تک مؤلف محترم کی تشریح کے مطابق دربار نبویؐ تک رسائی نہ رکھے، اسے بیعت کے لئے نااہل، دھوکا باز، اور ماخوذ قرار دینا بالکل جدید انکشاف اور کامل و ناقص کی پہچان کے لئے نئی کسوٹی ہے، ہر صدی میں مشکل ہی کوئی بزرگ اس معیار پر پورا اترتا ہوگا۔

”پہلے بیان کر چکا ہوں کہ آدمی رضائے الہی کو مقصد بنا کر اور طلب صادق لے کر ہمارے سلسلہ میں آجائے تو انشاء اللہ تعالیٰ چھ ماہ کے عرصہ میں روح سے کلام بھی کرے گا، روح کو دیکھ بھی لے گا۔“ (ص ۱۷۶)

اس سے پہلے فاضل مؤلف ہمیں بتلا چکے ہیں کہ ”روح عالم امر سے ہے“ اور عالم امر کی تشریح امام غزالیؒ کے حوالے سے اس طرح بیان کر چکے ہیں کہ ”عالم امر عبارت ہے موجودات سے جو حس، خیال، جہت، مکان اور حیز سے خارج ہے، عالم امر انتفائے کمیت کی وجہ سے مساحت و تقدیر کے تحت نہیں آسکتا۔“ (ص ۲۷) اور یہ کہ ”پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ یہاں روح کی تعریف بالوجہ ہوگی نہ کہ بالکنہ، کیونکہ روح کی حقیقت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”وما اوتیتم من العلم الا قليلا“ (ص ۲۳) اب ایسی چیز جس کی نہ تو حقیقت اور کنہ معلوم ہو، نہ وہ مساحت و تقدیر کے تحت آسکتی ہو، نہ حس اور خیال کا وہاں دخل ہو، نہ جہت، مکان اور حیز کے دائرے میں اسے لایا جاسکے، صرف چھ ماہ کے عرصہ میں اسے آنکھوں سے دکھادینے کا انکشاف بالکل نئی چیز ہے، ورنہ ہماری طرح عام اوک بھی روح کو غیر محسوس اور غیر مرئی چیز ہی سمجھتے رہے،

جیسا کہ امام غزالی کی تصریح فاضل مؤلف نے نقل کی ہے۔

”قصد رسول اور کشف قبور“ کے تحت فاضل مؤلف فرماتے ہیں :

”چوتھی اصولی بات یہ ہے کہ تصوف واحسان دین کا اہم شعبہ

ہے اور یہ قاعدہ ہے اذا ثبت الشی ثبت بلوازمہ اور

الہام اور کشف کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے، اس لئے

دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ دین کے اہم جز تصوف

واحسان کو تسلیم کرنا پڑے گا، اسے تسلیم کیا تو کشف والہام کو

ماننا پڑے گا، کیونکہ لازم و ملزوم ہیں۔“ (ص ۱۸۵)

بلاشبہ بعض اوقات اللہ کے مقبول بندوں کو کشف والہام بھی ہوتا ہے

(جو نہ تصوف اور خدا رسیدگی کے شرائط میں ہے، نہ لوازم میں سے، نہ اس میں

دوام ہے نہ اختیار، پھر نہ ان چیزوں کو ذرہ برابر قرب خداوندی میں دخل ہے، نہ

ان کے نہ ہونے سے قرب و رضا میں ادنیٰ خلل واقع ہوتا ہے، لیکن ”کشف

قبور“ تک کو لوازم اور ضروریات دین میں داخل کرنا اور اسکے اثبات و نفی کو دین

کے اثبات و نفی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دینا پہلی دفعہ مؤلف کے یہاں

دیکھا، جب کہ مؤلف محترم ”تصوف کیا نہیں“ کے عنوان سے خود ہمیں بتلاتے

ہیں ”تصوف کے لئے نہ کشف و کرامت شرط ہے، نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی

دلانے کا نام تصوف ہے.... نہ اس میں کشف والہام کا صحیح اثرنا لازمی ہے اور نہ

وجد و تواجد اور رقص و سرور کا نام تصوف ہے، یہ سب چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ

عین تصوف سمجھی جاتی ہیں، حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر تصوف اسلامی کا

اطلاق نہیں ہوتا، بلکہ یہ ساری خرافات اسلامی تصوف کی ضد ہیں۔“

(ص ۸، ۹) ان تمام چیزوں کو ”خرافات“ اور ”اسلامی تصوف کی ضد“ قرار دینے کے بعد دین اور کشف قبور کے درمیان ملازمہ کے دعویٰ کو ”اصولی بات“ بتلانا اور بھی انوکھا سا تجربہ ہے۔

ایک جگہ عنوان ہے ”سماع موتی پر اجماع امت ہے“ (ص ۱۶۱) راقم خود بھی ”فی الجملہ سماع موتی“ کے ثبوت کا منکر نہیں، مجھے بڑی خوشی ہوتی، اگر مؤلف محترم اس اجماع پر کوئی نقل پیش کرتے، لیکن افسوس کہ اس ”اجماع“ پر کوئی تصریح پیش نہیں کی، اس صورت میں خواہ ہم کتنا ہی چاہیں، مگر اس نزاعی مسئلہ پر ”اجماع امت“ کا دعویٰ نہ صرف غیر واقعی بات ہے بلکہ اس سے ”اجماع امت“ کا تقدس بھی مجروح ہوتا ہے، یعنی ہماری اس انتہا پسندی سے سماع موتی تو اجماعی نہیں بنے گا، ہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ خدا نخواستہ اجماع امت کا مسئلہ بھی، سماع موتی بن کر نہ رہ جائے، فالی اللہ المشتکی۔

ایک جگہ فاضل مؤلف نے امام غزالی کے ذکر کردہ اس نکتہ سے کہ ”آسمان دعا کا قبلہ ہے“ یہ انتہا پسند نتیجہ نکالا ہے :

”فائدہ : معلوم ہوا کہ جس طرح کعبہ کی طرف رخ کئے بغیر نماز ادا کی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی اور نہ ہی قبول ہوتی ہے، اسی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کی جائے تو وہ دعا قبول نہیں ہوتی۔“

۲۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ اگر قبر کے پاس ہاتھ اٹھا کر دعائے کی جائے تو مقبول نہیں، اگر دعا مقبول نہیں تو میت کو ثواب کس چیز کا پہنچے گا، گویا قبر کے پاس جا کر بغیر ہاتھ اٹھائے دعا

کرنا ایک ہیکار فعل ہوا، پس ثابت ہوا کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا مسنون ہے، اس میں قبر اور غیر قبر کی قید نہیں۔
(ص ۲۰۱)

بعض جگہ بلاشبہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا مسنون ہے، اور اگر کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو قبرستان میں دعا کرتے وقت بھی رفع یدین کی اجازت میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن امام غزالی کے نکتہ سے یہ کلیہ اخذ کر لینا کہ ”ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کرنا ایک بے کار فعل ہے“ یقیناً کوئی علمی انداز نہیں، کیا ہر دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا عادتاً ممکن ہے؟ بعض جگہ فاضل مؤلف کے استدلال میں توازن نہ ہونے کی وجہ سے جدل کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، مثلاً:

”کوئی حسد کی آگ ذرا علمی رنگ میں اگلتا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ کشف ظنی چیز ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، بجا، مگر یہ بھی تو فرمائیے کہ کتب فقہ میں مذکور.... تمام مسائل قطعاً ہی ہیں، کیا ذخیرہ احادیث کی تمام حدیثیں متواتر اور قطعی ہیں، کیا وتر، سنت، نفل کی تعیین نصوص قطعاً سے ثابت ہے؟ اگر محض ظنی ہونے کے احتمال پر کشف کی کوئی اہمیت نہیں تو فقہ اسلامی سے کیا سلوک کریں گے۔“ (ص ۱۲۳)

(ہمیں مؤلف محترم سے آج تک نہ تو تعارف کا شرف حاصل ہے، نہ اس کتاب کی وصولی سے قبل ان کے اسم گرامی ہی سے واقفیت تھی، اس لئے ”ذرا علمی رنگ میں حسد کی آگ اگلنے“ کا فقرہ امید ہے کہ ہم پر بھی چست نہ کیا جائے گا) ظنیت کے خاص اصطلاحی لفظ کے سہارے ایک طرف کشف کو، اور

دوسری طرف فقہ و حدیث، واجبات دین اور سنن ہدیٰ کو رکھ کر ایک ہی میزان سے تولنا، اور اصرار یہ کرنا کہ یا تو دونوں پر ایمان لاؤ، یا دونوں سے دست بردار ہو جاؤ، اسے خالص جدل تو کہا جاسکتا ہے مگر اسے کشفی تحقیق یا علمی کشفی کا نام دینا بے انصافی ہے۔

بعض جگہ ان کی جدلی ٹکمر سے پورے دین کے لئے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ :

”کوئی کہتا ہے کہ اس (کشف) میں غلطی کا احتمال ہے، اس کا جواب دیا جا چکا ہے کہ دین نقل ہے، اور نقل خبر ہے اور خبر میں احتمال صدق و کذب دونوں کا ہے، تو پھر اس احتمال پر پورے دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔“ (س ۱۲۳، ۱۲۴)

اف! توبہ!! علمائے ظاہر کی سطحیات اور صوفیاء کی شطیحات سنی تھیں، لیکن علمائے جدل کی سطحیات کا یہ انوکھا تجربہ ہوا، کشف میں غلطی اور پورے دین میں غلطی، دونوں کا ایک حکم؟ ”فرق مراتب نہ کنی زندیق“ کیا کسی نے غلط کہا تھا۔؟ کیا پورے دین میں ”احتمال کذب“ کا شعلہ ”خر من ایمان کو خاکستر نہیں کر دے گا۔ استغفر اللہ۔“

بعض جگہ مؤلف محترم کی دعویٰ ودلیل میں قاری کو ”محض سخن سازی“ کا احساس ہوتا ہے، مثلاً ص ۱۳۳ میں مؤلف نے عنوان قائم کیا ہے ”عدم کشف بڑا حجاب ہے“ اور دلیل میں قرآنی آیت ”کلا انهم عن ربهم یومئذ لمحجوبون“ پیش فرمائی گئی ہے، اور مزید تشریح کے لئے امام رازیؒ کی عبارت مع ترجمہ دی گئی ہے، مگر بڑی کاوش کے بعد بھی مؤلف کے دعویٰ ودلیل کے

درمیان کوئی ادنیٰ ربط نہیں ملتا، اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ”کفار کے دنیا میں کفر اور لذات فانیہ میں منہمک رہنے کی وجہ سے قیامت کے دن انہیں دیدار خداوندی نصیب نہ ہوگا۔“ اب اس سے یہ استدلال کرنا کہ جن اہل ایمان و اخلاص کو دنیا میں کشف نہیں ہوتا وہ اس آیت کا مصداق ہیں، محض بناوٹ ہی کہلائے گی، کتاب میں جگہ جگہ اسی قسم کے غیر متوازن اور انتہا پسندانہ نوادر کی بھرمار ہے۔

مؤلف محترم ماشاء اللہ سنی العقیدہ نقشبندی اور دیوبندی ہیں مگر ان کی یہ تالیف نہ اصول اہل سنت کی ترجمانی کر سکی ہے، نہ تصوف کے حقائق کا صحیح انکشاف اس سے ہو سکا ہے، نہ دیوبندی مسلک اور نقشبندی مشرب ہی کو نبھاسکی ہے، نیک نیت مؤلف اس کتاب کے ذریعہ تصوف سے متعلقہ غلط فہمیوں کے ازالہ اور عوام و خواص کی علمی تشفی کا قصد رکھے ہیں، مگر ہمارا خیال ہے کہ اگر کتاب کو پڑھ کر عوام اور بالخصوص جدید طبقہ کے ذہن میں دین اور تصوف کے بارے میں مزید غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں تو یہ مؤلف کی بڑی کامیابی اور ان کے قارئین کی بڑی سعادت ہوگی۔